کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

کچھ عشق کیا کچھ کام کیا



جاوید عارف

جاوید عارف

عبدالمتین

انتساب

اپنے پہلے برطانوی سفر کے محرک

چھوٹے بھائی

انعام الرؤف خان ایڈووکیٹ

اور

محبتوں کے مثالی پیکر

چھوٹے بھائی

اعجاز رؤف خان (مرحوم)

(جس کی یادیں آج بھی آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہیں)

کے نام

دریچے

سفر میں دھوپ تو ہوگی!!!

سفر کٹھنائیوں سے ہی عبارت رہا ہے۔ایک مزدور اور متوسط طبقے کے فرد کے سفر پر تو تعیش کا گمان بھی نہیں ہوسکتا۔اُسے تو سفر کے مقاصد اور مسائل کے سلگتے الاؤ گھیرے رکھتے ہیں۔ جاوید عارف نے ایسے ہی نامساعد ماحول میں کئی بار انگلینڈ کے سفر کئے ہیں۔ دیس میں گھر شاد آباد رکھنے کے لئے پردیس کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔سفر کر کے اجنبیت کے دھکے کھائے ہیں۔مگر حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ اس نے اس کارِ مشکل کو نہ صرف آسان کیا بلکہ سفر نامہ بھی لکھ دیا ہے جو شاید سفر اور پردیس کاٹنے سے بھی مشکل تجربہ ہوا کرتا ہے۔دکھ اٹھانا حالات کا جبر ہوتا ہے۔دکھ بیان کرنا دوسری بات ہے۔پھر ان دکھوں اور نا آسودہ لمحوں کو لفظوں کا روپ دینا اور وہ بھی اس طرح کہ قاری پر کوئی بوجھ آنے کی بجائے اس کی تفریح کا باعث بنے، دل چسپ معلومات کا خزانہ بخشے،اہم ترین کام ہے جو ہر مسافر کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔

سفرنامہ دنیا بارے جاننے اور تہذیبوں کا مزاج سمجھنے کا شوق رکھنے والوں کی مقبول ترین صنف ہے۔ صنف کیا، بہت سی اصناف کا مجموعہ ہے، رپوتاژ، تاریخ، کہانی، عمرانیات، تہذیب و ثقافت کے مطالعہ و مشاہدہ کا، دیس پردیس کے درمیان تہذیبی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی و سیاسی فرق کے احساس کا۔ یہ سارے عوامل اکٹھے ہو کر سفرنامہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ یوں سفرنامہ لکھنا مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں ہے کہ اس کے لوازمات اور تقاضے سفر کے ساتھ اور بہت کچھ کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔

جاوید عارف کا سفرنامہ ''کچھ عشق کیا کچھ کام کیا'' ان تمام حوالوں سے اہم ہے کہ اس میں فنی اعتبار سے بھی تمام تکنیکی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور فکری رویے بھی قابلِ ستائش ہیں۔ تحریر کی سادگی، سچائی، سلاست و روانی اس کے فنی فکری حُسن کو اور زیادہ خوبصورت بنا دیتی ہے۔ اس کو پڑھنے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ ''میں ہی ہوں جو لفظ لفظ سیاحت کر رہا ہوں''۔ دل چسپی کا یہ عالم ہے کہ پورا سفرنامہ پڑھ لینے کے بعد بھی شوق کی پیاس نہیں بجھتی اور پھر سے پڑھنے کی خواہش طبیعت کو آمادہ کر لیتی ہے۔ کچھ باتیں ہمارے ماحول میں ناپسندیدہ، غیر مانوس اور اچنبا ہیں۔ مگر اُدھر انگلینڈ میں زندگی کے معمول کا حصہ ہیں جو ہماری مشرقیت کو کبھی عجیب اور کبھی ناگوار محسوس ہوتی ہیں۔ لکھنے والا اگر ان سے پہلوتہی کرے تو نہ صرف سچائی کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہے بلکہ ایک طرح سے قاری کا تجسس معلومات سے محروم رہ جاتا ہے۔ مگر ہاں اگر صرف ان ہی دلفریبیوں میں گم ہو جائے تو سفرنامہ کی باقی فنی و فکری ضروریات کنارہ کر جاتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ جاوید عارف نے ایسے واقعات کو بیان کرتے ہوئے افراط و تفریط سے کام نہیں لیا، بات کو بات کی جگہ ہی رہنے دیا ہے۔ اس توازن نے سفرنامہ کو خوبی بخشی ہے۔

جاوید عارف بنیادی طور پر اردو اور پنجابی کا شاعر ہے اور اسی حوالہ سے خود کو متعارف کروا چکا ہے اور اپنے مجموعہ ہائے کلام کے ذریعے منوا چکا ہے۔ سفر نامہ لکھ کر اس نے ادبی دنیا میں اپنے حصے کا ایک اور جہان آباد کیا ہے جو اس کی شاعری ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ پُرکشش ہے۔ فضل احمد خسرو کی قربتوں میں میں نے غیر شاعروں کو شاعر اور ادب سے فاصلہ رکھنے والوں کو ادیب بنتے دیکھا ہے۔ وہ اپنے ملنے والوں کو ماحول ہی ایسا دیتا ہے کہ جذبے بولنے لگتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ جاوید عارف نے فضل احمد خسرو کی قربتوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ جاوید عارف نے جس برق رفتاری سے ادبی سفر طے کیا ہے وہ خود اپنی جگہ ایک سفر نامہ کا متقاضی ہے۔ اقبال صلاح الدین کے اس شعر پر بات مکمل کرتا ہوں کہ:

تلخ تھا بے شک وفا کے راستے کا ہر سفر
پر سفر کی داستاں کا لُطف دُہرانے میں ہے

ڈاکٹر نثار احمد

۲۲/اکتوبر ۲۰۱۰ء

انگلینڈ گائیڈ

ابنِ بطوطہ سے لے کر ابنِ انشاء اور پھر ابنِ انشاء سے آج تک کئی سفرنامے لکھے گئے اور سفرنامے لکھنے والوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اب سفر کرنے میں بہت آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ سفر کرنا ابنِ بطوطہ اور ان کے بعد میں آنے والوں کے سفروں کی طرح اب جان جوکھوں کا کام نہیں رہا۔ اُس زمانے میں تو سفر کرنے والا گھر سے جوانی کے عالم میں نکلتا اور بڑھاپے کی حالت میں واپس آتا تھا۔ اِس دوران دنیا ہی بدل چکی ہوتی تھی۔ وہ اپنے شہر واپس آکے ''اصحابِ کہف'' کی طرح کسی کو نہیں پہچان سکتا تھا اور نہ اُس کے شہر والے اُسے واپسی پر خوش آمدید کہنے کے لئے موجود ہوتے تھے۔ پرانے سفر کرنے والوں کے لئے تو اُن کے سفر ایک مہم کی طرح ہوتے تھے جن میں بہت دلچسپ اور محیر العقول واقعات رونما ہوتے رہتے تھے۔ جن کی وجہ سے اُن کے سفرنامے خود بخود بہت دلچسپ اور سنسنی خیز ہو جاتے تھے۔ لیکن آج سفر کی آسانیوں کی وجہ سے سفرناموں کو خود دلچسپ بنانا پڑتا ہے۔ جن کے لئے فرضی واقعات اور

مصنوعی عشق ''ایجاد'' کرنے پڑتے ہیں۔ کسی راہ چلتی یا ہوائی جہاز کی ''محدود دنیا'' میں بھی کسی حسینۂ جانسوز کا سفر نامہ نگار پر فریفتہ ہو جانا اک روایت بن گیا تھا۔ یہ روایت ہمارے '' کچھ عشق کیا کچھ کام کیا'' کے سفر نامہ نگار جاوید عارف کے ہاں بھی نظر آتی ہے لیکن ان کی محترمہ ''لو جی'' سے بات چیت فرضی نہیں بلکہ حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ اگر فرضی ہوتی تو معاملہ بہت دُور تک جاتا۔

سفر نامے بہت سے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔ جو بھی ادیب یا شاعر کسی غیر ملک کا سفر کرتا ہے اس پر سفر نامہ لکھنا ''واجب'' ہو جاتا ہے بلکہ بعض ادیب تو سفر ہی سفر نامہ لکھنے کے لئے کرتے ہیں تا کہ ''ہم خُرما و ہم ثواب'' والی ضرب المثل صحیح ثابت ہو جائے۔ سفر نامہ اب ادب کی ایک اہم صنف بن چکا ہے۔ ہمارے نقادوں اور تجزیہ نگاروں نے اِسے ادب کی ایک صنف کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور جاوید عارف اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔

جاوید عارف نے بڑی خود اعتمادی سے اپنے پہلے سفر کا آغاز کیا اور بڑے شوخ انداز میں اپنے سفر نامے کی بنیاد رکھ دی اور ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ سفر نامہ سفر کی روداد ہی تو ہوتا ہے جس میں ہر ضروری اور کبھی کبھی کچھ غیر ضروری پوائنٹ بھی آ جاتے ہیں۔ جاوید عارف نے سینئر سفر نامہ نگاروں کی روایت پر عمل کرتے ہوئے اسے ہلکے پھلکے رومانس کا تڑکا بھی لگا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ سفر نامے پڑھنے والوں کی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لئے کمرِ ہمت باندھ لی ہے۔ مجھے خود بھی تجربہ ہے کہ قاری اُس سفر نامے کو سفر نامہ ہی نہیں سمجھتے جن میں عشقیہ قصے نہ دیئے ہوئے ہوں۔

'' کچھ عشق کیا کچھ کام کیا'' میں جاوید عارف نے کام ہی کام کیا، عشق کیا بھی تو صرف کام کی خاطر۔ یہ ایک سفر کا ذکر نہیں ہے بلکہ کئی سفروں کا مجموعہ ہے یا اسے کئی سفروں کا نچوڑ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ ان کے انگلینڈ آنے جانے سے اور وہاں ان کے رشتہ داروں کے رہنے سہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلینڈ ان کا دوسرا ملک ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''انگلینڈ کے کئی

پھیروں سے میری سب جھجک دور ہو چکی تھی اور اپنی محدود انگریزی کو صحیح معنوں میں استعمال کرنے لگا تھا''۔ حالانکہ ان کی خوداعتمادی اور خداداد ذہانت کی وجہ سے مجھے تو ان کا پہلا دورہ بھی پہلا نہیں لگا اور وہ ایک ''منجھے'' ہوئے مسافر کی طرح سفر کرتے رہے۔ وہ تو انگریزوں کے اپنے ملک میں بھی اُن سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے میل جول میں اور روز کے کاروبار میں انہیں مرعوب کرتے رہے۔ ایئرپورٹس پر امیگریشن کے افسروں کے اوسان خطا کر دینے والے لمحات میں بھی وہاں کے افسروں سے باہوش وحواس نپٹتے رہے اور ان کو ''سوری'' کہنے پر مجبور کرتے رہے۔

تاریخی اور دوسرے قابل دید مقامات کا بیان، وہاں کے رسم ورواج، لوگوں کا رہن سہن اور اُن کا باہر سے آنے والوں کے ساتھ سلوک، ان سب کے بارے میں سفرنامہ نگار کے اپنے تاثرات۔ اس طرح سفرنامہ معلومات اور تفریح کا ایک بہت عمدہ ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ جاوید عارف نے بھی اپنے سفرنامے کو معلومات کا خزانہ بنا دیا ہے۔ انہوں نے انگلینڈ کے متعلق اتنی معلومات مہیا کی ہیں کہ ان کے سفرنامے کو ''انگلینڈ گائیڈ'' کہا جائے تو بہتر ہے۔ انگلینڈ جانے سے پہلے انہوں نے اُس کے متعلق کچھ کتابیں بھی پڑھ لیں تھیں۔ دوسرے وہ وہاں اتنی دفعہ گئے، اتنی دیر تک رہے کہ وہاں کی تاریخ، جغرافیئے اور وہاں کے سوشل سیٹ اپ، لوگوں کے ڈسپلن، رواداری، زرعی زمین، وہاں کی پیداوار، پھولوں اور پرندوں کی قسمیں، کالوں اور گوروں کے سلوک اوران کے رہن سہن میں فرق، ان کی عادات اور معاشرت کا فرق، اتنی وضاحت اور فصاحت سے بیان کیا ہے کہ قاری کو تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ مانچسٹر شہر کی تاریخ، اس کے نام کی وجہ، اس میں رہنے والی مشہور شخصیتوں اوران کے کارناموں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے جو مانچسٹر جانے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

جاوید عارف نے اپنے اِس سفرنامے میں ہر جگہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اس ملک کی معلومات پیش کرنے میں شاعرانہ مبالغے سے کام نہیں لیا بلکہ اپنے مشاہدے کی

آنکھ کو کھلا رکھ کر ہر شعبے کا جائزہ پیش کیا ہے۔انہوں نے جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا وہی بیان کر دیا ہے۔حقیقت پسندی بہت اچھی ہوتی ہے لیکن بعض مقامات پر وہ زیادہ ہی حقیقت پسند ہو گئے ہیں اور ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جو صرف بے تکلف دوستوں میں ہی کی جاتی ہیں۔اگر انہوں نے کرنی ہی تھیں تو تشبیہہ واستعارے کے شاعرانہ پردے میں لپیٹ کر کر دیتے۔

عارف صاحب کی تحریر میں برجستگی، شگفتگی، شوخی اور ہلکے پھلکے مزاح کی چاشنی ملتی ہے جو پڑھنے والے کی دلچسپی کا باعث بن کے اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالیتی ہے۔اُن کو مکالمہ نویسی میں بھی ایک انفرادیت حاصل ہے۔اُن کی انگریزوں سے بات چیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں رہتے ہوئے اُنہیں بامحاورہ انگلش پر عبور حاصل ہو گیا تھا اور وہ اُن کو ترکی بہ ترکی جواب دے کر لا جواب کر دیتے تھے۔حالانکہ وہاں عمریں گزار دینے والے جٹکی انگریزی سے ہی گزارہ کرتے رہتے ہیں۔ان کی تحریر کا اپنا ہی ایک مزے دار رنگ ہے جو اُن کا اسلوب بن کر اُن کی پہچان ثابت ہوگا۔وہ اردو لکھتے لکھتے اپنی بات کی مزید وضاحت کرنے کے لئے پنجابی زبان کا ایسا ''ڈھکواں'' لفظ استعمال کر جاتے ہیں جو سونے پر سہاگہ معلوم ہوتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ وہ کسی ماہر سنار کی طرح انگوٹھی میں خوبصورت نگینہ جڑ دیتے ہیں۔اِس سفرنامے کی اضافی خوبی یا خصوصیت یہ کہی جاسکتی ہے کہ اِسے پڑھتے ہوئے ناول پڑھنے کا سا احساس ہوتا ہے یا یہ آپ بیتی لگتی ہے جیسا کہ کتاب کے آخر میں جاوید عارف صاحب نے خود اپنے اس سفرنامے کو آپ بیتی بھی کہا ہے۔ویسے دیکھا جائے تو ہر سفرنامہ آپ بیتی ہی تو ہوتا ہے۔جاوید عارف صاحب کا یہ نقشِ اول ان کے شاندار مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔

پروفیسر عاشق رحیل

لاہور

آپ بیتی کے زیرِ سایہ

سفرنامہ عہدِ حاضر کی مقبول ترین صنف ہے اور دنیا کی تمام زبانوں میں اِس کے شہکار دکھائی دیتے ہیں۔ کسی ملک کی سیر کے دوران حاصل ہونے والے تجربات و احساسات کو قاری کے ساتھ Share کرنے کا نام سفرنامہ ہے۔

ہر شخص کے رجحانات' احساسات' دلچسپیاں اور مزاج دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی منظر کو دیکھ کر اُس کا تاثر بھی ہر شخص الگ الگ لیتا ہے۔ مختلف سفرنامہ نگار ایک ہی شہر کی سیر کرتے ہیں مگر مقامات پر جانے کا انتخاب وہ اپنے مزاج اور اپنی دلچسپی کے مطابق کرتے ہیں۔ یوں رجحان، مزاج اور خیالات کی رنگا رنگی اس صنف کو خوبصورتی سے نوازتی ہے اور قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہے۔

جاوید عارف اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ دونوں زبانوں میں اُن کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دنیا بھر کی سیر کر چکے ہیں۔ ''کچھ عشق کیا' کچھ کام کیا'' اُن

کے انگلینڈ کے مختلف اسفار کے ذکر پر مشتمل سفرنامہ ہے۔ مختلف اسفار کے دوران حاصل ہونے والے تجربات اور ایک مدت تک انگلینڈ میں رہنے کے باعث یہ سفرنامہ سطحی نہیں بلکہ عمیق مطالعے اور مشاہدے کا ثمر ہے۔ مصنف نے انگلینڈ کے دو درجن کے قریب وزٹ کیے اور وہاں کئی کام بھی کیے۔ جس کے باعث اُسے انگریزوں اور انگلینڈ میں بسنے والے پاکستانیوں کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ لہٰذا اُس کی معلومات سطحی نہیں ہیں وہ کسی ایک شخص کے رویئے کو پوری قوم کا نمائندہ رویہ نہیں سمجھتا بلکہ اُس کے انفرادی پس منظر میں بات کرتا ہے۔

جاوید عارف کے اِس سفرنامے میں انگلینڈ کے باشندوں کی نسبت انگلینڈ میں رہنے والے پاکستانیوں کی نفسیات' خیالات' احساسات اور مشکلات کا ذکر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ انگلینڈ میں رہنے والے کالے چوروں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ سڑکوں پہ ہونے والی چوما چاٹی بھی سفرنامے میں در آئی ہے۔ انگریزوں کے اپنے ماں باپ کو اولڈ ہوم میں چھوڑنے کی باتیں اور اولڈ ہوم میں بسنے والوں کی بے بسی اور تنہائی کے مناظر بھی اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ انگریز جہاں اپنے بوڑھے ماں باپ کو اولڈ ہوم چھوڑ کر بھول جاتے ہیں اور پھر کبھی فادرڈے یا مدرڈے پر کارڈ بھیج کر، فرض ادا ہو گیا' سمجھتے ہیں۔ وہاں والدین بھی اپنے بچوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ سکول ایجوکیشن وہاں فری ہے۔ ادھر سکول ایجوکیشن مکمل ہوتی ہے، اُدھر بچہ بالغ ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے بچے کے والدین کچھ نہیں کرتے۔ لڑکے لڑکیاں یونیورسٹی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے خود محنت کرتے ہیں۔ کہیں لڑکے ہوٹلوں اور دوسری جگہوں پر گھٹیا سے گھٹیا کام کرتے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں لڑکیاں یونیورسٹی اخراجات کے لیے بزنس (جسم فروشی) تک کرتی ہیں۔

بعض مقامات کی تاریخ بھی سفرنامے کا حصہ بنتی ہے مگر سفرنامے میں تفصیلی ذکر پاکستانیوں کا ہے۔ انگلینڈ میں بستے پاکستانیوں کے مسائل، اُن کے کاروبار، ان کی اولاد کا اُن

کے ساتھ سلوک، وہاں پیدا ہونے والے بچے اسی سماج میں رچ بس جاتے ہیں اور پاکستانی والدین اُن سے پاکستان جیسے سلوک کی توقع رکھتے ہیں۔

جاوید عارف نے انگلینڈ کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ قاری کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ جاوید عارف نے یہ سفر' سفرنامہ لکھنے کی نیت سے نہیں کیے۔ اسی لئے اُس نے کسی بھی سفر کے دوران نوٹس نہیں لیے، یوں سفرنامہ یادوں کے سہارے لکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامے میں انگلینڈ کی زندگی کا گہرا مطالعہ دکھائی دیتا ہے۔ پاکستانی دوستوں (جن کے ساتھ اُن کا زیادہ وقت گزرا) کی کردار نگاری موجود ہے۔ اپنوں کی محبت، نفرت، ایثار و قربانی، خودغرضی و مطلب پرستی کی کئی تصویریں نظر آتی ہیں مگر وہ حیرت کہیں دکھائی نہیں دیتی جو کسی منظر کو پہلی بار دیکھ کر مصنف کے تجربے کا حصہ بنتی ہے اور سفرنامے کا قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔

آپ بیتی کے عناصر بھی سفرنامے میں در آتے ہیں۔ مصنف اپنی ذات کے کچھ راز بھی ظاہر کر جاتے ہیں مگر جاوید عارف کے اس سفرنامے میں یہ پہلو کچھ زیادہ ہے۔ اپنی بیماری کی تفصیل، اپنے بھائی اعجاز رؤف خان کی بیماری' تیمارداری اور پھر موت۔ اِس موت کے نتیجے میں اُن پر پڑنے والے اثرات۔ جاوید عارف کی زندگی کے دُکھ یقیناً اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ المیہ ادب تا دیر زندہ رہتا ہے۔ جاوید عارف کا قاری بھی کچھ ایسے ہی حقائق سے آگاہ ہوتا ہے۔ جاوید عارف خود بھی اِس حقیقت سے آگاہ ہے تبھی تو لکھتا ہے:

''میں نے اس سفرنامے کو آپ بیتی کے انداز میں بیان کیا ہے اور بات بات میں ہی معلومات مہیا کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ معلومات کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنے اور اُن کے معاشرے میں تفاوت' سوچ میں فرق' رویوں اور ترجیحات میں فرق واضح ہو سکے۔''

اس بات کے پس منظر میں یہ واقعات بھی اہم محسوس ہوتے ہیں۔ جاوید عارف نے

اس سفرنامے میں زندگی کی تصویر پیش کی ہے۔ زندگی کے کرب سموئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رویئے، اُن کی مطلب پرستی اور خودغرضی کو بھی سامنے لائے ہیں۔

یہ سب اپنی جگہ، جاوید عارف کا سفرنامہ ''کچھ عشق کیا' کچھ کام کیا'' سفرنامے کے تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔ معلومات کا ایک جہان ہے، احساسات و مشاہدات کی ایک دنیا ہے۔ طرزِ تحریر کی خوبصورتی قاری کو ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے، پھر بھی، حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کی کیفیت ہے کیونکہ کہیں کہیں ایک تشنگی کا احساس بھی موجود رہتا ہے۔

یہ تشنگی اپنی جگہ لیکن تمام معلومات اپنی جگہ اہم ہیں۔ جاوید عارف کے طرزِ تحریر کی خوبصورتی گواہ ہے کہ جاوید عارف اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب ہے کیونکہ اِس کتاب کو ایک دفعہ پڑھنا شروع کردیں تو کتاب ختم کیے بغیر اِسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اور یہی ایک اچھی تحریر کی شان ہے اور کسی تحریر کے امر ہونے کی گواہی بھی ہے۔

ڈاکٹر ارشد اقبال ارشد

ایڈیٹر ماہنامہ ''لکھاری'' لاہور

سفر میں دھوپ تو ہوگی!!!

سفر کٹھنائیوں سے ہی عبارت رہا ہے۔ایک مزدور اور متوسط طبقے کے فرد کے سفر پر تو تعیش کا گمان بھی نہیں ہوسکتا۔اُسے تو سفر کے مقاصد اور مسائل کے سلگتے الاؤ گھیرے رکھتے ہیں۔ جاوید عارف نے ایسے ہی نامساعد ماحول میں کئی بار انگلینڈ کے سفر کئے ہیں۔ دیس میں گھر شاد آباد رکھنے کے لئے پردیس کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔سفر کر کے اجنبیت کے دھکے کھائے ہیں۔مگر حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ اس نے اس کارِ مشکل کو نہ صرف آسان کیا بلکہ سفرنامہ بھی لکھ دیا ہے جو شاید سفر اور پردیس کاٹنے سے بھی مشکل تجربہ ہوا کرتا ہے۔دکھ اٹھانا حالات کا جبر ہوتا ہے۔دکھ بیان کرنا دوسری بات ہے۔پھر ان دکھوں اور ناآسودہ لمحوں کو لفظوں کا روپ دینا اور وہ بھی اس طرح کہ قاری پر کوئی بوجھ آنے کی بجائے اس کی تفریح کا باعث بنے، دل چسپ معلومات کا خزانہ بخشے، اہم ترین کام ہے جو ہر مسافر کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔

سفرنامہ دنیا بارے جاننے اور تہذیبوں کا مزاج سمجھنے کا شوق رکھنے والوں کی مقبول ترین صنف ہے۔صنف کیا، بہت سی اصناف کا مجموعہ ہے، رپوتاژ، تاریخ، کہانی، عمرانیات، تہذیب و

ثقافت کے مطالعہ ومشاہدہ کا، دیس پردیس کے درمیان تہذیبی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی و سیاسی فرق کے احساس کا۔ یہ سارے عوامل اکٹھے ہو کر سفر نامہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ یوں سفر نامہ لکھنا مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں ہے کہ اس کے لوازمات اور تقاضے سفر کے ساتھ اور بہت کچھ کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔

جاوید عارف کا سفر نامہ ''کچھ عشق کیا کچھ کام کیا'' ان تمام حوالوں سے اہم ہے کہ اس میں فنی اعتبار سے بھی تمام تکنیکی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور فکری رویے بھی قابلِ ستائش ہیں۔ تحریر کی سادگی، سچائی، سلاست و روانی اس کے فنی فکری حُسن کو اور زیادہ خوبصورت بنا دیتی ہے۔ اس کو پڑھنے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ ''میں ہی ہوں جو لفظ لفظ سیاحت کر رہا ہوں''۔ دل چسپی کا یہ عالم ہے کہ پورا سفر نامہ پڑھ لینے کے بعد بھی شوق کی پیاس نہیں بجھتی اور پھر سے پڑھنے کی خواہش طبیعت کو آمادہ کر لیتی ہے۔ کچھ باتیں ہمارے ماحول میں ناپسندیدہ، غیر مانوس اور اچنبا ہیں۔ مگر اُدھر انگلینڈ میں زندگی کے معمول کا حصہ ہیں جو ہماری مشرقیت کو کبھی عجیب اور کبھی ناگوار محسوس ہوتی ہیں۔ لکھنے والا اگر ان سے پہلو تہی کرے تو نہ صرف سچائی کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہے بلکہ ایک طرح سے قاری کا تجسس معلومات سے محروم رہ جاتا ہے۔ مگر ہاں اگر صرف ان ہی دلفریبیوں میں گم ہو جائے تو سفر نامہ کی باقی فنی و فکری ضروریات کنارہ کر جاتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ جاوید عارف نے ایسے واقعات کو بیان کرتے ہوئے افراط و تفریط سے کام نہیں لیا، بات کو بات کی جگہ ہی رہنے دیا ہے۔ اس توازن نے سفر نامہ کو خوبی بخشی ہے۔

جاوید عارف بنیادی طور پر اردو اور پنجابی کا شاعر ہے اور اسی حوالہ سے خود کو متعارف کروا چکا ہے اور اپنے مجموعہ ہائے کلام کے ذریعے منوا چکا ہے۔ سفر نامہ لکھ کر اس نے ادبی دنیا میں

اپنے حصے کا ایک اور جہان آباد کیا ہے جو اس کی شاعری ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ پُرکشش ہے۔فضل احمد خسرو کی قربتوں میں میں نے غیر شاعروں کو شاعر اور ادب سے فاصلہ رکھنے والوں کو ادیب بنتے دیکھا ہے۔ وہ اپنے ملنے والوں کو ماحول ہی ایسا دیتا ہے کہ جذبے بولنے لگتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ جاوید عارف نے فضل احمد خسرو کی قربتوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ جاوید عارف نے جس برق رفتاری سے ادبی سفر طے کیا ہے وہ خود اپنی جگہ ایک سفر نامہ کا متقاضی ہے۔ اقبال صلاح الدین کے اس شعر پر بات مکمل کرتا ہوں کہ:

تلخ تھا بے شک وفا کے راستے کا ہر سفر
پر سفر کی داستاں کا لُطف دُہرانے میں ہے

ڈاکٹر نثار احمد

۲۲/اکتوبر ۲۰۱۰ء

☜ ☜ ☜

انگلینڈ گائیڈ

ابنِ بطوطہ سے لے کر ابنِ انشاء اور پھر ابنِ انشاء سے آج تک کئی سفرنامے لکھے گئے اور سفرنامے لکھنے والوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اب سفر کرنے میں بہت آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ سفر کرنا ابنِ بطوطہ اور ان کے بعد میں آنے والوں کے سفروں کی طرح اب جان جوکھوں کا کام نہیں رہا۔ اُس زمانے میں تو سفر کرنے والا گھر سے جوانی کے عالم میں نکلتا اور بڑھاپے کی حالت میں واپس آتا تھا۔ اِس دوران دنیا ہی بدل چکی ہوتی تھی۔ وہ اپنے شہر واپس آ کے ''اصحابِ کہف'' کی طرح کسی کو نہیں پہچان سکتا تھا اور نہ اُس کے شہر والے اُسے واپسی پر خوش آمدید کہنے کے لئے موجود ہوتے تھے۔ پرانے سفر کرنے والوں کے لئے تو اُن کے سفر ایک مہم کی طرح ہوتے تھے جن میں بہت دلچسپ اور محیر العقول واقعات رونما ہوتے رہتے تھے۔ جن کی وجہ سے اُن کے سفرنامے خود بخود بہت دلچسپ اور سنسنی خیز ہو جاتے تھے۔ لیکن آج سفر کی آسانیوں کی وجہ سے سفرناموں کو خود دلچسپ بنانا پڑتا ہے۔ جن کے لئے فرضی واقعات اور مصنوعی عشق ''ایجاد'' کرنے پڑتے ہیں۔ کسی راہ چلتی یا ہوائی جہاز کی ''محدود دنیا'' میں بھی کسی حسینۂ جانسوز کا سفرنامہ نگار پر فریفتہ ہو جانا اک روایت بن گیا تھا۔ یہ روایت ہمارے ''کچھ عشق کیا کچھ کام کیا'' کے سفرنامہ نگار جاوید عارف کے ہاں بھی نظر آتی ہے لیکن ان کی محترمہ ''لو جی'' سے

بات چیت فرضی نہیں بلکہ حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ اگر فرضی ہوتی تو معاملہ بہت دُور تک جاتا۔

سفرنامے بہت سے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔ جو بھی ادیب یا شاعر کسی غیر ملک کا سفر کرتا ہے اس پر سفرنامہ لکھنا ''واجب'' ہو جاتا ہے بلکہ بعض ادیب تو سفر ہی سفرنامہ لکھنے کے لئے کرتے ہیں تاکہ ''ہم خُرما و ہم ثواب'' والی ضرب المثل صحیح ثابت ہو جائے۔ سفرنامہ اب ادب کی ایک اہم صنف بن چکا ہے۔ ہمارے نقادوں اور تجزیہ نگاروں نے اِسے ادب کی ایک صنف کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور جاوید عارف اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔

جاوید عارف نے بڑی خود اعتمادی سے اپنے پہلے سفر کا آغاز کیا اور بڑے شوخ انداز میں اپنے سفرنامے کی بنیاد رکھ دی اور ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ سفرنامہ سفر کی روداد ہی تو ہوتا ہے جس میں ہر ضروری اور کبھی کبھی کچھ غیر ضروری پوائنٹ بھی آ جاتے ہیں۔ جاوید عارف نے سینئر سفرنامہ نگاروں کی روایت پر عمل کرتے ہوئے اسے ہلکے پھلکے رومانس کا تڑکا بھی لگا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ سفرنامے پڑھنے والوں کی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لئے کمرِ ہمت باندھ لی ہے۔ مجھے خود بھی تجربہ ہے کہ قاری اُس سفرنامے کو سفرنامہ ہی نہیں سمجھتے جن میں عشقیہ قصّے نہ دیئے ہوئے ہوں۔

''کچھ عشق کیا کچھ کام کیا'' میں جاوید عارف نے کام ہی کام کیا، عشق کیا بھی تو صرف کام کی خاطر۔ یہ ایک سفر کا ذکر نہیں ہے بلکہ کئی سفروں کا مجموعہ ہے یا اسے کئی سفروں کا نچوڑ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ ان کے انگلینڈ آنے جانے سے اور وہاں ان کے رشتہ داروں کے رہنے سہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلینڈ ان کا دوسرا ملک ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''انگلینڈ کے کئی پھیروں سے میری سب جھجک دور ہو چکی تھی اور اپنی محدود انگریزی کو صحیح معنوں میں استعمال کرنے لگا تھا''۔ حالانکہ ان کی خود اعتمادی اور خداداد ذہانت کی وجہ سے مجھے تو ان کا پہلا دورہ بھی پہلا نہیں لگا اور وہ ایک ''منجھے'' ہوئے مسافر کی طرح سفر کرتے رہے۔ وہ تو انگریزوں کے اپنے ملک میں

بھی اُن سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے میل جول میں اور روز کے کاروبار میں انہیں مرعوب کرتے رہے۔ ایئرپورٹس پر امیگریشن کے افسروں کے اوسان خطا کر دینے والے لمحات میں بھی وہاں کے افسروں سے باہوش وحواس نپٹتے رہے اوران کو ''سوری'' کہنے پر مجبور کرتے رہے۔

تاریخی اور دوسرے قابل دید مقامات کا بیان، وہاں کے رسم ورواج، لوگوں کا رہن سہن اور اُن کا باہر سے آنے والوں کے ساتھ سلوک، ان سب کے بارے میں سفرنامہ نگار کے اپنے تاثرات۔ اس طرح سفرنامہ معلومات اور تفریح کا ایک بہت عمدہ ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ جاوید عارف نے بھی اپنے سفرنامے کو معلومات کا خزانہ بنا دیا ہے۔ انہوں نے انگلینڈ کے متعلق اتنی معلومات مہیا کی ہیں کہ ان کے سفرنامے کو ''انگلینڈ گائیڈ'' کہا جائے تو بہتر ہے۔ انگلینڈ جانے سے پہلے انہوں نے اُس کے متعلق کچھ کتابیں بھی پڑھ لیں تھیں۔ دوسرے وہ وہاں اتنی دفعہ گئے، اتنی دیر تک رہے کہ وہاں کی تاریخ، جغرافیئے اور وہاں کے سوشل سیٹ اپ، لوگوں کے ڈسپلن، رواداری، زرعی زمین، وہاں کی پیداوار، پھولوں اور پرندوں کی قسمیں، کالوں اور گوروں کے سلوک اوران کے رہن سہن میں فرق، ان کی عادات اور معاشرت کا فرق، اتنی وضاحت اور فصاحت سے بیان کیا ہے کہ قاری کو تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ مانچسٹر شہر کی تاریخ، اس کے نام کی وجہ، اس میں رہنے والی مشہور شخصیتوں اوران کے کارناموں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے جو مانچسٹر جانے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

جاوید عارف نے اپنے اِس سفرنامے میں ہر جگہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اس ملک کی معلومات پیش کرنے میں شاعرانہ مبالغے سے کام نہیں لیا بلکہ اپنے مشاہدے کی آنکھ کو کھلا رکھ کر ہر شعبے کا جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا وہی بیان کر دیا ہے۔ حقیقت پسندی بہت اچھی ہوتی ہے لیکن بعض مقامات پر وہ زیادہ ہی حقیقت پسند ہو گئے ہیں اور ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جو صرف بے تکلف دوستوں میں ہی کی جاتی ہیں۔ اگر انہوں

نے کرنی ہی تھیں تو تشبیہہ و استعارے کے شاعرانہ پردے میں لپیٹ کر کر دیتے۔

عارف صاحب کی تحریر میں برجستگی، شگفتگی، شوخی اور ہلکے پھلکے مزاح کی چاشنی ملتی ہے جو پڑھنے والے کی دلچسپی کا باعث بن کے اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا لیتی ہے۔ اُن کو مکالمہ نویسی میں بھی ایک انفرادیت حاصل ہے۔ اُن کی انگریزوں سے بات چیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں رہتے ہوئے اُنہیں بامحاورہ انگلش پر عبور حاصل ہو گیا تھا اور وہ اُن کو ترکی بہ ترکی جواب دے کر لاجواب کر دیتے تھے۔ حالانکہ وہاں عمریں گزار دینے والے جٹکی انگریزی سے ہی گزارہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریر کا اپنا ہی ایک مزے دار رنگ ہے جو اُن کا اسلوب بن کر اُن کی پہچان ثابت ہو گا۔ وہ اردو لکھتے لکھتے اپنی بات کی مزید وضاحت کرنے کے لئے پنجابی زبان کا ایسا ''ڈھکواں'' لفظ استعمال کر جاتے ہیں جو سونے پر سہاگہ معلوم ہوتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ وہ کسی ماہر سنار کی طرح انگوٹھی میں خوبصورت نگینہ جڑ دیتے ہیں۔ اِس سفرنامے کی اضافی خوبی یا خصوصیت یہ کہی جا سکتی ہے کہ اِسے پڑھتے ہوئے ناول پڑھنے کا سا احساس ہوتا ہے یا یہ آپ بیتی لگتی ہے جیسا کہ کتاب کے آخر میں جاوید عارف صاحب نے خود اپنے اس سفرنامے کو آپ بیتی بھی کہا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو ہر سفرنامہ آپ بیتی ہی تو ہوتا ہے۔ جاوید عارف صاحب کا یہ نقشِ اول ان کے شاندار مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔

پروفیسر عاشق رحیل

لاہور

آپ بیتی کے زیرِ سایہ

سفرنامہ عہدِ حاضر کی مقبول ترین صنف ہے اور دنیا کی تمام زبانوں میں اِس کے شہکار دکھائی دیتے ہیں۔ کسی ملک کی سیر کے دوران حاصل ہونے والے تجربات و احساسات کو قاری کے ساتھ Share کرنے کا نام سفرنامہ ہے۔

ہر شخص کے رجحانات' احساسات' دلچسپیاں اور مزاج دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی منظر کو دیکھ کر اُس کا تاثر بھی ہر شخص الگ الگ لیتا ہے۔ مختلف سفرنامہ نگار ایک ہی شہر کی سیر کرتے ہیں مگر مقامات پر جانے کا انتخاب وہ اپنے مزاج اور اپنی دلچسپی کے مطابق کرتے ہیں۔ یوں رجحان، مزاج اور خیالات کی رنگارنگی اس صنف کو خوبصورتی سے نوازتی ہے اور قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہے۔

جاوید عارف اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ دونوں زبانوں میں اُن کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دنیا بھر کی سیر کر چکے ہیں۔ ''کچھ عشق کیا' کچھ کام کیا'' اُن کے انگلینڈ کے مختلف اسفار کے ذکر پر مشتمل سفرنامہ ہے۔ مختلف اسفار کے دوران حاصل ہونے والے تجربات اور ایک مدت تک انگلینڈ میں رہنے کے باعث یہ سفرنامہ سطحی نہیں بلکہ عمیق مطالعے

اور مشاہدے کا ثمر ہے۔ مصنف نے انگلینڈ کے دو درجن کے قریب وزٹ کیے اور وہاں کئی کام بھی کیے۔ جس کے باعث اُسے انگریزوں اور انگلینڈ میں بسنے والے پاکستانیوں کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ لہٰذا اُس کی معلومات سطحی نہیں ہیں وہ کسی ایک شخص کے رویئے کو پوری قوم کا نمائندہ رویہ نہیں سمجھتا بلکہ اُس کے انفرادی پس منظر میں بات کرتا ہے۔

جاوید عارف کے اِس سفرنامے میں انگلینڈ کے باشندوں کی نسبت انگلینڈ میں رہنے والے پاکستانیوں کی نفسیات‘ خیالات‘ احساسات اور مشکلات کا ذکر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ انگلینڈ میں رہنے والے کالے چوروں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ سڑکوں پہ ہونے والی چوما چاٹی بھی سفرنامے میں در آئی ہے۔ انگریزوں کے اپنے ماں باپ کو اولڈ ہوم میں چھوڑنے کی باتیں اور اولڈ ہوم میں بسنے والوں کی بے بسی اور تنہائی کے مناظر بھی اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ انگریز جہاں اپنے بوڑھے ماں باپ کو اولڈ ہوم چھوڑ کر بھول جاتے ہیں اور پھر کبھی فادر ڈے یا مدر ڈے پر کارڈ بھیج کر، فرض ادا ہو گیا‘ سمجھتے ہیں۔ وہاں والدین بھی اپنے بچوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ سکول ایجوکیشن وہاں فری ہے۔ ادھر سکول ایجوکیشن مکمل ہوتی ہے، اُدھر بچہ بالغ ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے بچے کے والدین کچھ نہیں کرتے۔ لڑکے لڑکیاں یونیورسٹی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے خود محنت کرتے ہیں۔ کہیں لڑکے ہوٹلوں اور دوسری جگہوں پر گھٹیا سے گھٹیا کام کرتے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں لڑکیاں یونیورسٹی اخراجات کے لیے بزنس (جسم فروشی) تک کرتی ہیں۔

بعض مقامات کی تاریخ بھی سفرنامے کا حصہ بنتی ہے مگر سفرنامے میں تفصیلی ذکر پاکستانیوں کا ہے۔ انگلینڈ میں بستے پاکستانیوں کے مسائل، اُن کے کاروبار، ان کی اولاد کا اُن کے ساتھ سلوک، وہاں پیدا ہونے والے بچے اُسی سماج میں رچ بس جاتے ہیں اور پاکستانی والدین اُن سے پاکستان جیسے سلوک کی توقع رکھتے ہیں۔

جاوید عارف نے انگلینڈ کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ قاری کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ جاوید عارف نے یہ سفر' سفر نامہ لکھنے کی نیت سے نہیں کیے۔ اسی لئے اُس نے کسی بھی سفر کے دوران نوٹس نہیں لیے، یوں سفر نامہ یادوں کے سہارے لکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامے میں انگلینڈ کی زندگی کا گہرا مطالعہ دکھائی دیتا ہے۔ پاکستانی دوستوں (جن کے ساتھ اُن کا زیادہ وقت گزرا) کی کردار نگاری موجود ہے۔ اپنوں کی محبت، نفرت، ایثار و قربانی، خود غرضی و مطلب پرستی کی کئی تصویریں نظر آتی ہیں مگر وہ حیرت کہیں دکھائی نہیں دیتی جو کسی منظر کو پہلی بار دیکھ کر مصنف کے تجربے کا حصہ بنتی ہے اور سفر نامے کا قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔

آپ بیتی کے عناصر بھی سفر نامے میں در آتے ہیں۔ مصنف اپنی ذات کے کچھ راز بھی ظاہر کر جاتے ہیں مگر جاوید عارف کے اس سفر نامے میں یہ پہلو کچھ زیادہ ہے۔ اپنی بیماری کی تفصیل، اپنے بھائی اعجاز رؤف خان کی بیماری' تیمارداری اور پھر موت۔ اِس موت کے نتیجے میں اُن پر پڑنے والے اثرات۔ جاوید عارف کی زندگی کے دُکھ یقیناً اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ المیہ ادب تادیر زندہ رہتا ہے۔ جاوید عارف کا قاری بھی کچھ ایسے ہی حقائق سے آگاہ ہوتا ہے۔ جاوید عارف خود بھی اِس حقیقت سے آگاہ ہے تبھی تو لکھتا ہے:

> ''میں نے اس سفر نامے کو آپ بیتی کے انداز میں بیان کیا ہے اور بات بات میں ہی معلومات مہیا کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ معلومات کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنے اور اُن کے معاشرے میں تفاوت' سوچ میں فرق' رویوں اور ترجیحات میں فرق واضح ہو سکے۔''

اس بات کے پس منظر میں یہ واقعات بھی اہم محسوس ہوتے ہیں۔ جاوید عارف نے اس سفر نامے میں زندگی کی تصویر پیش کی ہے۔ زندگی کے کرب سموئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رویئے، اُن کی مطلب پرستی اور خود غرضی کو بھی سامنے لائے ہیں۔

یہ سب اپنی جگہ، جاوید عارف کا سفرنامہ ''کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا'' سفرنامے کے تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔ معلومات کا ایک جہان ہے، احساسات و مشاہدات کی ایک دنیا ہے۔ طرزِ تحریر کی خوبصورتی قاری کو ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے، پھر بھی، حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کی کیفیت ہے کیونکہ کہیں کہیں ایک تشنگی کا احساس بھی موجود رہتا ہے۔

یہ تشنگی اپنی جگہ لیکن تمام معلومات اپنی جگہ اہم ہیں۔ جاوید عارف کے طرزِ تحریر کی خوبصورتی گواہ ہے کہ جاوید عارف اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب ہے کیونکہ اِس کتاب کو ایک دفعہ پڑھنا شروع کر دیں تو کتاب ختم کیے بغیر اِسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اور یہی ایک اچھی تحریر کی شان ہے اور کسی تحریر کے امر ہونے کی گواہی بھی ہے۔

ڈاکٹر ارشد اقبال ارشد

ایڈیٹر ماہنامہ ''لکھاری'' لاہور

☞ ☞ ☞

السلام علیکم!

کیا مجھ پر میرے ربّ کی خاص عنایت نہیں ہے کہ ایک بے مایہ شخص نے خواہش کی کہ اس نے دنیا دیکھنا ہے اور مالک نے نامساعد حالات اور بظاہر بے وسائل ہونے کے باوجود اُس کو حسبِ منشاء ہوا کے گھوڑے پر سوار کر دیا۔ شاید میرے ربّ نے میرے شوقِ جہاں نوردی اور خلوصِ نیت کو پرکھا ہوگا۔ پھر اُس نے کرم کے دروازے اس طرح کھولے کہ اُس نے مجھے بہت زیادہ مشکلات میں مبتلا کئے بغیر میری روزی کو ہی اس سفر و سیاحت سے منسلک کر دیا۔ میں اب تک درجنوں ملکوں کی سیاحت کر چکا ہوں۔ امریکہ اور برطانیہ میں تو مزدوری بھی کرتا رہا ہوں۔

میں نے ادب میں اردو شاعری کی کتاب ''ویراں پڑے ہیں راستے'' سے سفر کا آغاز کیا۔ پھر اس ویران راستوں کے مسافر نے ''اتھرو آپ دلیلاں'' کے نام سے پنجابی شاعری کی کتاب پیش کی۔ میری جہاں گردی اور بنجارہ پن کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میرے دانشور دوست ڈاکٹر نثار احمد اور میرے شعروادب میں استاد فضل احمد خسرو نے اصرار کیا کہ میری ملک ملک کی سیر کی کہانی لکھی جانی چاہیے تاکہ پڑھنے والوں کو تفریح اور معلومات سے محظوظ کیا جا سکے۔ یہ انہی کی مہربانی، انتہائی تعاون اور حوصلہ افزائی سے ممکن ہوا ہے کہ اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کتاب کیسی ہے؟ فیصلے کا اختیار یقیناً آپ کے پاس ہے۔ میرے ذمے کام کرنا تھا وہ میں نے کر کے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب آپ کی رائے میرے لئے قیمتی سرمایہ ہوگی۔

فقط

جاوید عارف

146/غازی آباد، گلی نمبر2/اوکاڑا

موبائل:0321-3090121

ہم تو چلے پردیس

طیارہ اڑتیس ہزار فٹ کی بلندی کو چھو چکا تھا اور میں اپنی ناک کو جہاز کی ونڈو (Window) سے چپکائے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔سفید اور کہیں کہیں کالے بادلوں کے سوا کچھ بھی آنکھ کی حدود میں نہ تھا۔کبھی کبھی ایک برق سی لہراتی بتا رہی تھی کہ نیچے کہیں گرج چمک ہو رہی ہے،لیکن طیارے کا ماحول پرسکون اور پرواز Smooth تھی۔

میرے ہاتھ میں کتاب تھی جو کہ انگلینڈ سے متعلقہ معلومات پر مبنی تھی۔پچھلے چند دن میں نے ایسی ہی کتابیں پڑھنے اور انگلینڈ میں رہنے والے اپنے کچھ دوستوں، واقف کاروں اور عزیزوں کے پتے اور فون نمبر وغیرہ اکٹھے کرنے میں صرف کیے تھے تا کہ بوقتِ ضرورت کام آئیں۔جہاز میں کافی سیٹیں خالی نظر آ رہی تھیں۔میرے ساتھ والی دونوں کرسیاں بھی خالی پڑی تھیں۔

میں اِس جہاز میں اپنے بھائی کی کوششوں سے سوار تھا۔اُس نے مجھے نا صرف سپانسر (Sponsor) بھیجا تھا بلکہ دوسرے طریقہ کار کے متعلق بھی راہنمائی مہیا کی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ مالی انتظامات میں بھی بہت ہاتھ بٹایا تھا۔اس کے باوجود برطانوی سفارت خانے میں میرا دھڑ رگڑا قسم کا انٹرویو ہوا جو کہ تقریباً 45 منٹ پر محیط تھا۔میں اپنی انگریزی کو کافی کمزور سمجھتا تھا اس لیے میں نے گورے سے ترجمان کے ذریعے بات کرنے کی کوشش کی،مگر جب میں نے دیکھا کہ میرے پورے دو منٹ کے جواب کو ترجمان لڑکی ایک فقرے میں سمیٹ کر بیان کر رہی ہے تو مجھے

مداخلت کرنا پڑی۔ دوتین دفعہ کی مداخلت پر گورے نے کہا کہ تم خود انگلش سمجھ اور بول سکتے ہو تو خود بات کرو، مگر میں نے اُس لڑکی کے ذریعے ہی بات کرنا مناسب سمجھا۔ وہ بی بی بھی کافی سمجھ گئی تھی۔ بعد میں اُس نے جہاں ضرورت پڑی الفاظ کی چمتکاری سے میرے مؤقف کو اور زوردار بنا دیا۔ اس دوران گورے کی چمکتی آنکھیں ایک منٹ کے لیے بھی میرے چہرے سے نہ ہٹیں۔ بالآخر اُس نے کچھ سوچا۔ میرے انٹرویو کے نوٹس کا جائزہ لیا، لڑکی سے ہلکا سا مشورہ کیا جس نے میری فیور میں چند الفاظ کہے اور گورے نے مجھے ویزہ جاری کرنے کی نوید سنا دی اور میرا پاسپورٹ اور کاغذات لے کر انٹرویو کیبن سے باہر چلا گیا۔ لڑکی نے میری راہنمائی انتظار گاہ تک کی۔ میں نے مدد پر اُس کا شکریہ ادا کیا تو کھل گئی اور نو پرابلم کہہ کر لہراتی ہوئی چلی گئی۔

اور یوں اب میں کاغذی طور پر کنوارہ، ایک سٹوڈنٹ، جہاز میں محو پرواز تھا۔ اِس تمام کہانی کا ہدایت کار دراصل میرا بھائی انعام تھا۔ وہ مجھ سے 4 سال چھوٹا اور بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔ اُس نے آج سے تقریباً دو سال پہلے چھوٹے بھائی ضیاء الرؤف خان کو بھی کافی بھاری فیس بھر کر انگلینڈ کے ایک اچھے سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اُس وقت کسی ویزا کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ سکول کے داخلہ اور بھائی کے سپانسر پر ضیاء پرواز کر گیا تھا، مگر اب یہ ویزا سسٹم شروع ہو چکا تھا۔ دوسرے ویزا آفیسر امیدواروں کو جلدی جلدی فارغ کر رہے تھے، مگر میرے ساتھ جو مسئلہ تھا وہ میرا جوان ہونا، غیر شادی شدہ ہونا اور سٹوڈنٹ ہونا تھا اور ویزہ آفیسر کے خیال میں میرے عزائم سیر کے علاوہ دوسرے ہو سکتے تھے۔ اُس کا یہ خیال کوئی غلط بھی نہ تھا مگر میرا زبانی اور کاغذی موقف یہی تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اِس کے لیے بھائی نے مجھے خاص طور پر بریف (Brief) کیا تھا۔ اب میں محوِ پرواز اگلی بات سوچ رہا تھا کہ ویزا اتنی مشکل سے ملا ہے تو آگے ایئرپورٹ پر جانے کیا ہوگا۔ بہرحال اُس کے لیے بھی میرے پاس کافی بریفنگ موجود تھی۔

میں ابھی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ''ایکسکیوزمی'' سن کر کھڑکی سے سر ہٹایا۔ دیکھا تو تقریباً چالیس سالہ گوری چٹی عورت میرے پاس بیٹھنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ وہ چاروں طرف سے مناسب حد تک بھری بھری تھی۔ جسم پر کافی سونا بھی سجا رکھا تھا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد یہ بات کُھلی کہ وہ خاصی باتونی تھی جب کہ اُس کے ساتھ جو انگریز جوڑا اپنی بچی کے ساتھ درمیان والی سیٹوں پر محوِ پرواز تھا وہ آپس میں گُم تھے اور بقول اُس کے ''وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بے شرمی سے ایک دوسرے سے ''پچ پُچ'' کرنے لگ جاتے تھے، کیونکہ میرے ساتھ والی دونوں کرسیاں خالی تھیں اور میں اُسے اپنا سا لگا تھا اِس لیے وہ اِدھر آ گئی تھی''

''لو جی تسی تے کجھ بولدے ای نہیں او'' (لو جی آپ تو کچھ بولتے ہی نہیں ہیں)

''آپ کہاں تشریف لے جا رہی ہیں''

''لو جی جہاں یہ جہاز جا رہا ہے۔ وہیں جاؤں گی''

''یہ جہاز تو کوپن ہیگن، پھر پیرس اور پھر لندن جائے گا''

''لو جی میں نے بھی تو لندن ہی جانا ہے اور تُسی ......؟''

''میں نے بھی'' میں نے مختصر جواب دے کر طویل سانس لیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا کہ اب تو لمبا ساتھ تھا۔ میں نے اُس سے سگریٹ پینے کی اجازت لی تو وہ بولی۔

''لو جی شوق سے پیو۔ مجھے مرد سگریٹ پیتے ہوئے اچھے لگتے ہیں، مگر یہ عورتیں ہیں ناں، ماہی منڈا بنتی ہیں۔ یہ سگریٹ پیتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگتیں'' (اُس وقت دورانِ پرواز جہاز کے ایک مخصوص حصّے میں سموکنگ کی اجازت تھی اور بورڈنگ کے وقت مسافر سے پوچھ کر سموکرز کو وہی سیٹیں دی جاتی تھیں)

دراصل سفر کے لیے تیاری اور پھر اوکاڑا سے اسلام آباد کے لمبے سفر میں بہت وقت صرف ہوا تھا جس سے میں کافی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے میرا پروگرام تھا کہ جونہی جہاز میں

کھانا سرو ہوگا، فارغ ہوکر لمبی تان کر سو جاؤں گا تاکہ لندن میں امیگریشن کے لیے فریش ہو جاؤں۔ چائے وغیرہ جہاز کی پرواز کے تھوڑی دیر بعد ہی سرو کردی گئی تھی اوراب کھانا آیا ہی چاہتا تھا، مگراب محسوس ہورہا تھا کہ یہ ''لوجی'' سونے نہیں دے گی۔ میں نے سوچا کہ یار! سویا تو گھر جا کر بھی سکتا ہے، تو انگلینڈ کے متعلق کتاب ہاتھ میں لیے پھرتا ہے، یہ بھی تو انگلینڈ سے متعلقہ ایک کتاب ہے۔ کیا حرج ہے اگر اسے ہی پڑھا جائے، اُس نے شاید میرے خیالات کچھ کچھ پڑھ لیے تھے، فوراً بولی ''یہ جی آپ کوئی کتاب پڑھ رہے تھے؟''

''جی ہاں۔ انگلینڈ کے متعلقہ ضروری معلومات ہیں''

''لوجی۔ اس کا مطلب ہے یہ آپ کا انگلینڈ کا پہلا سفر ہے؟''

جب میں نے اُسے بتایا کہ یہ انگلینڈ کا ہی نہیں، میرا کسی بھی غیر ملک کا پہلا سفر ہے تو پتہ نہیں کیوں وہ اور خوش ہوگئی اور بولی:

''اچھا جی، ماشاءاللہ کون سے شہر سے تعلق ہے آپ کا۔''

''اوکاڑا سے''

''اچھا جی وہاں کی کون سی شے مشہور ہے۔؟''

''وہ شے آپ کے سامنے بیٹھی ہے''

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا دی۔ تب میں نے سوچا کہ اِس کے پاس تو بہت کچھ ہے۔ میں تو اِسے صرف ''آنٹی'' سمجھ کر ٹریٹ کررہا ہوں اور غلطی کررہا ہوں۔ مجھے اپنی طرف غور سے دیکھتے پا کر وہ شرما گئی۔ شاید میری سوچوں کی اس گڑبڑ کو وہ اپنی زنانہ حس سے محسوس کر چکی تھی۔ جلدی سے بولی، ''دیکھیں ناں! میرا تعلق سیالکوٹ سے ہے اور وہاں کی مشہوری کھیلوں کے سامان سے ہے'' لیکن میں اب پٹڑی سے اتر چکا تھا۔ میں نے کہا

''چیزیں انسان بناتے ہیں۔ اصل چیز انسان ہوتے ہیں۔ مجھے تو سیالکوٹ کی اصل شے آپ ہی لگتی ہیں''

اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں مصنوعی غصہ بھر کر مجھے گھورا اور بولی

''آپ کا نام کیا ہے جی؟''

''جاوید''

یہ سنتے ہی اُس کی چمکتی آنکھیں بجھ سی گئیں اور وہ خاموش ہوگئی۔ میں نے بھی اُسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور ایک اور سگریٹ سُلگا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آخر اِس سکوت کو جہاز کے عملہ کی چہل پہل نے توڑا جو وہ کھانا سپلائی کرنے کے لیے شروع کر چکے تھے۔

کھانے کے وقفے کے دوران اُس نے خود کو سنبھال لیا اور ہماری گفتگو پھر شروع ہوگئی جس میں تکلف کی بجائے اب خاصی بے تکلفی اور دوستی کا رنگ نمایاں تھا۔ میں نے اُسے حسبِ داستاں بتایا کہ کنوارہ ہوں اور انگلینڈ گھومنے جا رہا ہوں اور اگر کوئی چانس ملا تو...... چھوٹا سا کاروبار ہے وغیرہ وغیرہ۔ انگلینڈ میں رہائش بھائی کے پاس ہوگی جو ''بلیک برن'' میں رہتا ہے۔

یہ سنتے ہی وہ خوش ہوگئی اور اپنے مخصوص سٹائل میں بولی۔

''لو جی وہ تو ہمارے نزدیک ہی ہے۔ ہم بریڈفورڈ میں رہتے ہیں ناں''

کوپن ہیگن تک ہمارے درمیان ''گوڑھی'' دوستی ہو چکی تھی۔ زیادہ تر وہی بولتی رہی۔ میرے کسی جُملے پر وہ ہنستی تو اُس کا انگ انگ ہنس پڑتا تھا اور میں مبہوت ہو جاتا۔ اس بات کو وہ بھی محسوس کر چکی تھی سو وہ مجھے بار بار مبہوت کرتی رہی اور میں ہوتا رہا۔

اُس نے بتایا کہ وہ سترہویں سال میں تھی کہ ایف اے کر لیا اور اُس کی منگنی اُس کے ایک کزن سے کر دی گئی، مگر چند ہفتے بعد ہی اُس کے لیے اُس کے انگلینڈ سے ایک دور کے عزیز کا رشتہ آ گیا۔ وہ آدمی تقریباً 50 کے پیٹے میں تھا، مگر لگتا کم تھا۔ ماں باپ نے انگلینڈ کے لالچ میں فوراً ہاں کر دی اور اگلے دو ماہ بعد جب اُس کا انٹر کا رزلٹ آیا تو ساتھ ہی انگلینڈ کا ویزہ لگ چکا تھا۔ یوں وہ سترہ سال کی عمر میں دلہن بن گئی اور اگلے سال ہی پہلی بچی اور اُس سے اگلے سال دوسری

بچی کی ماں بن گئی۔ خاوند کا چھوٹا سا گروسری سٹور تھا اور مکان اپنا تھا، پتہ چلا کہ وہ پہلی دو بیویوں کو طلاق دے چکا ہے، کیونکہ اُن سے بچہ نہیں ہوا تھا۔ چھوٹی عمر کی وجہ سے اُس کی دونوں بچیاں اپریشن سے ہوئیں تھیں اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے برعکس دوسری بچی بہت جلدی ہوگئی تھی۔ اِس لیے دوسری دفعہ اُس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی اور ڈاکٹروں نے منع کیا کہ اب کم از کم 5 سال کا وقفہ ہونا چاہیے۔ یہی بات اُن کے اختلاف کا باعث بنی۔ اُس کے خاوند کو جلد از جلد وارث چاہیے تھا اور وہ اب جلدی بچے کے حق میں نہ تھی کہ بھگتنا تو اُسے ہی تھا۔ آخر خاوند نے ہاتھ اُٹھایا تو اُس نے پولیس کو بلا کر خاوند کو گرفتار کرا دیا۔ بس پھر اُن میں کبھی نہ بن سکی اور یہ بات آخر طلاق پر منتج ہوئی اور اب وہ ''ویہلی'' تھی۔ اُس کی دونوں بیٹیاں اُس کے پاس تھیں اور بڑی اب تقریباً سترہ اور چھوٹی سولہ کی ہونے والی تھی۔ وہ اُن کے رشتوں کی تلاش میں پاکستان گئی تھی، مگر کوئی رشتے دار لالچی لگے تو کہیں لڑکے پسند نہیں آئے اور کہیں لڑکے پڑھے لکھے نہیں تھے۔ میں درمیان میں کہیں کہیں لقمہ دے رہا تھا۔ یہاں بھی بول پڑا

''یقین نہیں آتا''۔

''لو جی کس بات کا یقین نہیں آتا آپ کو؟'' اُس نے استفسار کیا۔

''یہی کہ آپ کی بیٹیاں جوان ہو کر شادی کی عمر کو بھی پہنچ چکی ہیں، جبکہ آپ تو خود ابھی......؟''

''لو جی آپ تو ایسے ہی......'' وہ تھوڑا شرما اور گھبرا کر بولی۔

میں نے یہ اُسے گھسیٹا نہیں تھا بلکہ اُس کے ساتھ بیٹھ کر، باتیں کر کے اور اُسے محسوس کر کے ایسے لگ رہا تھا کہ وہ 32-30 کی ہوگی، جبکہ اُس کے اپنے حساب سے اس کی عمر تقریباً 35 سال تھی۔

اُس کے ساتھ یہ دلچسپ گفتگو جاری تھی، مگر میں کن اکھیوں سے اُس گورے جوڑے کو

بھی دیکھ رہا تھا جن کے پاس سے وہ اُٹھ کر آئی تھی۔ انہوں نے اپنی چھوٹی سی بچی کو خالی سیٹ پر کرسی کے ساتھ نب(Nib) کر رکھا تھا اور گوری گورے کی چھاتی سے سر ٹکائے اونگھ رہی تھی۔ ہر دس پندرہ منٹ بعد وہ آنکھیں کھولتی اور اپنے ہونٹوں کو سیٹی بجانے کے انداز میں سکیٹر کر گورے کی طرف کر دیتی جو انہیں بڑی نرمی سے چوم لیتا اور وہ پھر شانت ہو کر اُسی انداز میں اونگھنے لگتی۔

میری ساتھی نے میری اس دلچسپی کو محسوس کر لیا۔ پہلے تو وہ خاموش سی ہو گئی اور پھر بتانے لگی کہ یہ دونوں میاں بیوی نہیں ہیں بلکہ سول پارٹنر ہیں اور کوپن ہیگن میں رہتے ہیں اور ایک بچی بھی پیدا کر چکے ہیں۔ یہ اُس نے اُن کی باتوں سے اخذ کیا تھا۔ سول پارٹنر(Civil Partner) کی اصطلاح میرے لیے نئی تھی، اُس نے تفصیل سے بتایا کہ جو جوڑے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں وہ میاں بیوی کی طرح رہنے لگتے ہیں اور اُن کے بچوں کو کئی ملکوں میں قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے ایک شادی شدہ جوڑے کے بچے کو ہوتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ یہ گوریاں اندر سے بہت ''گندیاں'' ہوتی ہیں۔ اس طرح کرنے سے اُنہیں وفاداری وغیرہ کی اُلجھن نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے میرا انگلینڈ کی گوریوں اور کالیوں سے غائبانہ تعارف شروع کروا دیا۔ لُب لِباب یہ تھا کہ یہ بہت ''گندیاں'' ہوتی ہیں۔

بقول اُس کے '' ٹھیک ہے بندے کو کبھی کبھی تنہائیاں ''وَڈّن'' کو دوڑتی ہیں، کیونکہ یہاں آدمی دن رات کام کر کے بالکل مشین بن جاتا ہے تو اُسے اپنے ملک کی محفلیں اور دوستیاں یاد آتی ہیں۔ دوستی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مرد اور عورت بھی دوست ہو سکتے ہیں، مگر آدمی کو ان ''گندیوں'' سے دور ہی رہنا چاہیے۔ یہ سب اوپر سے 'لشکدیاں' ہیں پر اندروں......توبہ توبہ، ویسے بھی ہم مسلمانوں کو اِن کافروں سے دور ہی رہنا چاہیے' وغیرہ وغیرہ۔

جہاز میں جب چائے، کافی یا سوفٹ اور ہارڈ ڈرنک سرو ہونے شروع ہوئے تو اُس سے مجھے ہارڈ اور سوفٹ ڈرنک کی اصطلاح کا بھی پتہ چلا۔ بتانے لگی

'' اُس کا سابقہ خاوند ہمیشہ ہارڈ ڈرنک پسند کرتا تھا۔ پینے کے بعد اُس کا موڈ بہت

خوشگوار ہو جاتا۔ پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ یہ اُس کی تھکن دور کر دیتی ہے۔ ایک دن اُس نے بھی خاوند کے کہنے پر کوک میں ملا کر تھوڑی پی تو خوشگوار احساس ہوا۔ بعد میں اُس نے پتہ نہیں کتنی بار میرے گلاس میں کوک کے ساتھ وہ ملا دی، لیکن صبح کو مجھے احساس ہوا کہ اُس نے یہ جان بوجھ کر کیا تھا اور مجھے پلا کر اپنا وہ ناجائز مطالبہ پورا کر لیا تھا جو میں کئی سال سے مان کر نہیں دے رہی تھی''

یہ کہہ کر وہ اچانک چپ ہو گئی۔ روانی میں اُس کے منہ سے یہ نکل تو گیا تھا، مگر لگتا تھا اب وہ اسے بری طرح محسوس کر رہی ہے۔

میں نے بات بدلنے کو کہا ''یہ ہارڈ اور سوفٹ ڈرنک میں کیا فرق ہے؟''

تو وہ جلدی سے بولی...... جیسے خود بھی بات بدلنے کی جلدی ہو۔

''لو جی۔ آپ کو نہیں پتہ۔ یہ وسکی شسکی ہارڈ ڈرنک کہلاتے ہیں اور یہ کوک شوک سب سافٹ ڈرنک ہیں۔ یہاں کے لوگ بیئر کو بھی سوفٹ ڈرنک کہتے ہیں۔ بندے کی پیاس اور تھکن دور کر دیتی ہے۔ ایک آدھ ڈبا پی لیں تو سکون آ جاتا ہے۔ اس میں کونسا نشہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کبھی کبھی تو موسم ایسا سخت سرد ہو جاتا ہے کہ تھوڑی سی برانڈی لینی پڑتی ہے۔ برانڈی کا تو پتہ ہے ناں آپ کو؟'' جب میں نے ناں بولا تو کہنے لگی۔

''لو جی۔ برانڈی تو پاکستان میں بھی عورتیں چھوٹے بچوں کو سردی سے بچانے کے لیے دو چار قطرے پلا دیتی ہیں''

میں نے اندازہ لگایا کہ جب اُس کے خاوند نے اُسے ''ہارڈ ڈرنک'' پلا کر ''ناجائز فائدہ'' اٹھایا تھا اس وقت ممکن ہے یہ شرابن نہ ہو، مگر اب......

بقول اُس کے ''اُس کی بیٹیاں گوری چٹی ہیں اور بالکل میمیں لگتی ہیں۔ انگریزی بھی میموں کی طرح ہی بولتی ہیں'' بہرحال اُس کی رفاقت ایک دفعہ شروع ہوئی تو پھر کوپن ہیگن اور پیرس سے ہوتی ہوئی ہیتھرو ایئرپورٹ پر جا کر ختم ہوئی۔

ہم نے جہاز سے لے کر امیگریشن کاؤنٹرز تک کا لمبا فاصلہ اکٹھے طے کیا تو وہ کہنے لگی۔

’’لو جی آپ بھی عجیب آدمی ہو، میرا فون نمبر اور پتہ تو مانگا ہی نہیں‘‘

’’آپ کی دلچسپ باتوں میں ایسا گم ہوا کہ ایسا لگا کہ آپ جیسے میرے ساتھ ہی رہیں گی‘‘

وہ خوش ہو گئی اور مجھے اپنا فون نمبر اور پتہ نوٹ کرایا۔ امیگریشن کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو کہنے لگی

’’مجھے تو اُس لائن میں جانا ہے جہاں ’’برٹش پاسپورٹ‘‘ لکھا ہے۔ آپ اُس لائن میں جائیں گے اور آپ کو دیر بھی لگے گی۔ رابطہ رکھیئے گا‘‘

میں نے کہا ’’ایک بات تو بتاتی جاؤ‘‘

’’کہنے لگی کیا؟‘‘

’’جہاز میں میرا نام سن کر تم خاموش کیوں ہو گئی تھیں‘‘ ایک لمحہ کو ہچکچائی پھر بولی۔

’’لو جی، وہ میرے پہلے منگیتر کا یہی نام تھا ناں۔ اب تو وہ پانچ بچوں کا باپ ہے‘‘

اُس نے مجھے حیران کر دیا اور ہاتھ ہلاتی ہوئی اپنی لائن کی طرف چلی تو میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور بولا

’’میں آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا‘‘

’’کیا......؟‘‘

’’میں بھی بائی برتھ (By Birth) سیالکوٹی ہوں‘‘

’’ایں......اچھا......؟‘‘ وہ ٹھٹھک گئی۔

اب حیران ہونے کی اُس کی باری تھی اور میں ہاتھ ہلاتا ہوا اپنی متعلقہ لائن کی طرف چل دیا۔ وہ ایک لمحے کو گومگو میں کھڑی رہی، مگر پھر آہستہ قدموں سے برٹش پاسپورٹ ہولڈر والی لائن کی طرف بڑھ گئی۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

میں بڑے اچھے موڈ میں ہینڈ بیگ سنبھالے امیگریشن لائن میں لگا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے میڈم سیالکوٹن جاتے جاتے تھوڑا سا سرپرائز (Surprise) دے گئی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں کاؤنٹر تک پہنچا تو وہاں موجود گورے نے بھی خوشگوار انداز میں کہا۔

ہیلو ینگ مین! ہاؤ آر یو؟ (جوان آدمی۔ کیسے ہو؟)

Hello Young man! How are You?

فائن سر۔ میں نے جواب دیا تو وہ میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ دیکھنے لگا۔

سٹوڈنٹ؟ انداز استفہامیہ تھا۔

یس سر

نو میرج، سنگل؟ **"No Marriage, Single?"**

یس سر، سنگل

وہ جان بوجھ کر مختصر، مگر ضروری سوال پوچھ رہا تھا تاکہ میں جواب دے سکوں۔

ہاؤ لونگ یو ول سٹے **(How long you will stay)**

اباؤٹ سکس ویک سر (تقریباً 6 ہفتے)

”آپ کا اس دورے کا مقصد کیا ہے؟“

"What is the purpose of your visit?"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس میں مجھے اپنا موقف واضح کرنا تھا۔ سو میں نے ایک چھوٹی سی تقریر کی، مگر شاید اُس کی سمجھ میں نہ آ سکی یا وہ مطمئن نہ ہوا۔ اُس نے مجھے کھڑا رکھا اور خود دوسرے کاؤنٹر پر جا کر ایک پاکستانی یا انڈین لڑکی کو بلا لایا۔ بس پھر کیا تھا اُس نے لڑکی کے ذریعے اُردو میں کئی سوال کیے اور میں نے جواب دیئے۔ لڑکی گلابی اردو بولتی تھی اور شاید میرے موقف کو نہ تو واضع طور پر سمجھ سکی اور نہ اُسے سمجھا سکی، حالانکہ اُس کی انگلش بالکل گوروں کی طرح تھی۔ بہر حال گورے نے مجھے کاؤنٹر سے کراس (Cross) کرایا اور ایک کمرے میں لے کر چلا گیا۔ وہاں اُس نے مجھے بٹھایا اور میرے ہاتھ میں ایک چٹ دے دی کہ وہ مطمئن نہیں ہے کوئی دوسرا آفیسر مجھے چیک کرے گا اور میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ لے کر چلا گیا۔

اس صورت حال (Situation) سے میں ذرا بھی نہ گھبرایا۔ معلومات کی کمی بعض مرتبہ بہت غنیمت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ وہ میرا ویزا چیک کروائیں گے جو کہ اصلی ہے۔ بس اللہ اللہ خیر صَلاّ۔ میں نے اردگرد نظر دوڑانی شروع کر دی۔ وہاں ایک طرف صوفے پر تین لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ کالا سیاہ رنگ اور کپڑے میلے کچیلے۔ میں نے علیک سلیک کی کوشش کی، مگر یا تو وہ انگلش سے واقفیت نہ رکھتے تھے یا جان بوجھ کر چپ تھے۔ صرف یہ پتہ چل سکا کہ تعلق سری لنکا سے ہے۔ کمرے میں ایک فریج نما چیز پڑی تھی جس میں کوک، پیپسی، فانٹا، لوکوذ ڈا اور اسی طرح کے مشروبات قطار در قطار سجے تھے۔ تھوری دیر بعد ایک لڑکی اندر آئی اور اُس نے اُس فریج میں ایک جگہ کچھ سکے ڈال کے ایک بٹن دبایا تو ٹھک کی آواز سے ایک کوک کی بوتل اُس فریج کے نچلے حصے میں گر گئی۔ جو اُس نے اٹھا لی۔ اِسی طرح اُس نے کچھ سکے فریج کے ساتھ رکھی ڈبہ نما مشین میں ڈالے اور ساتھ میں اوپر نیچے سجے دو کپ پکڑ لیے۔ ایک کپ اُس ڈبہ نما مشین میں ایک جگہ رکھا اور بٹن دبا دیا۔ کپ سیاہ کافی سے بھر گیا۔ اُس نے دوسرے کپ میں ساتھ

پڑے ڈبے سے خشک دودھ ڈالا اور ساتھ ہی ایک ڈبے سے چینی ڈالی اور کپ پھر مشین میں رکھ کر بٹن دبایا تو دوسرا کپ بھی بھر گیا۔ وہ کپ دونوں ہاتھوں میں اور بوتل بغل میں دبا کر چلی گئی۔

میرے لیے یہ مشین اور تماشا نیا تھا، میں اُٹھ کر اُن مشینوں کے پاس پہنچ گیا اور غور سے اُن کا معائنہ شروع کر دیا۔ دونوں بڑی سادہ مشینیں تھیں اور تمام ہدایات اوپر درج تھیں، اُس کمرے میں ایک ٹی وی بھی ایک کارنر میں اونچا کر کے فکس کیا گیا تھا جس پر کوئی نیوز چینل چل رہا تھا۔ میری آمد کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک گورا آفیسر آ کے اُن تینوں سری لنکن کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اب میں کمرے میں اکیلا تھا۔ مجھے مسلسل جاگتے ہوئے تقریباً 30 گھنٹے ہو چکے تھے۔ گھر تیاری میں دو تین گھنٹے، پھر اوکاڑا سے اسلام آباد 9 گھنٹے کا سفر، ائیر پورٹ پر 3 گھنٹے خجل خواری، لمبی فلائٹ اور اب یہاں۔ بیگم اور والدہ دونوں نے روتے ہوئے گھر سے رخصت کیا تھا۔ احمد تقریباً 5 سال کا اور احد 3 کا تھا۔ دونوں بت بنے ماں کو روتا دیکھ رہے تھے۔

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ ایک گورا میرا سامان کا بیگ اور آموں کی دونوں پیٹیاں لے کر آ گیا۔ ہیلو، ہائے کے بعد مجھ سے اقرار کروایا کہ یہ میرا ہی سامان ہے اور میں نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے پیک اور بند کیا ہے۔ پھر مجھے بیگ کھولنے کو کہا۔ میں نے تالے کی چابی اُس کے حوالے کر دی۔ میں مطمئن تھا کہ اس میں ایسی کوئی قابلِ اعتراض چیز نہ ہے۔ اُس نے بڑی باریک بینی سے میرا ایک ایک کپڑا، اُس کی جیبیں، میرے بیگ میں رکھے جوتے، دوسروں کے لیے تحفے تحائف، سب کو چیک کر کے صوفے پر رکھ دیا اور بیگ کو باریک بینی سے چیک کرنے لگا۔ اُس نے اُس میں سے نکلنے والی ڈائری اور کاغذات کی فائل ایک جانب رکھ دی تھی۔ پھر اُس نے آموں کی پیٹیاں کھول لیں اور ایک ایک آم کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں اس تلاش کا مقصد کیا تھا۔ پھر اُس نے میری ڈائری اُٹھا لی اور اُس کی ورق گردانی کرتے ہوئے اُس میں لکھے پتے اور فون نمبرز کے متعلق مجھ سے سوالات کرنے لگا۔ بعد میں اُس نے جس وقت میرے کاغذات کی فائل چیک کی

تو اُس میں سے میرے تعلیمی سرٹیفکیٹ اور ڈگری دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک ایک دم بڑھ گئی۔

"آپ غیر شادی شدہ ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں۔" میں نے خفگی سے کہا۔

آپ جو کچھ پہلے کر چکے ہیں اسے بھول جائیے اور جو میں پوچھوں اُس کا جواب دیجیے۔ اُس نے ایک طرح کی جھاڑ پلائی۔

"جی ہاں۔" میں نے سوال کا جواب دیا۔

سٹوڈنٹ ہیں؟

جی ہاں۔

"کیا تعلیم حاصل کر رہے ہیں؟"

میں نے منصوبے کے مطابق جواب دے دیا۔

وہ سوال کرتا رہا اور میں ناگواری سے جواب دیتا رہا۔ جسے اُس نے محسوس کر لیا تو اُس نے مجھ پر واضح کیا کہ ویزے کا مطلب لازمی انٹری نہیں ہے۔ ہم اگر ضروری محسوس کریں تو آپ کو اُسی ائیرلائن سے واپسی پرواز سے واپس بھیجا جا سکتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے بلکہ آپ کے اپنے مفاد میں ہے کہ پوری توجہ سے جواب دیں۔

لُبِ لباب یہ کہ وہ اس بات سے مطمئن نہ ہو سکا کہ میں وزٹ پر آتے ہوئے اپنی ڈگریاں کیوں ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ اِس کا مطلب ہے کہ میری نیّت وزٹ (Visit) کی نہیں ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح یہاں ایڈجسٹ ہونا چاہتا ہوں۔ وہ ان نتائج کو اخذ کرنے میں کوئی ایسا غلط بھی نہ تھا۔ ان سب باتوں کا منطقی جواب تو یہی نکلتا تھا۔ اب مجھے اپنی یہ ڈگریاں وغیرہ ساتھ رکھنے کی غلطی کا شدت سے احساس ہوا، مگر میں اپنے موقف پر مسلسل اصرار کرتا رہا۔ اُس نے کچھ دیر سوچا اور میرے ساتھ مل کر میرا سامان واپس بیگ میں رکھوایا اور ایک چٹ میرے ہاتھ میں

دے دی۔ اُس پر بھی وہی لکھا تھا کہ میں مطمئن نہیں، کوئی دوسرا افیسر آپ سے بات کرے گا۔

پھر یہ تماشا اگلے کئی گھنٹے پر محیط ہو گیا۔ کبھی کوئی گورا اور کبھی گوری کاپی پنسل لیے آتے، مجھ سے تھوڑی دیر سوال و جواب کرتے اور پھر وہی چٹ۔ آخر نجانے کتنی دیر بعد ایک صاحب بمعہ ایک ٹرانسلیٹر (Translator) لڑکی کے آئے اور ذرا مختلف قسم کے سوال و جواب شروع کر دیئے۔ مجھے لگا کہ میں دوبارہ برٹش ایمبیسی اسلام آباد میں ہوں۔ تقریباً وہی سوال تھے۔ آخر جاتے جاتے وہ مسکرایا اور صرف دو لفظ (Good Luck) کہہ کر رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد جلد ہی ایک محترمہ تشریف لائیں اور مجھے پوچھا

''کیا کوئی ڈرنک یا کافی لینا ہے؟ اگر کھلا نہیں ہے تو میں پیسے دوں؟''

میں پہلے ہی اکتایا ہوا تھا۔ تھکن بھی تھی اور اب پہلی بار یہ خدشہ بھی تھا کہ شاید یہ مجھے واپس ہی بھیج دیں، کیونکہ آخری آدمی نے جو سوالات کیے تھے اُن سے لگتا تھا کہ انہوں نے اسلام آباد سے فیکس یا فون وغیرہ پر میرا تمام ریکارڈ منگوایا لیا ہے اور بات کسی اور جانب نکل گئی ہے۔ اُس وقت کمپیوٹر کی یہ ترقی نہیں تھی۔ اس صورتِ حال کو میرا دماغ برداشت کر چکا تھا اور اب میں آر یا پار والی حالت میں تھا۔ اسی انداز میں میں نے وہ آخری انٹرویو بھی دیا تھا۔ سُو اسی کیفیت میں اُس بیچاری کا ہمدردانہ سوال بھی مجھے زہر لگا اور میں اُس کے گلے پڑ گیا۔ میں نے اپنی واجبی انگریزی میں اُسے کھا جانے والے انداز میں کہا:

''میرے پاس کرنسی بھی ہے اور چینج بھی۔ مجھے یہ بلاڈی (Bloody) مشین چلانا بھی آتی ہے، لیکن میرے ساتھ یہ ہو کیا رہا ہے۔ کیا میں کوئی بہت بڑا جرم کر بیٹھا ہوں یہاں آ کر......''

اُس نے میرے اور بڑھنے سے پہلے ہاتھ اُٹھا دیا اور بولی

cool man cool, Its all over now

یعنی ''ٹھنڈے ہو جاؤ۔ اب یہ ختم ہو چکا ہے''

اُس نے مزید بتایا کہ وہ مجھے لینے آئی ہے، لیکن وہ اِس تمام صورتِ حال پر معذرت خواہ نہیں ہیں۔ یہ اُن کے فرائض میں شامل تھا کہ اپنی تسلی کے بعد مجھے انٹری دیں۔

اُس نے میرا سامان ٹرالی پر رکھنے میں مدد دی اور مجھے ساتھ لے کر باہر انٹری کلیئرنس آفیسر (Entry Clearance Officer) کے پاس لے گئی جہاں میرا بھائی پہلے ہی اُس کے پاس موجود تھا۔ اس نے ہنس کے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ آفیسر نے مجھے کہا

''میں تمہیں 3 مہینے کی انٹری دے رہا ہوں۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔''

"I am giving you 3 months entry. Lets see what happens next".

بھائی اور میں نے شکریہ ادا کیا اور ہم "Exit" کی طرف گرین چینل کے راستے چل پڑے۔ پاکستان کے ایئرپورٹ میں اُس وقت یہ رواج نہیں تھا۔ مگر لندن میں دو راستے تھے باہر جانے کے۔ اگر آپ کے پاس کوئی ایسا سامان ہے جس پر کسٹم لاگو ہوتا ہے تو آپ ایمانداری سے ریڈ چینل سے گزریں۔ وہاں کسٹم کے اہلکار اُس چیز پر حسبِ قانون کسٹم لاگو کر دیں گے جس کی پے منٹ وصول کرنے کا انتظام وہیں پر ہوتا ہے اور آپ فارغ۔ اِسی طرح آپ کے پاس اگر ایسی کوئی چیز نہیں ہے تو آپ گرین چینل (راستہ) کے ذریعے باہر جا سکتے ہیں۔ (اب پاکستان میں بھی باہر سے آنے والوں کے لیے گرین چینل ہے) وہاں بھی کسٹم کے چند اہلکار تعینات ہوتے ہیں جو مناسب سمجھیں تو کسی کا بھی سامان کھلوا کر چیک کر سکتے ہیں، لیکن وہ زیادہ تر خاموشی سے چہرے پڑھتے رہتے ہیں۔ شاید اُن کے سامنے چہرے خود بول پڑتے ہیں۔

وہاں وہ جس کو روکتے ہیں اُس سے بڑے شائستہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور بعد میں سامان پیک کرنے میں مدد بھی دیتے ہیں۔ اگر کوئی بڑی قابل کسٹم چیز نہ ہو تو چھوٹی موٹی چیزوں کو نظر انداز بھی کر دیتے ہیں۔ مثلاً سگریٹ کا صرف ایک ڈبہ (200 سگریٹ) لے جانے کی

اجازت ہے، لیکن میرے آنے والے سفروں میں انہوں نے دیکھنے کے باوجود میرے 5 ڈبوں کو بھی نظر انداز کر دیا۔ صرف مجھے یاد دہانی کرائی کہ ایک ڈبہ کی اجازت ہے۔ اُن سے زیادہ تو پاکستان میں کسٹم والے سگریٹ لے جانے والے کو تنگ کرتے ہیں اور بارگیننگ (Bargaining) کی کوشش کرتے ہیں۔

بالآخر میں اب انگلینڈ میں داخل ہو چکا تھا۔ گو کہ ٹینشن جھیلی تھی، لیکن میں ہر چیز کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس راستے سے باہر پہنچے تو وہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو کہ اپنے عزیز و اقارب کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ میرے والی فلائٹ کے لوگ تو اب گھروں میں آرام کر رہے ہوں گے، مگر ہیتھرو دنیا کا ایک ایسا ایئرپورٹ ہے جہاں ہر ایک منٹ بعد کوئی نہ کوئی فلائٹ لینڈ کر رہی ہوتی ہے یا فلائی کر رہی ہوتی ہے۔ اوپر ذرا اونچی فضاؤں میں ہر وقت بادل چھائے رہتے ہیں۔ موسم شدید ہو تو گہرے سیاہ ورنہ ہلکے پھلکے، لیکن انتظام ایسا اچھا ہے کہ بہت سے جہاز بیک وقت اُتر یا چڑھ رہے ہیں، کچھ لینڈنگ کے لیے فضا میں چکر لگا رہے ہیں، مگر مجال ہے کہ حادثے کا شائبہ بھی ہو۔ جب ہم باہر نکلے تو بھائی نے مجھ سے کچھ کھانے کا پوچھا۔ میرے انکار پر اُس نے ایک مشین میں پیسے ڈال کر دو کوک لیے اور ائیرپورٹ کے اندر ہی اندر مجھے لے کر پارکنگ میں پہنچ گیا جہاں اُس کی گاڑی پارک تھی۔ یہ کئی منزلہ پارکنگ تھی۔ اس میں پارکنگ کے بعد آدمی کو منزل اور پارکنگ رو (Row) یاد رکھنا پڑتی ہے جو کہ وہاں ستونوں پر نمایاں لکھی ہوتی ہے۔ مثلاً D-C-B-A وغیرہ۔ سو ہم نے سامان گاڑی میں رکھا اور گاڑی نکالی۔ نیچے بیریئر کے پاس روک کر بھائی نے پارکنگ کارڈ دکھایا تو انہوں نے فیس وصول کی اور بٹن دبا کر بیریئر اُٹھا دیا۔ ائیرپورٹ پر پارکنگ فیس فی گھنٹہ وصول کی جاتی ہے۔

جب ہم ائیرپورٹ سے باہر نکلے تو دل خوش ہو گیا۔ جو لندن جا چکے ہیں اُن کو پتہ ہے کہ لندن کی فضا میں ایک عجیب قسم کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ یہ خوشبو لندن میں اُگے ہوئے

درختوں، پھولوں اور سمندری ہوا کا مکسچر ہے اور بہت اچھی لگتی ہے۔ مین تو جب بھی لندن میں گیا ہوں مجھے یہ انوکھی خوشبو ہر دفعہ محسوس ہوئی ہے۔ میرے بھائی کے پاس جو کار تھی اُس میں سٹیلائٹ فون لگا ہوا تھا۔ اُس وقت موبائل فون وغیرہ کا رواج نہ تھا۔ مصروف بزنس مین یہ فون گاڑیوں میں فکس کروا لیتے تھے جس کے لیے علیحدہ سے بیٹری کار کی ڈگی میں فکس ہوتی تھی اور ایک ریڈیو کی طرز کا انٹینا ڈگی سے باہر فکس ہوتا تھا۔ بھائی نے دیکھا تو بہت سی کالیں اُس پر ظاہر ہو رہی تھیں۔ اُس نے سب سے پہلے میری پاکستان بات کروائی۔ پھر اپنے گھر بات کی، بعد میں اپنے علاقے کے MP (Member Parliment) سے بات کی اور اُس کا شکریہ ادا کیا۔

یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ باہر کیا ہو رہا تھا۔ میرے بھائی نے فلائٹ آنے کے تقریباً دو گھنٹے بعد امیگریشن سے رابطہ کیا تو انہوں نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ بھائی نے گھنٹہ بھر بعد پھر رابطہ کیا تو پھر وہی جواب۔ بالآخر بھائی نے اپنے علاقہ کے MP سے رابطہ کیا اور اُسے صورتِ حال بتائی اور مدد کی درخواست کی۔ اُس نے ائیر پورٹ امیگریشن سے معلومات لے کر بھائی کو بتایا کہ میں پہنچ چکا ہوں، مگر کچھ پرابلم ہے اور میری امیگریشن چیکنگ ہو رہی ہے۔ اُس نے بھائی کو بتایا کہ اُس نے اپنی حدود میں رہتے ہوئے سفارش کر دی ہے۔ اس سے زیادہ وہ قانونی معاملات میں مداخلت کا حق دار نہیں ہے۔ بہر حال کافی تجل خواری کے بعد انہوں نے بھائی کو اندر بلایا۔ اُس کا انٹرویو کیا اور تب مجھے یہ تین ماہ کی انٹری ملی تھی۔ یوں انگلینڈ نے بڑے ''اوکھے'' طریقے سے مجھے انٹری دی تھی، مگر بات آخری کامیابی کی ہوتی ہے جو ہم نے حاصل کی تھی۔ اس لیے ہم دونوں خوش تھے۔ کافی دیر ہمیں لندن سے نکلنے میں لگ گئی اور ہمارا موٹر وے پر سفر شروع ہو گیا۔ ہمیں ''بلیک برن'' جانا تھا جو کہ مانچسٹر کے پاس ایک چھوٹا سا شہر یا ایک بڑا قصبہ ہے۔ میرا موٹر وے پر سفر کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

موٹروے پر تھوڑی دیر سفر کے بعد بھائی نے گاڑی سروسز (Services) کی طرف موڑ لی۔ وہاں ہم نے گاڑی کی ٹینکی پٹرول سے فل کروائی، فریش ہوئے۔ ڈرنک، کافی اور کچھ کھانے کی چیزیں لیں اور دوبارہ موٹروے پر چڑھ گئے۔ سروسز کا نظام پورے یورپ میں موٹر وے پر 30-40 میل کے بعد موجود ہے۔ یہ ایک قسم کا منی (Mini) شاپنگ سینٹر ہوتا ہے جہاں سے آپ پٹرول بھروا سکتے ہیں۔ گاڑی کی سروس کروا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی اشیاء خرید سکتے ہیں۔ اکثر جگہ پر ریستوران نما سٹنگ کا انتظام بھی ہوتا ہے جہاں آپ ریسٹ کرنے کے ساتھ ساتھ تیار کھانا بھی کھا سکتے ہیں۔ موٹروے پر چڑھنے کے بعد ہمیں گپ شپ لگاتے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ بھائی پھر فون پر مصروف ہو گیا اور میں اردگرد کے ماحول کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ پچھلے دو ہفتوں میں انگلینڈ کے متعلق پڑھا ہوا لٹریچر دماغ میں دہرانے لگا۔

☞ ☞ ☞

کچھ برطانیہ کے بارے میں

دنیا کے نقشے پر پاکستان کو ٹریس کر کے اُس کے مغرب کی طرف بڑھتے جائیں تو گلوب کے ایک چھوٹے سے حصے پر شمالی بحیرہِ اوقیانوس (North Atlantic Ocean) کے کنارے پر ایک پتلی کمر والی پٹی ہے جس پر یو کے لکھا ہے۔ یو کے (United Kingdom)، گریٹ بریٹن (Great Britan)، انگلینڈ (England)، برطانیہ، انگلستان اور زیادہ تر لوگوں کے لیے صرف لندن (London)، یہ کوئی بہت سے ملکوں کے نام نہیں، ایک ہی ملک کے مختلف نام ہیں جو کہ سننے میں آیا ہے کہ کبھی اتنا بڑا ہوتا تھا کہ اس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، یعنی کہ اگر یہاں پر رات ہو بھی جاتی تھی تو اس کے کسی نہ کسی مقبوضہ علاقہ میں سورج طلوع رہتا تھا۔ اب تو اِس کا صرف نام ہی بڑا رہ گیا ہے۔

برطانیہ، انگلینڈ (England)، سکاٹ لینڈ (Scot Land) ویلز (Wales) اور شمالی آئر لینڈ (Northern Ireland) پر مشتمل ہے۔ ایک جزیرہ Isle of Man جو کہ انگلینڈ اور آئیر لینڈ کے درمیان ہے اور چینل آئی لینڈز (Chanel Islands) بھی برطانیہ کا حصہ ہیں۔ چینل آئی لینڈز میں Alderney, Jersey, Guernsey اور Sark نامی چار جزیرے ہیں۔

برطانیہ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے پاکستان کے مقابلے میں ایک بونا ملک ہے۔

پاکستان کی نہ صرف آبادی بلکہ رقبہ بھی برطانیہ سے تین گنا زیادہ ہے۔ برطانیہ کا کُل رقبہ **244820 Sq/Km** ہے جس میں سے **3230Sq/Km** پانی ہے اور **241590 Sq/Km** خشکی، جبکہ **7/2006** میں اس کی ریکارڈڈ **(Recorded)** آبادی **60441457** تھی۔ اسکے مقابلے میں پاکستان کا رقبہ **803940 Sq/Km** ہے اور آبادی **169333500** **(2010)** ہے۔

دولت، طاقت، اثر و نفوذ اور دوسرے تمام دنیاوی امور کا جائزہ لیا جائے تو اپنے رقبے اور آبادی کی فراوانی کے باوجود پاکستان برطانیہ کے سامنے کسی بونے سے بھی کم تر ہے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آج کی دنیا سرمایہ داری نظام کی ہے اور اس میں مارکسزم اور لینن ازم صرف چند سینوں میں خواہشات کی صورت میں موجود ہے۔ جس کے پنپنے کا فی الحال دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ جن جاگتی قوموں نے اپنے اسلاف کے علمی، ادبی اور معاشرتی سرمایہ کو سنبھال کر رکھا بلکہ بدلتے وقت کے ساتھ اُسے ڈھالا اور ترقی دی، وہی عروج پر رہیں، باقی یا مِٹ گئیں یا ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو گئیں۔

پچھلی ایک صدی میں برطانیہ آدھی دنیا کی حکمرانی سے دستبردار کر دیا گیا اور ایک چھوٹے سے خطے تک محدود ہو کر رہ گیا، مگر کسی فوجی حکمران نے ملکہ کو گھسیٹ کر محل سے باہر نہیں نکالا بلکہ تمام قوم یک جہت ہو کر مسلسل کام کرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس محنت کے ثمرات اُن کی آئندہ نسلوں کے بھی کام آتے رہے اور آرہے ہیں۔ برطانیہ آج بھی دنیا کے پانچ طاقتور ترین ملکوں میں سے ایک ہے اور دنیا کی سب سے زیادہ فلاحی مملکت ہے۔

برطانیہ کی مشہور کہاوت ہے: ''کسی چیز کا بدل تلاش کیے بغیر اُس کو پھینک دینا حماقت ہے''۔ قدرت کی طرف سے انگلینڈ کے اس چھوٹے سے جزیرے کو معدنی وسائل بھی بہت محدود میسر ہیں۔ سو انگریزوں نے مقبوضہ جات سے دستبرداری سے پہلے اِس کا بدل تلاش کر لیا تھا اور وہ

تھا اُن کا ''کام''۔ انگلینڈ میں انڈسٹری انتہائی ترقی یافتہ ہے۔ تمام دنیا سے خام مال اَونے پَونے داموں خرید کیا جاتا ہے اور اُن کی انڈسٹری میں اُس پر ''کام'' کر کے اُسے انتہائی مہنگے داموں بیرونِ مُلک فروخت کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جہاں سے خام مال منگوایا جاتا ہے اکثر اُنہی ملکوں کو یہ تیار شدہ حالت میں سینکڑوں گُنا قیمت پر واپس بیچ دیا جاتا ہے۔

برطانیہ کا مذہبی لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو اس میں سب سے زیادہ یعنی 76% کیتھولک عیسائی بستے ہیں۔ دوسرے نمبر پر لامذہب ہیں جن کی تعداد 91 لاکھ ہے۔ تیسرے نمبر پر مسلمان ہیں جن کی آبادی 15 لاکھ ہے۔ اسی طرح ہندو 5½ لاکھ، سکھ 3½ لاکھ، یہودی 2 لاکھ 70 ہزار اور بدھ 1½ لاکھ ہیں۔ بہت سارے مذاہب کا مرکب ہونے کے باوجود یہ ایک پُرسکون معاشرہ ہے جہاں ہر ایک کو چند حدود و قیود میں رہتے ہوئے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کی مکمل آزادی ہے۔ یہ سب لوگ یونین جیک (Union Jack) نامی برطانوی جھنڈے کے نیچے خود کو محفوظ و مامون محسوس کرتے ہیں اور برطانیہ کی ترقی کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔

لندن برطانیہ کا دارالخلافہ ہے۔ یہ شہروں کی رینکنگ میں ایک میگا سٹی (Mega City) ہے۔ یہ شہر دنیا بھر کے وزٹرز کے لیے ایک خواب ناک منزل ہے، اس لیے یہ شہر دنیا بھر میں وزٹ کیے جانے والی جگہوں میں چند اول نمبر کی جگہوں میں شامل ہے۔ ہیتھرو ائرپورٹ (Heathro Airport) دنیا کے مصروف ترین ائرپورٹس میں سے ایک ہے جہاں 24 گھنٹے کے ہر ایک منٹ میں یا تو کوئی فلائیٹ اُتر رہی ہوتی ہے یا چڑھ رہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ لندن کے چار ائرپورٹ گیٹوِک (Gatwick)، سٹانسٹڈ (Stansted)، لیوٹن (Luton) اور سٹی (City) ائرپورٹ بھی بین الاقوامی فلائیٹس کے لیے موجود ہیں۔ اس لیے فضائی جائزہ لیا جائے تو طیارے لندن کی فضا میں پرندوں کی طرح اُڑتے نظر آتے ہیں۔

انگریز مزاجاً زیادہ تر کُھردرے، سرد مزاج، بے مہر اور مغرور ہوتے ہیں۔ اُن کا بس چلے

تو مسکرانا ممنوع قرار دے کر اس پر سزا رکھ دیں۔ انگلینڈ میں انگریزی اگرچہ مشترک زبان ہے، مگر کسی سیانے کے بقول انگلینڈ میں مشترکہ زبان کے باوجود ایک ترجمان کی ضرورت رہتی ہے۔ یہاں پاکستان کی طرح مختلف صوبوں یا علاقوں میں لوگ اپنے علاقے کی بولی بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ جیسے پاکستان میں پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو بولی جاتی ہیں ویسے ہی وہاں انگریزی، سکاٹش جسے Gaelic بھی کہتے ہیں، ویلش اور آئرش بولی جاتی ہیں۔ اُن علاقوں میں جہاں یہ زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں انگلش میں بھی اُن کی اپنی زبان کے الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ کے زیادہ تر لوگ انگریزی کے مشکل الفاظ کو سمجھنے کا ادراک نہیں رکھتے۔

برطانیہ دراصل دو جزیروں پر مشتمل ملک کا نام ہے۔ بڑا جزیرہ برطانیہ ہے یعنی انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور ویلز (Wales)' اس کے علاوہ آئرلینڈ ہے جس کا شمالی حصہ انگلینڈ کے قبضہ میں اور جنوبی حصہ آزاد آئرلینڈ ہے۔ سولہویں صدی کے آغاز میں انگلینڈ کے بادشاہ ہنری ہشتم کے دور میں جو کہ بنیادی طور پر ویلز کا بہت بڑا جاگیردار تھا ویلز انگلینڈ کا حصہ بنا، ورنہ اس کی اپنی علیحدہ تاریخ وثقافت ہے۔

برطانیہ تقریباً 6 کروڑ افراد کا ملک ہے۔ جس میں آبادی کے لحاظ سے اسکاٹش پہلے نمبر پر ہیں، دوسرے پر انگریز اور تیسرے نمبر پر ویلش ہیں۔ انگلینڈ کو اگر شمالاً جنوباً دیکھیں تو جون اوگرزوٹس سے ڈوور (Dover) کی بندرگاہ تک 550 میل لمبائی بنتی ہے۔ اسی طرح اگر ڈوور سے کورنوال تک جائیں تو فاصلہ صرف 320 میل بنتا ہے۔ اسی سے آپ اس کے رقبہ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ برطانیہ کا کوئی بھی مقام سمندر سے 75 میل سے زیادہ دوری پر نہیں ہے۔ موسم مکمل طور پر بے اعتبارا ہے۔ بلکہ موسم کیا، لوگ یہاں کے تین ڈبلیوز (Three "w"s) کی بے اعتباری کے متعلق بات کرتے ہیں یعنی کام (Work)، عورت (Women) اور موسم (Weather) اور

ان تینوں کو ہی بے اعتبارا کرداتے ہیں۔ابھی آپ کام پر پہنچتے ہیں، باس آیا اور آپ سے کہتا ہے

”یو آر فائرڈ“ (You are fired)

اسی طرح ملکہ کے زیرسایہ کوئی پتہ نہیں کہ آپ گھر تشریف لے جائیں اور بیوی آپ کو آپ کی خدمات سے Fire کردے۔رہ گیا موسم؟۔چمکتی دھوپ میں باہر جایئے اور ٹھنڈ لگوا کر، بھیگ کر واپس آیئے، لیکن دھوپ دوبارہ چمک رہی ہوگی۔

برطانیہ (انگلستان+ویلز) کا مجموعی رقبہ امریکہ کی ریاست جارجیا کے تقریباً برابر ہے اور امریکی ریاست کیلی فورنیا کے تقریباً نصف کے برابر ہے۔دارالحکومت لندن ہے جہاں بارش کا اوسط تقریباً 25 انچ ہے، البتہ انگلینڈ کے مغربی حصہ میں یہ اوسط تقریباً 60 انچ تک ہے۔اس سب کے باوجود انگلینڈ کے زیادہ تر حصہ میں موسم معتدل رہتا ہے۔جو اس کی وجہ نہیں جانتے وہ حیران رہتے ہیں۔اس کی وجہ دراصل ”گلف سٹریم“ (Gulf Stream) ہے۔یہ قدرتی طور پر گرم پانی کا ایک دریا ہے جو انگلینڈ کے سمندر میں شمال سے مشرق کی طرف بہتا ہے۔لوگ سرد یا معتدل موسم کے عادی ہیں۔درجہ حرارت 70 درجہ فارن ہائیٹ ہو تو گرمی کی لہر محسوس کیجاتی ہے اور اس سے تھوڑا اوپر چلا جائے تو ہم جیسے سیاحوں کی موج ہو جاتی ہے۔سڑکوں پر بھی بکنی اور انڈر ویئر میں حسن کے شاہکار نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔عام دنوں میں بھی ساحلی علاقوں پر رش ہوتا ہے اور اگر چھٹی کا دن ہو تو کیا کہنے۔چار چار گرہ کی اوپر نیچے لٹکتی بھیگی ہوئی دھجیوں سے جو نظر آ رہا ہوتا ہے وہاں اندازے کو زحمت دینے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔بوس و کنار اور چھیاں شھیاں تو ٹرینوں میں بھی نظر آ جاتی ہیں جو کہ میرے جیسے نو آموز سیاحوں کے لیے باعثِ دلچسپی ہی نہیں باعثِ حسرت بھی ہوتی ہیں، مگر دھوپ میں ساحلوں پر تو ان چھیوں کا نظارہ ہی اور ہوتا ہے۔کسی کو پرواہ نہیں ہوتی کہ اس جوش و خروش اور دھینگا مُشتی میں لوگوں کو کیا کیا نظر آ رہا ہے۔تھوڑا آگے چلے جائیں تو رنگ برنگی چھتریوں کی ایک بہار ہوتی ہے جن کے نیچے چادر بچھا کر زیادہ تر حسینانِ

برطانیہ اوندھی لیٹی محوِ استراحت ہوتی ہیں۔ ان کے جسم کا زیادہ حصہ دھوپ میں ہوتا ہے کیونکہ مقصد سفید رنگ کو گولڈن کرنا ہوتا ہے اس لیے کئی ایک کے جسم پر تو کپڑے کی دھجی بھی نہیں ہوتی۔ اوپری جسم کی پشت ننگی ہوتی ہے اور اوندھے لیٹنے سے سب مال و متال نیچے والے کپڑے سمیت ریت میں دھنسا ہوتا ہے۔ ہاں کولھوں پر کوئی چھوٹا موٹا تولیہ وغیرہ رکھا ہوتا ہے۔ یوں تماشائے اہل کرم سے بہت سوں کا بھلا ہوتا ہے۔ بیئر عام طور پر بہت پی جاتی ہے، مگر اس موسم اور ایسے مقام پر تو یہ پانی کے طور پر استعمال ہوتی ہے جو گورے رنگ کو اور لال بھبوکا کر دیتی ہے۔ فرنچ فرائز اور فش ساحلوں پر مرغوب غذا ہوتی ہے۔

سمندر کا جو حصہ انگلینڈ کو یورپ سے جدا کرتا ہے اُسے رود بارِ انگلستان کہتے ہیں اور یہ ایک جگہ سے تو صرف 21 میل چوڑی سمندری پٹی رہ جاتی ہے۔ انگلینڈ اس لحاظ سے ایک گنجان ملک ہے کہ جہاں امریکہ میں رقبہ کے لحاظ سے اوسطاً ایک میل کے ایریا میں صرف 50 افراد رہتے ہیں وہاں انگلینڈ میں ایک میل میں 1000 افراد رہائش پذیر ہیں۔ انگلینڈ اور خصوصاً لندن قدیم اور جدید کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ انگریز اگرچہ قدامت پرست ہیں اور وہاں پر پہلی صدی عیسوی کی عمارات بھی نظر آتی ہیں مثلاً لندن کا سینٹ پال گرجا گھر، مگر 1940ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران لندن پر مسلسل 58 دن جرمن طیاروں کی بمباری کی صورت میں قہر برستا رہا جس میں لندن کی بہت زیادہ تباہی ہوئی۔ تباہ ہونے والی عمارتوں کے کھنڈرات پر تعمیر شدہ نئی عمارتیں جدید ترین انداز لیے ہوئے ہیں، لیکن مجموعی طور پر لندن میں قدامت کا رنگ جھلکتا ہے۔ بارش زیادہ ہونے کی وجہ سے عمارات کی چھتیں ڈھلوان بنائی جاتی ہیں تاکہ چھتوں پر پانی نہ ٹھہرے۔

اگر یورپ کی تیزی اور جدّت دیکھنا ہو تو وہ انگلینڈ میں صرف لندن میں نظر آتی ہے۔ لندن میں زیرِ زمین ریلوے موجود ہے جو تقریباً 70-80 میل میں پھیلے اس شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تقریباً 1½ گھنٹے میں پہنچا دیتی ہے۔ انگلینڈ میں بھی مختلف علاقوں کے

رہنے والے لوگ دوسرے علاقوں سے مسابقت بلکہ سیدھے لفظوں میں بیکسی محسوس کرتے ہیں۔ خاص طور پر دارالحکومت لندن کی ترقی سے بہت سے علاقوں کے لوگ نالاں ہیں کہ اُن کے علاقوں پر لندن کی نسبت بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ مثلاً گلاسکو (سکاٹ لینڈ) کے لوگوں کو شکوہ کناں ہی پایا۔ آئرلینڈ والے تو باقاعدہ آزادی کی تحریک اور انڈر گراؤنڈ آئرش آرمی رکھتے ہیں جو انگلینڈ میں کبھی کبھی بم دھماکوں کی صورت میں اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ کچھ اسی طرح کے تاثرات ویلز میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بھی کارڈف (ویلز کا دارالحکومت) پر وہ توجہ نہیں دی جاتی۔ لطیفوں اور عام بول چال میں بھی ایک دوسرے کی تضحیک کا موقعہ ضائع نہیں کیا جاتا۔ مثلاً سکاٹش (Scotish) لوگوں کی کنجوسی کو ضرب المثل بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے لوگ انگریزوں کو مکار یعنی (Cunning) کہہ کر دل کا ابال نکالتے ہیں۔ جیسے پاکستان میں لوگ پاکستانی کہلانے سے پہلے سندھی، پنجابی، پٹھان یا بلوچی کہلانا پسند کرتے ہیں ویسے ہی وہاں نسلی پہچان کے لیے خود کو انگلش (English)، سکاٹش (Scotish)، آئرش (Irish) اور ویلش (Walish) وغیرہ کہلوانا پسند کیا جاتا ہے۔ شہروں کے درمیان بھی ہمارے لاہور اور کراچی کی طرح مسابقت کی فضا موجود ہے۔ انگلینڈ کا دوسرا بڑا شہر مانچسٹر ہے جو کہ انڈسٹری کی وجہ سے معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ مانچسٹر کے کرتا دھرتا بڑے طنزیہ انداز میں کہتے ہیں: ''آج مانچسٹر کے ذہن میں جو بات ہے وہ باقی انگلستان کی سمجھ میں کل آئے گی''۔ اُن کا یہ دعویٰ اپنی جگہ بجا ہے کہ صنعتوں میں نت نئے تجربات سے ملکی ترقی میں اُن کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ قانون کا احترام جتنا انگلینڈ میں کیا جاتا ہے شاید ہی کہیں کسی اور ملک میں ہو۔ کئی لوگوں کے لیے یہ بات باعثِ حیرانی ہوگی کہ انگلینڈ کا کوئی تحریری دستور یا آئین نہیں ہے۔ وہاں تو صدیوں سے رائج روایات کو بھی قانون کی طرح احترام دیا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران سر ونسٹن چرچل کے کہے ہوئے الفاظ انگلینڈ میں قانون پر یقین کی بہترین مثال ہیں۔ انگلینڈ دوسری جنگ عظیم

میں جرمن طیاروں کی بمباری سے تباہ ہو رہا تھا، ڈنکرک سے 335000 فوج 50 میل لمبے سمندر کو جان پر کھیل کر عبور کر کے پسپا ہو رہی تھی۔ خوراک تو ایک طرف کپڑے تک پہ راشن بندی ہو چکی تھی تو چرچل سے کسی اخبار نویس نے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟ کیا انگلینڈ ختم ہو جائے گا؟ چرچل نے پوچھا ''کیا انگلینڈ کی عدالتوں میں انصاف نہیں ہو رہا؟'' اُس نے کہا ''ہو رہا ہے''۔ تو چرچل نے سادہ، مگر پر یقین لہجے میں کہا کہ ''جب تک انگلینڈ کی عدالتوں میں انصاف ہو رہا ہے انگلینڈ ختم نہیں ہو سکتا''۔

انگریز ایک اولوالعزم، بہادر اور ساتھ ساتھ مکار قوم بھی ہے۔ تاریخ میں شیر دل رچرڈ کا صلاح الدین ایوبی سے ٹکراؤ تو پرانی بات ہے، مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں ہندوستان جیسے وسیع ملک پر تھوڑی سی نفری سے قبضہ ان کی مکاری، بہادری اور عزم کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح جنگ عظیم اوّل کے دوران 1914ء میں جب کہ اس ملک کی آبادی صرف تین کروڑ 65 لاکھ تھی اس کے سات لاکھ پچاس ہزار شہری مارے گئے جس کی وجہ سے بیواؤں اور کنواریوں کی صورت میں فحاشی کا سیلاب اُمنڈ آیا، لیکن یہ قوم جنگ کی تباہ کاریوں کے باوجود ترقی کرتی رہی۔ کمزوری ابھی موجود تھی کہ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کا طبل بجا۔ اِسی کمزوری اور ان کے لیڈر چیمبر لین کی ہچکچاہٹ کی وجہ سے ہی انگلینڈ نے بہت دیر تک اس جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ دینے سے گریز کیا۔ بلآخر جب چیمبر لین نے جنگ میں شرکت کا اعلان کیا تو اُس وقت تک جرمن اس کے بہت سے اتحادیوں کو روند کر شتر بے مہار بن چکے تھے جس کا انگلینڈ کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس کے فوراً بعد 10 مئی 1940ء کو سر ونسٹن چرچل نے انگلینڈ کی قیادت سنبھالی جو کہ ایک پُر عزم لیڈر تھا۔

1939ء سے قبل انگلینڈ کی غذائی ضروریات کا 70 فیصد غیر ملکوں سے آتا تھا جو کہ جنگ کی وجہ سے سمندر میں جہاز رانی کے خطرات اور ناکہ بندی کے باعث آنا بند ہو گیا تو انگلینڈ میں راشن بندی کرنا پڑی۔ اُس وقت انگلینڈ کے کسانوں نے ایک معجزہ کر دکھایا اور جنگ اور شدید

بمباری کے باوجود 1939ء سے 1942ء تک (جب امریکہ جنگ میں شامل ہوا اور کھل کر اور بے تحاشا کپڑے، خوراک، اسلحہ وغیرہ سے انگلینڈ کی مدد کی) انگلینڈ کی زرعی ضروریات کو جیسے تیسے پورا کیا۔ اسی طرح اسلحہ کی صورت حال یہ تھی کہ امریکہ کی جنگ میں شرکت سے پہلے ساحلوں کی حفاظت پر مامور عملے کے پاس 6 میں سے ایک سپاہی کے پاس پرانی رائفل تھی۔ اگر اُس وقت جرمن کسی جانب سے انگلینڈ کے ساحل تک رسائی حاصل کر کے بھرپور حملہ کر دیتے تو شاید تاریخ کچھ اور ہوتی۔

عزم کی ایک اور مثال انگلینڈ کے مشرق میں جزیرہ نما FENS کا ٹاپو ہے۔ جہاں دلدل ہی دلدل تھیں اور وہاں کالے پانی کی سزا والے لوگوں کو بھیجا جاتا تھا۔ وہاں لوگوں نے مل جل کر ایک بڑے جاگیردار کے تعاون سے زمین خشک کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس کے لیے 70 فٹ چوڑی اور 21 میل لمبی نہر کھودی گئی اور دلدل کے پانی کا رُخ اُدھر موڑ کر خشک زمین حاصل کرنے کی کوشش شروع کی۔ 20 سال بعد ایک اور نہر اُس کے متوازی بنائی گئی اور یوں 80 میل لمبا اور 30 میل چوڑا ایک خشک زمین کا ٹاپو حاصل کر لیا گیا۔ اسی طرح جزیرہ نما ''الی'' پر بہت بڑے گرجا کی تعمیر ایک کارنامہ ہے۔

ایک طرف اگر یہ قوم طوفانی نظر آتی ہے تو دوسری طرف آپ اِن کو جب لندن میں بس کے انتظار میں خاموشی سے قطار میں کھڑا دیکھیں گے تو ان میں آپ کو ڈسپلن کی خود ساختہ پابندی نظر آئے گی۔ یہی حال ٹریفک کا ہے۔ ہارن کا استعمال بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ ٹریفک جام میں بھی ایسے اطمینان سے گاڑیوں میں بیٹھے ہوں گے جیسے یہی کام کرنے گھر سے نکلے ہیں۔ دراصل انہوں نے یہ راز پالیا ہے کہ افراتفری کام اور خراب کرتی ہے۔ اُنہیں یقین ہوتا ہے کہ متعلقہ ادارہ کام کر رہا ہوگا اور جلد از جلد اس مصیبت سے چھٹکارہ دلانے کی کوشش میں ہوگا۔ اِسی طرح شاپنگ سنٹرز حتیٰ کہ شراب خانوں تک میں ایک ڈسپلن نظر آتا ہے۔ انڈر گراؤنڈ ریلوے اور بازاروں میں بھاگ دوڑ ضرور نظر آتی ہے، مگر وہاں بھی دھکم پیل نہیں ہوتی۔

برطانیہ کے کوہستانی علاقے زیادہ تر سکاٹ لینڈ، کورنوال، ویلز اور کمبر لینڈ کے لیک ڈسٹرکٹ میں ہیں۔ خوراک کی پیداوار بہت کم اور صنعتی پیداوار بہت زیادہ ہے۔ گندم زیادہ تر امریکہ اور کینیڈا سے، گوشت ارجنٹائن اور آسٹریلیا سے، مکھن، انڈے اور ڈیری مصنوعات زیادہ تر ڈنمارک، ناروے اور ہالینڈ سے آتی ہیں۔ برطانیہ کی کچھ اپنی بھی پیداوار ہے، ڈیون شائر کی اسٹابری تو ہمارے ملتان کے 'ڈوکے' کی طرح مشہور ہے۔

برطانیہ کو اگر پھولوں کا مُلک کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں تقریباً پچاس قسم کے پھول پائے جاتے ہیں۔ جن میں پرم روز کو سب سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ یہ 5 پنکھڑیوں پر مُشتمل پیلے رنگ کا پھول ہوتا ہے جو بھینی بھینی خوشبو دیتا ہے۔ دوسرے نمبر پر کاؤزلپ ہے جسے ہم گاؤزبان کہہ سکتے ہیں۔ یہ بھی زرد رنگ کا پھول ہے جو کہ لمبے ڈنٹھلوں پر گھنٹی نما ہوتا ہے۔ اِسی طرح بلوبیل ہے جو جنگلوں کو گل وگلزار بنا دیتا ہے۔ انگلینڈ میں کھیتوں کے اردگرد خاردار تاروں کی بجائے پھول دار جھاڑیوں اور پودوں کی باڑ لگائی جاتی ہے۔ اُن کی کاشت پر اور بعد میں اُن کی کاٹ چھانٹ وغیرہ کرنے میں خاردار باڑ سے زیادہ لاگت آتی ہے، مگر یہ خوبصورتی کے دیوانے اِس کی پرواہ نہیں کرتے۔

برطانیہ میں ککو موسم بہار کا پرندہ ہے جس کے مدھ بھرے گیتوں کی گونج اُن کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ اسی طرح گرمیوں میں سکائی لارک ہے جو کہ اگرچہ آسمان میں کافی اونچا اُڑتا ہے اور نظر نہیں آتا، مگر اُس کی خوش آوازی دلوں کو لبھاتی ہے۔ سرشور اور بلبل بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ وڈز ورتھ جیسے محبت کے شاعر کی سرزمین ہے۔ کیٹس کا تعلق بھی یہیں سے تھا، شیکسپیئر بھی اسی مٹی سے اُٹھا اور جیفرے چوسر (1340ء) جو کہ انگلش شاعری کا امام مانا جاتا ہے وہ بھی اِسی دھرتی کا باسی تھا جس کے چاروں طرف سمندر ہے اور کسی دوسرے ملک تک پہنچنے کے لیے خشکی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

سنا ہے لندن کی بنیاد پہلی صدی عیسوی میں رومنوں نے رکھی، جب وہ یہاں قابض تھے۔ انھوں نے ساحل تک اور دور دراز علاقوں تک سڑکیں بچھائیں کہ رابطہ رہے۔ انھوں نے مشتری، مریخ اور منروا دیوی دیوتاؤں کے مندر بنائے جنھیں عیسائیت کی ترویج کے بعد گرجا گھروں میں بدل دیا گیا۔ لندن کا مذکورہ سینٹ پال کا گرجا گھر اس کی ایک مثال ہے۔ انگلینڈ کے بہت سے گرجا گھر صدیوں پرانے ہیں اور قدامت نظر بھی آتی ہے۔ گرجوں اور کلیساؤں میں سیاہ پتھروں کا استعمال وافر ہے جو کہ قدامت کو اور اُجاگر کرتا ہے۔

برطانیہ کی پارلیمنٹ کی تاریخ بھی صدیوں پرانی ہے۔ اِس لیے اِسے دنیا میں پارلیمان کی ماں کہا جاتا ہے۔ بارہویں صدی تک انگلینڈ میں مکمل شہنشاہت تھی۔ کافی لمبی تحریک کے بعد 15 جون 1215ء میں اُس وقت کے کنگ جون نے ایک معاہدہ کے تحت تھوڑی سی شخصی آزادی دی، مگر یہ صرف جاگیرداروں کی حد تک تھی۔ 50 سال بعد 1265ء میں ''سائمن دی مونٹ فورٹ'' نامی آدمی نے پارلیمنٹ کا مطالبہ اُٹھایا، مگر اُس وقت کے بادشاہ ہنری سوم نے اُسے قتل کروا دیا۔ مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں اگلے بادشاہ ایڈورڈ اوّل نے پالیمانی نظام شروع کر دیا، مگر اُس میں بھی ووٹ کا حق صرف جاگیرداروں یا زمین داروں کو تھا۔ انیسویں صدی کے شروع تک یہ خودساختہ پارلیمان کی ماں لولے لنگڑے طریقے سے چلتی رہی جس میں صرف جائیداد والے مرد حضرات کو ووٹ کا حق حاصل تھا۔ 1918ء تک جمہوریت کے اس چمپئن ملک میں جو اِس وقت عورتوں کے حقوق کا علمبردار ہے، عورتوں کو ووٹ کا حق ہی حاصل نہیں تھا۔ 1832ء میں ایک اصلاحی بل آیا جس میں جائیداد والے مرد حضرات کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کو ووٹ کا حق ملا، مگر جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے 1918ء تک عورتیں ووٹ کے حق سے محروم رہیں۔

اِسی طرح چائلڈ لیبر کے سلسلہ میں برطانیہ آج تیسری دنیا کے ممالک پر طعن و تشنیع کرتا ہے، مگر وہاں پر اب بھی چائلڈ لیبر موجود ہے۔ سکولوں کے بچے چھٹیوں میں مختلف سٹوروں اور

دوسری جگہوں پر انتہائی واجبی رقم کے عوض کام کرتے نظر آتے ہیں۔ 1871ء تک تو مِلوں کی چمنیاں صاف کرنے کا کام صرف کم عمر لڑکوں سے لیا جاتا تھا، کیونکہ وہ پھرتیلے اور پتلے ہوتے تھے۔ اِسی طرح اس ملک میں 1833ء تک باقاعدہ غلامی موجود تھی اور 1833ء میں بھی انسانی حقوق کے لوگوں کی طویل جدوجہد کے بعد جب غلامی پر پابندی کا مرحلہ آیا تو حکومتِ وقت کو بڑے جاگیرداروں کو اُن کے غلاموں کی قیمت 2 کروڑ پونڈ کی خطیر رقم کی صورت میں چکانی پڑی۔

غالباً 16 ویں صدی کے آغاز میں انگلینڈ نے یورپ سے علیحدگی اختیار کی یا دوسرے لفظوں میں آزادی حاصل کی۔ اسی صدی میں بادشاہ ہنری ہشتم آیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ ویلش زمیندار تھا اور اسی لیے ویلز انگلینڈ کا حصہ بنا۔ ہنری ہشتم کے دور میں بھوک ننگ بہت زیادہ تھی اور چوری عام۔ سو اُس نے معاشرتی اصلاح کے لیے ہاتھ کاٹنا تو ایک طرف 7200 چوروں کو سرِعام پھانسی پر لٹکا دیا۔ اِسی طرح سولہویں صدی میں جب ملکہ الزبتھ اوّل (1558ء تا 1603ء) برسرِ اقتدار آئی تو اُس نے آئرلینڈ میں ظلم کا وہ بازار گرم کیا جس کی بوئی ہوئی فصل آج بھی انگلینڈ کاٹ رہا ہے۔

برطانیہ نے اپنے مقبوضہ جات کو کسی نہ کسی طرح یاد رکھا ہے۔ ایک طرف اگر کوہِ نور ہندوستان کی یادگار ہے تو دوسری طرف جارج واشنگٹن کا مجسمہ ٹرافیلگر سکوائر میں نصب ہے، ابراہیم لنکن کا مجسمہ بھی پارلیمنٹ کی عمارتوں کے قریب موجود ہے۔ یہ دونوں حضرات امریکہ کے صدور تھے۔

انگلینڈ میں اب پارلیمانی نظام رائج ہے، ملکہ ایک علامتی حکمران ہے جو اِس قوم کی روایت پسندی کی ایک اور دلیل ہے۔ ملکہ اور شاہی خاندان کو بے تحاشا فنڈ اور سہولیات عوامی ٹیکسوں سے مہیا کی جاتی ہیں اور کوئی نہیں بولتا، بلکہ اُن کا اب بھی یہی نعرہ ہے: ''خدا ملکہ کی حفاظت کرے'' اور ملکہ بکنگھم پیلس میں استراحت فرما ہے۔ انگریز ایک روایت پسند قوم ہے اور ملکہ کا وجود بھی اُن میں ایک روایت کی طرح زندہ ہے۔

ایک گورے سے دلچسپ مکالمہ

لندن ایئرپورٹ سے بلیک برن میں گھر پہنچ کر بھائی صرف چند منٹ ٹھہرے اور مجھے کہا:

"آپ اتنی لمبی مسافت سے تھک گئے ہوں گے اس لیے اپنی بھابھی سے گپ شپ لگائیں، مجھے اپنے دفتر جانا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے بہت سے فون آ رہے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ آفس چلے گئے۔

میری بھابھی ہماری فرسٹ کزن ہے۔ میرے سگے چچا اُس کے والد ہیں اور سگی خالہ والدہ۔ رشتہ تو بہت قریبی ہے، مگر چونکہ وہ بچپن سے انگلینڈ میں پلی بڑھی تھی اس لیے اُس کے ساتھ کوئی خاص بے تکلفی نہ تھی۔ اُن کے دو بچے ابھی چھوٹے تھے اور میرا چھوٹا بھائی ضیاء الرؤف خان سکول گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بھابھی سے گپ شپ کے بعد میں نے باہر نکلنے کا قصد کیا تو بھابھی پریشان ہوگئی کہ میں ابھی انگلینڈ میں بالکل نیا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ میں انگلینڈ میں نیا ضرور ہوں، مگر میرے پاس نئے علاقوں میں آوارہ گردی کا خاصہ تجربہ ہے۔ میں پاکستان میں جنت نظیر مقامات کو کافی "گچھ" چکا ہوں۔ اُس کی فکرمندی پھر بھی قائم رہی لیکن میں اُس سے سٹریٹ کا نام اور گھر کا نمبر پوچھ کر باہر نکل گیا۔

نزدیک ہی چھوٹی سی مارکیٹ تھی۔ ایسے ہی ونڈو شاپنگ **(Window Shopping)** کرتے ہوئے ایک ویڈیو سنٹر کے آگے رک کے دکان کے شیشوں سے چپکے نئی فلموں کے پوسٹر دیکھ

رہا تھا کہ اندر سے تقریباً ساٹھ سالہ صحت مند بوڑھے نے دروازہ میں آکر ''ہیلو'' کہا۔ میرے جواب کے بعد بولا:

اس علاقے میں نئے لگتے ہو۔ "Looks new in this area"

ہاں ایسا ہی ہے۔ "Yes, its true"

''ویسے ہو کہاں سے؟''

میں نے جب پاکستان بتایا تو عجیب سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آ گئی اور کہنے لگا:

''فارغ ہو تو آ ؤ اندر چل کے بات کرتے ہیں''۔

میں اُس کے ساتھ دکان میں داخل ہو گیا۔ ایسا ہی وڈیو سنٹر تھا جیسے پاکستان میں ہوتے تھے۔ ریکوں میں سجی کیسٹوں کو سرسری دیکھا تو ایک سائڈ انڈین فلموں کی تھی اور دوسری انگلش کی۔ ایک چھوٹی سائڈ جو کاؤنٹر کے پاس تھی ڈبل ایکس XX الیکٹرک بلو فلموں کی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ٹرپل ایکس یا ہارڈ کور فلموں کی کیسٹوں کو سر عام رکھنا ممنوع ہے۔ بوڑھا چھوٹے سے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھ چکا تھا اور میں اُس کی نظریں اپنے اوپر مرکوز محسوس کر رہا تھا۔ آخر وہ بول پڑا:

''جنٹلمین! اگر محسوس نہ کرو تو ذرا گپ شپ ہو جائے''۔

میں بھی محسوس کر چکا تھا کہ بوڑھے کے دماغ میں ''کھرک'' ہو رہی ہے، مگر میں انگریزی پر عبور نہ رکھنے کی وجہ سے جھجک رہا تھا کہ کہیں رسوائی نہ ہو جائے۔ بعد میں میں نے اکثر گوروں کو دیکھا ہے کہ اگر آپ اُن سے مخاطب یا اُن کی طرف متوجہ نہ ہوں تو وہ گھنٹوں آپ کے ساتھ سفر یا سٹنگ (Sitting) کے باوجود بات نہیں کرتے اور اخبار یا کوئی کتاب نکال لیتے ہیں، مگر یہ ستم ظریف بوڑھا یا تو باتونی تھا یا پھر اُس نے کسی وجہ سے مجھے ٹارگٹ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ بولا:

''کیا اب بھی تمہارے ہاں چینی، گھی اور آٹے کی راشن بندی جاری ہے''۔

تو اُس کے لہجے میں طنز کا شائبہ تک نہ تھا مگر میں سمجھ گیا کہ میرے پلّے یہ خالص "Cunning" برٹش پڑ گیا ہے۔ میں نے کہا:

''اب تو راشن بندی نہیں ہے، لیکن کیا پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں تمہاری ماں نے پھٹے کپڑوں سے تمہارے لیے نئے کپڑے نہیں بنائے تھے؟ کیا جنگوں میں تمہارے ہاں خوراک کی راشن بندی نہیں ہوئی تھی؟ کیا تمہارا باپ اور اُس کے احباب مل کر ایک سگریٹ نہیں پیتے تھے؟

''مگر یہ تو جنگ کی باتیں ہیں۔ اب تو مدت ہوئی ہم اس حالت سے نکل کر بہترین ترقی کر رہے ہیں''۔

''ہم تو مسلسل حالتِ جنگ میں ہیں۔ اس کے باوجود راشن بندی نہیں ہے اور ہم بھی آگے بڑھ رہے ہیں''۔

''امریکہ کی مدد کے بغیر تو تمہارا ملک شائد چند ماہ بھی نہ چلے''۔ وہ طنزیہ بولا۔

''اُسی طرح جیسے 1942ء میں امریکہ خوراک اور اسلحے کے بھرے جہاز روانہ نہ کرتا تو تم شاید جنگ میں گھُٹنے ٹیک دیتے، کیونکہ تمہارے پاس 6 سپاہیوں میں سے صرف ایک کے پاس ایک ناکارہ رائفل تھی اور راشن بندی کے باوجود سارے ملک میں 2 ہفتے کی خوراک رہ گئی تھی۔ بابا! جنگوں میں ایسا تو ہوتا ہے اور میں کہہ چکا ہوں کہ ہم تو اب بھی حالت جنگ میں ہیں''۔

''کیا 90 ہزار شکست خوردہ فوجی اب بھی تمہاری فوج میں ہیں؟''۔ ''تم لوگوں نے اُن کا کیا کیا؟''۔ اُس نے پھر ''چونڈی'' بھری۔

''وہی جو 1940ء میں تم نے اپنی 335000 فوج کا کیا جو ڈنکرک سے 50 میل کے سمندر کی دوری برداشت نہ کر سکی اور واپس بھاگی تھی۔ ہماری فوج نے تو اُس طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جس سے ٹکرانے سے تمہارا پِتّا پانی ہوتا تھا۔ شکر کرو تمہیں چرچل مل گیا تھا۔ چیمبر لین رہتا تو تم ایسے بڑھ چڑھ کر باتیں نہ کر رہے ہوتے۔ ہماری بدقسمتی کہ ہمیں اُس ابتلاء کے دور میں مناسب لیڈر نہ مل سکا۔ مگر یہ تو قدرت کے فیصلے ہیں''۔

’’کیا تمہارے ہاں اب بھی نئی بچوں کی آنکھیں نیلی ہوتی ہیں؟‘‘

جب اُس نے یہ کہا تو کچھ لمحے تو میں اُس کا سوال سمجھ ہی نہ سکا۔ جب سمجھ میں آیا تو یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنے طنزیہ سوالوں کے تُرنت جوابوں سے بھنا کر اب گھٹیا پن پر اُتر آیا ہے۔ اوپر سے وہ بالکل پرسکون نظر آ رہا تھا، لیکن لگتا تھا اندر کہیں بھرپور گڑبڑ ہے۔ مجھے محتاط ہو جانا چاہیے تھا کہ میں اُن کے ملک میں کھڑا تھا اور یہ میرا پہلا دن تھا۔ مگر اُس کا سوال سمجھ کر میرا فیوز اُڑ گیا اور یہ فیوز جب بھی اُڑتا تھا مجھے نتائج و عواقب سے بیگانہ کر دیتا تھا۔ میں نے کہا

’’میں کسی انگریز کے متعلق ایسا گمان نہیں کرتا تھا جیسے تم ثابت ہو رہے ہو۔ پہلی جنگِ عظیم میں کسی مشنری شوق میں تمہاری اماں امریکنوں کے ساتھ تو نہیں رہی؟ کیونکہ دوسری جنگِ عظیم کے وقت تو تم کافی بڑے ہو گے۔ کبھی غور کیا کہ تمہاری تم سے بعد والی اور موجودہ نسل میں اب بے تحاشا جارحیت امریکنوں کی طرح کیوں ہے۔ کیا یہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران انگلینڈ آنے والے لاکھوں امریکنوں کا تحفہ تو نہیں؟‘‘۔

مجھے لگا کہ اُس نے دل ہی دل میں مجھے بھاری گالی دی ہو۔ مگر کندھے اُچکا کر منہ سے بولا:

’’چھوڑو! لگتا ہے اس میں تمہاری دل آزاری ہوئی ہے۔ آؤ فلموں کی بات کرتے ہیں۔ کیا تمہارے شہروں اور گاؤں میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں ایسے ہی ناچتی پھرتی ہیں اور درجنوں دوسری لڑکیاں تالیاں بجاتی ہیں۔ میں نے تو اپنے قیام انڈیا میں ایسا نہیں دیکھا‘‘۔

’’لیکن تمہارے پاس پاکستانی تو کوئی فلم نہیں ہے۔ مجھے تو انڈین ہی نظر آ رہی ہیں‘‘۔

’’ایک ہی بات ہے‘‘۔

’’گو ایک بات نہیں ہے، مگر پھر بھی ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمہاری گھریلو قسم کی انگلش فلموں میں بھی کسنگ (Kissing) اور کم از کم سنگل ایکس سین (Single X Scene) کیوں ہوتے ہیں؟‘‘

’’یہ تو ہمارے معاشرے کے حقائق ہیں‘‘۔

''اور یہ ڈبل ایکس اور ٹرپل ایکس فلمیں؟''

''یہ تو کمرشل ازم ہے۔لوگوں کو اُن کی پسند بیچنا''۔

''وہ بھی کمرشل ازم ہے۔حقائق سے دور۔لیکن ہم کمرشل ازم میں بھی اس گھٹیا معیار تک نہیں گئے''۔(اس وقت تک آج کی طرح دیسی ننگی فلمیں اور مکالمے نہ تھے)

وہ ابھی کچھ اور کہنے والا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی ضیاء مجھے ڈھونڈتا ہوا پہنچ گیا۔جپھی ڈال کے ملا اور آتے ہی کہنے لگا:

''بھابھی بہت پریشان ہے کہ دو گھنٹے ہو گئے آپ کو گھر سے نکلے ہوئے۔آپ اس علاقہ میں نئے ہیں کہیں بھٹک نہ گئے ہوں۔میں اسکول سے آیا تو مجھے فوراً تلاش میں دوڑا دیا''۔

وہ گورا کچھ کچھ ہماری زبان سمجھتا تھا اور کچھ ہمارے رویہ سے اندازہ لگایا۔چھوٹے بھائی کو وہ ویسے بھی جانتا تھا چونکہ وہ وہاں سے فلمیں کرایہ پر لیتا تھا۔سو بولا:

''خان بوائے،یہ تمہارے کون ہیں؟''۔

''یہ میرے بڑے بھائی ہیں''۔

''اچھا،اچھا،لیکن پہلے کبھی نہیں دیکھا۔کیا لندن میں رہتے ہیں؟''۔

''یہ تو پاکستان سے سیدھے آ رہے ہیں،چند گھنٹے پہلے''۔

''اچھا تو ہالیڈیز(holidays) پر تھے؟''۔

جب میں نے اُسے بتایا کہ میں انگلینڈ ہی پہلی دفعہ آیا ہوں اور انگلینڈ تو کیا کسی بھی بیرونی ملک کا یہ میرا پہلا سفر ہے تو میں نے اُس کے برف جیسے اور بے تاثر چہرے کو پہلی بار ری ایکشن(Reaction) دیتے دیکھا۔اُس کا منہ کُھلا ہوا تھا۔

''سٹرینج(Strange)''۔اُس کے منہ سے نکلا۔

بھائی نے کہا۔''انکل کیا بات ہے؟''۔

''خان بولا:۔ تمہارے بھائی سے میں نے پہلی بار دھوکہ کھایا ہے۔ یہ اتنے اعتماد سے گھوم رہا تھا کہ مجھے نیا نہیں لگا۔ پھر بات کی تو گو اس کی انگریزی ٹھیک نہیں ہے، مگر یہ تو اکثر ایشین (Asian) کی ایسے ہی ہوتی ہے۔ مگر......''۔

ہم چلنے لگے تو جلدی سے بولا۔

''مسٹر ایک منٹ، آج کا ایک آخری سوال۔ سوشل سیکورٹی کے لیے کب اپلائی کر رہے ہو؟''۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

یہ ایک اور بھرپور طنز تھا کہ ہمارے اکثر لوگ چوری چھپے کام کرتے تھے اور گورنمنٹ سے سوشل سیکورٹی فنڈ سے بھی پیسے وصول کرتے تھے۔ پھر تقریباً دو سال میں ایک ذریعہ آمدن کے پیسے بچا کر پاکستان کا ٹور لگاتے اور وہاں اپنے آپ کو انگلینڈ کا رئیس شو کرتے۔ (اب بھی ایسا ہی ہے)۔ میں نے مسکرا کر کہا:

''کیا آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے؟''۔

تو وہ پہلی بار ہنس دیا اور بولا: ''او کے، او کے، نیکسٹ ٹائم (Next Time)

''اور میں بھائی کے ساتھ Ash Street پر واقع گھر آ گیا۔

بعد میں اُس بوڑھے سے کئی ملاقاتیں رہیں تو پتہ چلا کہ اُس نے برصغیر کی تقسیم سے پہلے بالکل معمولی فوجی عہدے پر ہندوستان میں دو سال نوکری کی تھی اور اب بھی اپنے آپ کو ایشین امور میں ماہر تصور کرتا ہے۔ ایک دن کہنے لگا:

''تم دن میں پانچ بار کاروبار چھوڑ کر مسجدوں کی طرف بھاگتے ہو اور وقت ضائع کرتے ہو۔ یہ ہڈ حرامی کا بہانہ نہیں ہے؟''۔

''اپنے ہی ادیب ای ایم فاسٹر کی A passage to India پڑھ لینا۔ جس

کے پہلے حصے کا عنوان "مسجد" ہے۔ تمہیں میرے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی"۔

''میرے گھر میں ہے۔ میری بیوی کے اکثر مطالعہ میں رہتی ہے۔ وہ اخبارات میں لکھتی ہے اور اسلام میں عورتوں کو دیئے گئے حقوق کی زبردست مداح ہے''۔

''اچھا، کبھی ملاؤ ناں اُس سے''۔

''نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے اُسے تمہاری باتیں بتائی تھیں، وہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ تمہیں شام کو چائے پر بلاؤں''۔ وہ جلدی سے بولا۔

''تو کیا وہ آپ کی ہم عمر نہیں ہے''۔

''ہے۔ صرف 5 سال چھوٹی ہے''۔

''تو کیا آپ کی بیٹی جوان ہے؟''۔

''وہ بھی ہے۔ تقریباً 15 سال کی ہے اور سارے ماں جیسے خیالات رکھتی ہے۔ تمہیں بتاؤں۔ میں اُنہیں کے کہنے پر اس علاقے میں رہائش پذیر ہوں اور یہ چھوٹا سا کام کر رہا ہوں، لیکن ماں یا بیٹی کی عمر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ ملاقاتوں کے بعد مجھے شک ہے کہ تم ہمارے گھر کے فرد کی طرح ہو جاؤ گے، لیکن تم بہت زہریلے ہو۔ میرا سکون برباد ہو جائے گا۔ میری بیوی اکثر کہتی ہے کہ مسٹر جناح بالکل اکیلے تھے، جبکہ گاندھی کے پاس اپنے جیسے ذہنی سطح (Calibre) کے لوگوں کی پوری ٹیم تھی۔ اس کے باوجود جناح کامیاب رہے، مگر ہم نے اُن کے ساتھ زیادتی کی اور ایک عظیم انسانی سانحہ ہوا جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں اس میں ہمارا بھی ہاتھ ہے، لیکن میں اُس سے اتفاق نہیں کرتا۔ وہ بہت پڑھتی ہے۔ اس لیے اُس کا دماغ پریشان ہو گیا ہے''۔

''یہ تو تاریخ ہے''۔ میں نے کہا

ایسے مکالمے اُس کے ساتھ کافی دن جاری رہے۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ چڑ کے

لگا تا اور میں۔ جس کی جھجک اب کافی حد تک دور ہوگئی تھی، ٹرنت جواب دیتا۔ بعد میں بھائی نے اپنا گھر ایلش سٹریٹ سے شفٹ کرلیا اور ہم ایک بڑے بنگلہ نما مکان میں شفٹ ہو گئے اور میں بھی روزگار کے سلسلہ میں صبح وشام کے چکر میں آ گیا۔ ایک دفعہ رابطہ منقطع ہوا تو پھر واپسی سے دو دن پہلے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا:

''تمہارا طنز کام کر گیا۔ میں نے آج تک سوشل سیکورٹی کے لیے اپلائی نہیں کیا۔ اب پرسوں میری واپسی کی فلائٹ ہے''۔

تھوڑا حیران ہوا، مگر پھر فوراً کہنے لگا:

''تم پھر آ ؤ گے اور اب کے آئے تو میں تمہیں اپنی بیگم اور بیٹی سے ملاؤں گا''۔

''کیوں، اب کیا فرق پڑ گیا ہے؟''

''تمہارا انگلینڈ چھوڑ کر جانا بتاتا ہے کہ تم اُن سے مختلف ہو جو کہ ایک دفعہ آ کر یہاں سے جانے کا نام نہیں لیتے چاہے سوشل سیکورٹی کی بھیک پر گزارہ کرنا پڑے۔ مجھے دیکھو اس عمر میں بھی یہ چھوٹی سی دُکان کر رہا ہوں لیکن سوشل سیکورٹی کلیم نہیں کرتا''۔

اُس دن اُس نے پہلی دفعہ سامنے والی کافی شاپ سے کافی لا کر مجھے پلائی اور ہاتھ ہلا کر رخصت کیا۔

☞ ☞ ☞

برطانیہ میں بوڑھے

میں جونہی سٹاپ پر پہنچا تو اپنی مطلوبہ بس کو تھوڑا آگے جاتے دیکھا۔ دوسری بس آدھے گھنٹے بعد آنا تھی۔ مجھے بلیک برن سے بولٹن جاب (Job) پر جانا تھا، ابھی ابھی میری بھابھی نے مجھے بس سٹاپ پر ڈراپ کیا تھا۔ میں چہل قدمی کے انداز میں شیڈ تک پہنچا تو ایک بزرگ خاتون کہیں سے نکل کر شیڈ تک پہنچ چکی تھی۔ جیسا کہ میں پڑھ چکا تھا کہ انگریز ذرا خود پسند ہوتے ہیں۔ بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ میرا بھی اب تک کا تجربہ یہی تھا، لیکن انگریز خواتین کے متعلق میرا تجربہ ذرا مختلف تھا۔ میں اکثر دورانِ سفر موقعہ ملتے ہی کسی انگریز خاتون کو چھیڑ لیتا اور پھر گھنٹا بھر کے بولٹن تک کے سفر کے دوران اُن کے تیز تیز انگریزی بولنے کے انداز، باتوں کے دوران اشاروں، ہاتھوں کی اور جسم کی حرکت اور لال بھبھوکا چہرے کے تاثرات سے لطف اندوز ہوتا۔ اس طرح میری انگریزی بولنے کی جھجک دور ہوتی، میرے انگریزی کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا، اُن کے لہجے کو سمجھنے میں مدد ملتی اور کچھ اردگرد کے حالات اور ماحول سے واقفیت ہوتی۔ موضوع کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی خبر، کوئی واقعہ، اُن کے یا میرے ملک کی باتیں، موسم، وغیرہ وغیرہ۔ وہ مجھے اپنے بوائے فرینڈز، سہیلیوں اور باس وغیرہ کے متعلق باتیں سناتیں۔ یوں مجھ سے بہت کم سوال کیے جاتے، کیونکہ انگریز کسی کی ذاتی زندگی میں دخل دینا خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں اس لیے اگر وہ آپ کی ذات سے متعلق سوال کریں گے بھی تو گھما پھرا کر۔

بس سٹاپ پر 5-7 منٹ خاموش کھڑے رہنے سے میں اُکتا گیا تو بوڑھی خاتون کی حرکات وسکنات پر توجہ دینا شروع کی۔ پہلے اُس نے پرس میں لگے آئینہ میں اپنی لپ اسٹک چیک کی اور فوراً پرس سے لپ سٹک نکال کر ہونٹوں پر ہلکے ہلکے چسپاں کی۔ پھر ایک اور لوشن نما چیز نکال کر ہونٹوں پر لگائی تو وہ اور چمکنے لگے۔ پھر اُس نے پرس سے کوئی چیز برآمد کی اور انتہائی احتیاط سے ہولے ہولے ناخنوں کے کنارے رگڑنے لگی۔ بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا اور ایسے ہی بات کرنے کے لیے میں نے پوچھا:

''میڈم کیا میں سگریٹ سلگا سکتا ہوں؟''

"Madam! Can I lit a cigrate"

''ایں......؟'' اُس نے تجاہلِ عارفانہ سے میری طرف یوں سوالیہ انداز میں دیکھا، جیسے میری موجودگی سے بے خبر ہو۔ میں نے سوال دہرایا تو بولی:

''شیور، شیور (Sure, Sure)''

اور ایک دم جیسے اُس کے رویہ میں اپنائیت سی آ گئی۔ دراصل میرا یہ اجازت لینا بھی میرے اُسی مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ انگلینڈ میں روایتی طور پر آپ کسی خاتون کے پاس ہوں تو سگریٹ پینے سے پہلے رسمی اجازت لیتے ہیں، حالانکہ میں نے ایسا ہوتے یہاں کہیں نہیں دیکھا تھا بلکہ فیکٹری میں جہاں مَیں کام کرتا تھا کئی ایک خواتین ورکر بھی ہر گھنٹے بعد سموک اینڈ کافی کارنر میں جا کر دھڑلے سے سگریٹ نوش فرماتی تھیں۔ بہرحال اُس خاتون کے ساتھ تو میرا یہ انداز صرف برائے تکلّم تھا۔

''لڑکے! کہاں سے تعلق رکھتے ہو؟''

''پاکستان سے معزز خاتون'' میں نے بتانے کے ساتھ ساتھ مسکا لگایا۔

''تبھی، تبھی، یقیناً یہ روایات اب پُر اِسرار مشرق میں ہی زندہ ہوں گی۔ میرا پوتا تو کبھی

بھی آ جائے تو دھڑلے سے میرے سامنے سگریٹ پیتا ہے۔

''پوتا؟ آپ کا پوتا جوان ہے؟ میں یقین نہیں کرسکتا۔آپ کی عمر اتنی زیادہ تو نہیں لگتی''۔

میں نے مصنوعی حیرانی سے ایک اور مسکا لگایا، حالانکہ وہ اپنی کھچی ہوئی جلد، میک اپ اور سلم باڈی (Slim Body) کے باوجود مجھے 60 کے قریب ہی لگی تھی''۔

وہ کھلکھلا پڑی اور پوچھا:

''تمہارے خیال میں میری عمر کیا ہوگی؟''

''اباؤٹ 45 اور 50 کے درمیان کچھ بھی''۔

''اوہ نہیں لڑکے میں 52 کی ہوں ،ایسے ہی کم لگتی ہوں ،میرا پہلا بیٹا سترہ سال کی عمر میں ہوا تھا۔میرا پوتا پندرہ سال کا ہے''۔

وہ خوش ہو کے بتانے لگی۔

''یقین نہیں آ تا،تم تو مجھے بہت گریس فل (Graceful) لگی ہو''۔

''اوہ لڑکے،تم مختصر جملے کیوں بولتے ہو،کھل کر بات کرو ناں''۔اُس نے شہہ دی۔

''دراصل مجھے روانی سے انگریزی نہیں آتی ،نو وارد ہوں ناں''۔میں نے اعتراف کیا۔

''ایں......؟ کب آئے برطانیہ؟''

''مہینہ بھر پہلے''

''اچھا؟ بہت بدل گیا ہے۔بہت کچھ بدل گیا ہے''۔ وہ جیسے خود کلامی سے بولی۔

''کیا بدل گیا ہے میڈم؟''میں نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔اب سٹاپ پر کچھ اور خواتین وحضرات بھی آ گئے تھے اور،ہم بھی گفتگو کرتے ہوئے ایک کونے میں ہو گئے تھے۔بس کے آنے میں چند منٹ رہ گئے تھے اس لیے میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر نیا سگریٹ سلگا لیا تھا۔

''اوہ بوائے...... پہلے جب ایشیائی آتے تھے ناں تو کئی مہینے وہ خواتین سے بات

کرنے میں جھجکتے تھے۔ تمہیں بتاؤں میرا پہلا بوائے فرینڈ ایک انڈین مسلمان تھا اور یہ جو میں نے پوتے کا ذکر کیا ہے ناں یہ اُسی سے ہونے والے بیٹے کا بیٹا ہے۔ میرا بیٹا اور پوتا دونوں مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مہینے میں کم از کم ایک بار ضرور ملنے آتے ہیں"۔

"تو آپ اُن کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟"

"اوہ یس یس، یہ سوال تمہیں ہی زیب دیتا ہے، آئی مین **(I mean)** مشرقی لوگوں کو، کیا تمہارے ہاں اب بھی بوڑھے لوگ ہی گھر کے سربراہ ہوتے ہیں؟۔ سارے فیصلے، حتیٰ کہ جوان بچوں کی شادی بیاہ کے فیصلے اب بھی وہی لوگ کرتے ہیں؟ کیا اب بھی بیٹے بیٹیاں حتیٰ کہ بہویں بھی اُن کی خدمت کرتی ہیں اور کوئی بھی اُن سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ کیا اب بھی اُن کی صحت خراب ہو تو سارے گھر میں بھگدڑ مچ جاتی ہے؟"

"ہاں میڈم"۔ "اُن کے فیصلوں کو اس قدر احترام دیا جاتا ہے کہ نوجوان لڑکیاں لڑکے اپنا عشق بھول جاتے ہیں۔ کس بچے نے مستقبل میں کیا بننا ہے اس کا فیصلہ بھی والدین ہی کرتے ہیں"۔

میں مزید کچھ بتانا چاہتا تھا کہ اتنے میں ہماری بس آ گئی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بس کی طرف چلنے لگی۔

"تمہیں کہاں جانا ہے لڑکے......؟"

"بولٹن"

"مجھے ڈارون تک جانا ہے۔ مگر خیر، آؤ"

بس میں بیٹھنے کے بعد باتوں کا سلسلہ دوبارہ چل پڑا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا بوائے فرینڈ بہت شرمیلا تھا، جب اُس کی (میڈم کی) عمر پورے **16** سال ہوئی تو میڈم نے اُس کے ساتھ شادی کر لی۔ پھر ایک سال بعد ہی اُن کا بیٹا ہو گیا۔ اُس کا خاوند یہاں ٹمپریری ویزے پر

تھا۔ بعد میں انہوں نے مستقل ویزے کے لیے درخواست دے دی۔ گو کہ میڈم کے والدین نے اُسے ہلکا پھلکا سمجھانے کی کوشش کی مگر اِسے وہ شرمیلا جوان بھا گیا تھا۔ فون اُن دنوں بہت مہنگا تھا اور اُس کے خاوند کے گاؤں میں کسی زمیندار کے گھر یہ سہولت تھی جہاں اُس کا خاندان مہینے میں ایک بار جا کر ہمارا فون سنتا۔ میرے خاوند نے مجھ سے شادی کی تو ان سے باقاعدہ اجازت لی تھی جو کہ اُس کے دادا نے دی تھی۔ زیادہ تر رابطہ خطوط کے ذریعے ہوتا تھا۔ ایک دفعہ اُس کا دادا بیمار ہو گیا تو اُس کا خاوند رات بھر روتا رہا۔ اُن دنوں اُس کی ہفتہ بھر کی تنخواہ ٹیلیفون پر خرچ ہو گئی تھی۔ مشرقی طور طریقوں اور روایات کے متعلق اُس کے خاوند نے ہی اُسے بتایا تھا جو اُس کے ساتھ پانچ سال تک رہا۔ پانچ سال بعد جب وہ انڈیا گیا تو پھر کئی مہینے واپس نہ آیا۔ اُس وقت تک اُس کا برٹش پاسپورٹ بن چکا تھا۔ اُس کے یہاں موجود عزیزوں نے بتایا کہ اُس کو انڈیا میں اپنی بچپن کی منگیتر سے شادی کرنا پڑ گئی ہے جو کہ اُس کے چچا کی بیٹی ہے اور یہ اُس کے دادا کا حکم تھا۔

جب وہ چھ ماہ بعد واپس آیا تو اُس نے اس بات کی تصدیق کی اور کہا کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے اور وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ وہ حقیقتاً میرے ساتھ مخلص تھا، مگر میں نے اُس سے علیحدگی اختیار کر لی اور بچہ بھی اُس کے پاس ہی رہنے دیا۔ اُس نے بہت منت سماجت کی، مگر میں نہ مانی اور طلاق لے کر رہی۔ دراصل میں چاہتی تھی کہ اگر اُس نے شادی کر لی ہے تو وہ دوسری بیوی کو پورے حقوق دے اور یہاں لے کر آئے جو کہ میری موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ کچھ عرصہ وہ پریشان رہا، مگر بعد میں اپنی بیوی کو لے آیا۔ وہ بالکل سادہ سی عورت تھی، لیکن اُس نے میرے بیٹے کو بہت اچھے طریقے سے پالا۔ اُسی کی تربیت کی وجہ سے میرا بیٹا اب بھی مجھ سے پیار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ میرا پوتا اور میرے خاوند کے دوسرے بچے بھی مجھے ملنے آتے ہیں۔ وہ اب گھر کی سربراہ ہے۔

اُس نے مزید بتایا کہ خاوند سے علیحدگی کے دو سال بعد اُس نے دوسری شادی کر لی تھی جو کہ ایک گورے سے تھی، مگر جلد ہی اُن میں اختلافات شروع ہو گئے، کیونکہ وہ خود آدھے سے زیادہ مشرقی ہو چکی تھی اور اُسے اپنے نئے خاوند کی فحش حرکات، بے تحاشا ڈرنک اور فلرٹ کی عادتیں پسند نہ تھیں۔ یہ اُس کا اپنا مشرقی پن ہی تھا کہ یہ شادی چار سال چلی اور دو بچے یعنی ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئے، لیکن اس طلاق کی قیمت اُس کے خاوند کو ایک گھر، کافی رقم اور بچوں کے جوان ہونے تک مستقل خرچہ کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔ بعد میں اُس کے تعلقات اپنے سابقہ خاوند کی فیملی سے اپنے پہلے بیٹے کی وجہ سے بحال ہو گئے۔ جواب بھی جاری ہیں۔ اُس کا دوسرے خاوند سے بیٹا اور بیٹی جوان ہو کر علیحدہ ہو چکے ہیں۔ دونوں شادی کر چکے ہیں۔ کبھی کبھی ہی رابطہ ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ رابطہ مدر ڈے اور کرسمس پر ہوتا ہے۔ اب وہ اپنے ذاتی فلیٹ میں اپنے ڈاگی کے ساتھ رہتی ہے۔ بینک میں معقول رقم بھی ہے اور گورنمنٹ بھی خرچہ دیتی ہے۔

سو یہ ہے میری اولاد کا احوال۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرا بڑا بیٹا مجھے ساتھ رکھنے کے لیے کہہ چکا ہے۔ اُس کی بیوی بھی مشرقی ہے، مگر میں اب تنہا رہنے کی عادی ہو چکی ہوں اور یہ ہمارا مزاج بھی نہیں ہے۔ آج بھی وہ اپنے اُسی بیٹے کی بیٹی کی سالگرہ میں شرکت کر کے واپس آ رہی تھی جو کل رات کو تھی، لیکن صبح صبح وہ اپنے ڈوگی کی وجہ سے پریشان ہو گئی اور نکل کھڑی ہوئی کہ وہ کل سے اکیلا پریشان ہو رہا ہو گا۔

''لڑکے، تم لوگ بہت اچھے ہو۔ تم میں روایات اب بھی زندہ ہیں۔ تم نے جب سگریٹ پینے کی اجازت مانگی تو مجھے بہت کچھ یاد دلا دیا۔ ہمارا یہ معاشرہ ٹھیک نہیں ہے۔ میرے سابقہ خاوند اور بیٹے کی طرح تم بھی اُن روایات کو زندہ رکھنا، یہاں آ کر بھول نہ جانا''۔

بس ڈارون کے بس سٹاپ میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ ایکدم چونک پڑی:

''لو میرا اسٹاپ آ گیا اور پتا بھی نہیں چلا، اوہ بوائے، تم لوگ جادوگر ہوتے ہو''۔

اُس نے میرا گال چوما اور نیچے پہنچ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی بس سٹاپ سے باہر کو چل دی۔ بس میں اردگرد کے لوگ جو کسمسا رہے تھے، مسکرا دیئے۔

اُس کے بس سے اترنے کے بعد میں نے بوسہ زدہ گال کو ملا تو مجھے ہاتھ پر لالی سی محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے رومال نکال کر رخسار کو صاف کیا تو اُس کے ساتھ خاصی سرخی لگی تھی۔ اب مجھے اردگرد کے لوگوں کے مسکرانے کی وجہ سمجھ میں آ گئی، لیکن مجھے بتایا کسی نے بھی نہیں۔ یہ بھی اُن لوگوں کی ذاتیات میں دخل نہ دینے کی یا لاتعلقی کی ایک مثال تھی۔ میرا ابھی تقریباً 20 منٹ کا سفر باقی تھا۔ میں رنگارنگ اور بھانت بھانت کے لوگوں سے بنے معاشرے کے متعلق سوچنے لگا۔

بھائی کا گھر پہاڑی ٹائپ آبادی میں تھا۔ چھٹی کے دن میں وہاں سے پیدل اترتا تو ایک سموتھ (Smooth) قطعہ آتا، جس پر ایک بڑی سی بلڈنگ کھڑی تھی۔ اُس کے آگے ایک وسیع لان تھا۔ عمارت کے گرد چھوٹے قد کی دیوار تھی جس کی وجہ سے سڑک سے عمارت کے سامنے والے تمام کمرے نظر آتے تھے۔ اُن میں دن کے وقت بھی لائیٹیں روشن ہوتیں اور سفید براک بستر نظر آ رہے ہوتے۔ لان میں رنگارنگ پھول اور پودے بہار دکھا رہے ہوتے۔ کئی جگہ سفید شرٹ اور منی سکرٹ (Mini skirt) میں ملبوس نرسیں آ جا رہی ہوتیں۔ کبھی یہ نرسیں بوڑھے لوگوں کو سہارا دے کر یا وہیل چیئر پر لان میں ٹہلاتی نظر آتیں اور کئی ایک کمروں میں اُن کی کنگھی کرتی یا دوسرے کام کرتی نظر آتیں۔ اکثر لوگ کمروں کی کھڑکیوں میں کرسیوں پر بیٹھے باہر سڑک کی جانب نگران نظر آتے، لیکن ایک بات سب میں مشترک تھی کہ وہ سب ماسوائے نرسوں کے انتہائی ضعیف لوگ ہوتے۔ اُن کی آنکھوں میں ایک حسرت و یاس دور سے بھی پڑھی جا سکتی تھی۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا کہ کسی کمرہ میں مجھے نرسوں کے علاوہ کچھ چہل پہل نظر آتی۔ اُس وقت اُس کمرہ کے مکین کے چہرے پر تاثرات بھی کچھ مختلف ہوتے۔

میں ہر چھٹی کے دن لازمی اُس بلڈنگ کے آگے سے سڑک پر گزر کر اپنے چچا کے گھر جاتا تھا۔ بالآخر ایک دن میں نے چچا سے پوچھا:

’’کیا وہ بلڈنگ کوئی ہسپتال ہے کیونکہ اُس پر مجھے کوئی بورڈ وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ اِس لیے اندازہ نہیں ہو پا رہا‘‘۔

تب چچا نے بتایا:

’’وہ بلڈنگ اولڈ پیپلز ہاؤس (Old Peoples House) ہے۔ نام اس لیے نظر نہیں آ رہا کہ جدھر سے میں گزرتا ہوں وہ اُس بلڈنگ کا سائیڈ ویو (Side view) ہے۔ اس بلڈنگ میں اُن لوگوں کو رکھا جاتا ہے۔ جو کسی کام کے قابل نہیں رہتے اور اُن کی اولاد بھی انہیں اپنے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ یہ ایک چیرٹی ارینجمنٹ (Charity Arrangement) ہوتی ہے جس میں گورنمنٹ کے علاوہ خدا ترس کھاتے پیتے لوگ بھی رقم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھاتی پیتی اولادیں بھی اپنے والدین کو یہاں داخل کروا کر کچھ خرچہ دیتی ہیں۔ اس ادارے کا باقاعدہ بورڈ ہوتا ہے جو ہر چیز کی نگرانی کرتا ہے۔ دن اور رات ہر وقت ایک ڈاکٹر موجود ہوتا ہے۔ رات کے وقت بھی نرسیں نگرانی کے لیے موجود ہوتی ہیں۔ وہاں پر زیادہ چہل پہل صرف کرسمس پر یا پھر تھوڑی بہت مدرڈے اور فادرڈے پر نظر آتی ہے۔ کرسمس پر تو عام لوگ جن کا ان بوڑھوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بھی انہیں تحفے وغیرہ دیتے ہیں‘‘۔

’’کیا سبھی اولڈ پیپلز ہاؤس ایسے ہی ہوتے ہیں؟ آرام دہ اور پُرسکون‘‘

’’نہیں، یہ تو اُن لوگوں کے لیے ہے جن کی اولاد بھی کچھ خرچہ برداشت کرتی ہے یا پھر خود اُن کے پاس کچھ رقم تو ہوتی ہے، مگر وہ ڈرتے ہیں کہ اکیلے میں انہیں کچھ ہوگیا تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ وہ آ کر یہاں داخل ہو جاتے ہیں۔ ویسے کئی اولڈ پیپلز ہاؤسز جو صرف چیرٹی پر چلتے ہیں، کی حالت کافی خراب ہے۔ ایسے صاف ستھرے کمرے بھی نہیں ہوتے، ایک کمرے میں کم از کم دو بیڈ ہوتے ہیں۔ رات کو ڈاکٹر بھی نہیں ہوتے۔ تفریح وغیرہ کا انتظام بھی نہیں ہوتا۔ یہاں تو باقاعدہ اندر چیس روم (Chess Room) ہے اور کارڈ وغیرہ بھی کھیلے جاتے ہیں‘‘۔

یہ لوگ اپنے بزرگوں کو ساتھ کیوں نہیں رکھتے؟''

''یار! اس طرح ان کی پرائیویسی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بوڑھے لوگ زیادہ تر پرانے خیالات کے ہوتے ہیں۔ روک تو سکتے نہیں، مگر طنز کرتے رہتے ہیں۔ جس سے گھر کی فضا مکدر رہتی ہے''۔ چچا بوڑھوں کی مخالفت میں عام قسم کی چارج شیٹ پیش کر رہے تھے، مگر میں مطمئن نہیں تھا۔ وہ جھنجھلا کر بولے۔

''یار! دیکھو تو سہی کہ ان لوگوں نے اپنے بوڑھوں کو کتنی سہولیات اور آرام کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ انہیں ہمارے بوڑھوں کی طرح کمائی کی بالکل فکر نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح بہوؤں اور بیٹوں کا محتاج نہیں ہونا پڑتا۔ یہاں کوئی ہمارے ہاں کی طرح جائیداد کے لیے بوڑھوں پر تشدد نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی انہیں اپنے مکان سے دھکے دے کر نکال سکتا ہے۔ ان کے قبرستان بھی دیکھو تو پھولوں کا کوئی باغ نظر آتے ہیں، جبکہ ہمارے ہاں قبرستان نشے بازوں اور جواریوں کا گڑھ ہیں''۔

چچا کی کچھ باتیں بجا سہی، مگر وہ ایسی تمام مثالیں چُن چُن کر دے رہے تھے جن میں ہمارے معاشرے کی صرف برائی تھی جو کہ بہت ہی محدود پیمانے پر ہے ورنہ اکثریت ایسے گھرانوں کی ہے جہاں بوڑھے مکمل اختیارات کے ساتھ قابل احترام و عزت ہیں۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا جو کہ اس بزرگ خاتون سے باتیں کر کے در آئی تھیں کہ میرا سٹاپ یعنی بولٹن آ گیا۔ سٹاپ سے تقریباً 15 منٹ کی واک پر فیکٹری تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو ایک بس چھوٹ جانے کی وجہ سے ظاہر ہے لیٹ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی فیکٹری مالک نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا، مگر پھر چپ ہو گیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''سمجھ گیا''۔

''کیا سمجھ گیا؟'' میں نے پوچھا تو وہ ہنس پڑا اور اُسی گلابی لہجے میں بولا:

''تیرا صبح بولتا ہے تیرا شام کا کہانی''

مجھے ایک دم کچھ خیال آیا تو میں باتھ روم کی طرف گیا۔ قریبی ورکر لڑکیاں بھی مسکرا رہی تھیں۔ باتھ روم میں دیکھا تو اپنے گال پر سرخی کو میں نے رومال سے بکھیر دیا تھا اور وہ اور لال ہو رہا تھا، صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی نے چوما ہے۔ خیر میں نے منہ دھویا اور واپس آ کر اِس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی، لیکن لگتا تھا کسی نے بھی یقین نہیں کیا کہ یہ ایک بوڑھی عورت کی شفقت کا نشان ہے۔

☞ ☞ ☞

خان اِن ٹربل(Khan in Trouble)

مسٹرخان! یوآران ٹربل(Mr. Khan! You are in Trouble)

اپنی ٹیبل پر لکھے ہوئے یہ الفاظ دیکھ کر میں تھوڑا سا حیران ہوا، مگر جب اردگرد کا جائزہ لیا تو فیکٹری کے مالک کی 12-11 سالہ بیٹی آفس کے دروازے پر کھڑی ہنس رہی تھی اور اُس کے پیچھے سے اُس کی 16 سالہ بہن کی کالی آنکھیں میری حیرانی پر مسکرار ہیں تھیں۔ وہ نٹ کھٹ بچی روز کوئی نہ کوئی شرارت میرے ساتھ کئی دنوں سے کر رہی تھی اور اُس کی بڑی بہن زیادہ تر مسکراتی رہتی۔ یہ دونوں بہنیں پچھلے دو ہفتے سے مسلسل آ رہیں تھیں اور لگتا تھا کہ اُن کا کام میرے ساتھ گپ شپ یا ہنسی مذاق کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ دونوں کو گجراتی آتی تھی جس میں مَیں پیدل تھا۔ اُردو وہ ایسی بولتی تھیں کہ بعض مرتبہ خود بھی اٹک جاتیں۔ پھر اگر اردو کا کوئی لفظ ذہن میں نہ آتا تو تیزی سے انگریزی بولنے لگتیں۔ اِسی طرح میری انگریزی اُنکے مقابلے میں واجبی سی تھی، لیکن ہم نے اردو (جسے وہ ہندی کہتی تھیں) اور انگلش ملا کر ملا جلا مکمل اظہار کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔

وہ گڑیا ہنستی ہوئی آگے آئی اور بولی

''میں نے یہ سب سچ لکھا ہے۔''

''بٹ آئی ایم ناٹ، نیور (But I am not,never) ''میں تو مصیبت میں نہیں ہوں''

”مجھے یقین ہے کہ تم ہو، تمہیں جلد پتا چل جائے گا“

“I am sure You are, You will find it soon”

اتنے میں اُس کی بڑی بہن نے اُسے پیچھے سے ہجوکا دیا۔ میں نے پوچھا

”بات کیا ہے“(What,s the matter)

وہ ہنستے ہوئے بولی کچھ نہیں یہ تو صرف مذاق تھا(Nothing, just joking)

میں نے زیادہ زور نہیں دیا کہ وہ ایسے ہی چٹکلے چھوڑنے کی عادی تھی۔

میں ان دنوں ایک ٹروزر اینڈ سکرٹ بنانے والی فیکٹری میں تقریباً مہینہ بھر سے کوالٹی چیکر کا کام کرر ہا تھا۔ ساتھ ساتھ میں Loops لگانے والی مشین کو بھی آپریٹ کرر ہا تھا۔ پہلے یہ کام مالک خود کرتا تھا، مگر 10 دن کی ٹریننگ کے بعد میں اس مشین کو جس سے سکرٹ اور پینٹ کو بیلٹ ڈالنے کے لیے لُپیاں لگائی جاتیں تھیں تیزی سے چلانا سیکھ گیا تھا۔ تب سے یہ کام میرے حوالے تھے۔ دونوں کاموں کی علیحدہ علیحدہ مزدوری مقرر تھی سو مجھے مناسب سیلری (SALARY) مل جاتی تھی۔ اس فیکٹری میں 20 لڑکیاں اور 8 لڑکے کام کرتے تھے یہ فیکٹری مانچسٹر کے پاس ایک چھوٹے شہر بولٹن میں واقع تھی، جبکہ میری رہائش چھوٹے بھائی کے ساتھ ایک اور شہر بلیک برن میں تھی۔ دونوں شہروں کے درمیان لوکل بس سروس کے ذریعے تقریباً ایک گھنٹا لگتا تھا۔ یہ بس راستے میں ایک چھوٹے شہر یا قصبہ ڈارون میں 5 منٹ کا سٹاپ کر کے بولٹن پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی تو بھائی کا اگر صبح کا وزٹ بولٹن کی طرف یا اُس کے قرب و جوار میں ہوتا تو وہ مجھے ڈراپ کر دیتا ورنہ وہ یا اُسکی بیگم مجھے بلیک برن کے بس سٹاپ پر ڈراپ کر دیتے اور میں بذریعہ بس تقریباً نو اور ساڑھے نو کے درمیان فیکٹری پہنچتا۔ یہ فیکٹری ایک انڈین گجراتی مسلمان کی تھی جو کہ اپنی فیکٹری کے لیے لون(Loan) کے سلسلہ میں بھائی کا احسان مند تھا۔ اِسی ریفرنس کی وجہ سے مجھ جیسے (Raw hand) آدمی کو وہاں کام مل گیا تھا۔ شروع میں مجھے

وہاں تیار شدہ مال کی پریسنگ (Pressing) کا کام دیا گیا۔ پتہ نہیں کیا وجہ بنی کہ استری کی وجہ سے کپڑوں سے اُٹھنے والے بخارات سے میری ناک سے خون آنا شروع ہو گیا جو کہ وہاں کے سرد موسم میں خاصا پریشان کُن تھا۔ سو بھائی کی سفارش سے مالک نے مجھے کوالٹی چیکنگ پر لگا دیا اور ساتھ ساتھ Loops کی مشین کی ٹریننگ بھی دینے لگا۔

اب میں یہی کام کر رہا تھا۔ 28 ورکرز صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک 8 گھنٹے میں کام کا ڈھیر لگا دیتے۔ سارا دن اُن کا کام چیک کرتا اور جہاں کہیں سلائی وغیرہ میں کمی بیشی ہوتی تو متعلقہ ورکر کے پاس واپس پہنچاتا اور درست کرواتا۔ ساتھ ساتھ جب بھی وقت ملتا میں اپنا دوسرا کام یعنی لوپ لگانے کا کام بھی کرتا۔ مالک یہ کام میرے حوالے کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ فیکٹری کے آفس میں بیٹھا پیپر ورک کرتا یا نمازیں پڑھتا، کیونکہ ورکرز زیادہ تھے اور میں اکیلا۔ مالک مجھے کافی بنا کر دیتا، تھوڑی دیر گپ شپ کرتا، لیکن میں مسلسل کام میں جُتا رہتا۔ چار بجے کے بعد یہ آفت کی پرکالہ گڑیا اور ساتھ میں اُسکی وہ اپنی عمر سے زیادہ سریس بہن آ جاتیں۔ اُن کے آنے کے کچھ دیر بعد مالک صاحب بھی تشریف لے جاتے۔ اب اتنی بڑی فیکٹری میں ہم تینوں کے سوا کوئی نہ ہوتا۔ دراصل رات کو میری واپسی عموماً بھائی کے ساتھ ہوتی تھی جو اپنی شام کی میٹنگز اپنے کلائنٹس کیساتھ بولٹن ایریا کی رکھتے اور واپسی پر مجھے ساتھ لے کر گھر جاتے۔ اس طرح مجھے چند گھنٹے اور کام کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ یہ رعایت (Favour) بھی مجھے بھائی کی وجہ ہی سے حاصل تھی یا کہ مالک کی اپنی کوئی ترجیح تھی، لیکن ایسا ہو رہا تھا۔ یہ آخری چند گھنٹے میرے ساتھ یہی دونوں بہنیں اکثر فیکٹری میں ہوتی تھیں، لیکن میں عموماً لوپس کی مشین پر مسلسل مصروف رہتا۔

میں ان دنوں تقریباً 28 برس کا تھا، مگر سخت کسا ہوا جسم، گہرے گھنگھریالے سیاہ بال اور آنکھوں میں سرخ ڈورے رہتے تھے جو کہ میری صبح کے وقت سر کے بل کھڑے ہونے کی ورزش کا نتیجہ تھا۔ اِنہی ڈوروں کو دیکھ کر شادی سے پہلے میری ساس نے کہا تھا "منڈا تے نشہ کردا اے"

جسم دُبلا تھا جس کی وجہ سے میرا "8-'5 کا قد بڑا نظر آتا تھا۔ اوراس جسامت کی وجہ سے عمر بھی کم نظر آتی تھی۔ پھر چونکہ میں شادی شدہ ہونے کے باوجود کاغذی طور پر کنوارہ تھا۔ اس لیے بہت سوں کے لیے باعثِ دلچسپی تھا اور شاید یہی دلچسپی فیکٹری مالک کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مجھ پر کام کا بوجھ ڈال کر اور ان چھوٹی بڑی پریوں کو میرے گرد گھما کر شاید میرے کام اور ظرف کا جائزہ لے رہا تھا۔ یا ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقعہ دے رہا تھا، کیونکہ لڑکی 16 برس کی عمر کو چھو چکی تھی۔ جو اُن دنوں انگلینڈ میں شادی کے لیے قانونی عمر تھی۔

میں نے وہاں اکثر یہی دیکھا کہ جونہی لڑکی 16 سال کی عمر کو چھونے لگتی والدین اپنے مُلک کی طرف بھاگتے تاکہ کوئی مناسب رشتہ مل سکے۔ دراصل 16 سال کی عمر کے بعد لڑکی ہو یا لڑکا اُسے وہاں قانونی طور پر جوان تصور کیا جاتا ہے اور اُس کی مرضی کے بغیر آپ اُسے مجبور نہیں کر سکتے ورنہ وہ کسی بھی Law enforcement ایجنسی کے پاس جا کر ہیلپ ڈیمانڈ کر سکتے ہیں۔ سوشل سیکورٹی والوں سے اپنے لیے علیحدہ مکان کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ آپ اُنہیں روکنے کے مجاز نہیں رہتے۔ اس لیے والدین خصوصاً لڑکیوں کے والدین کوشش کرتے ہیں کہ اِس سے پہلے کہ یہ شُترِ بے مہار ہو جائیں اُن کا ''تروپا'' بھر دیا جائے۔

اس کے لیے اُن کی نظر اپنے ملک پر پڑتی ہے، کیونکہ وہاں سے آنے والے، غربت کے مارے، انگلینڈ آنے کے شوق میں نہ تو شکل وصورت دیکھتے ہیں اور نہ کوئی اور تفتیش ہوتی ہے جو کہ اپنے ملک میں اکثر کی جاتی ہے۔ اکثر ایسے لڑکوں کو جن کے ابھی کاغذات مکمل نہیں ہوئے ہوتے، میں نے بچوں کی ٹرالی دھکیلتے اور میڈم کو خراماں خراماں شاپنگ کرتے دیکھا ہے۔ جس وقت تک اُن کے کاغذات مکمل ہوتے ہیں اُس وقت تک اُن کی سرکشی ہوا ہو چکی ہوتی اور وہ بچوں کی وجہ سے یا طلاق کی صورت میں اُن کے خرچے اور دوسرے مسائل کے ڈر سے ''دبو'' بن کر رہتے ہیں۔ میں کچھ ایسے جانبازوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے اس سب کے باوجود بغاوت کی، لیکن ملکہ کے زیرِ سایہ اس عورت کی حکمرانی والے ملک میں اکثر کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔

اس صورت میں کہ لڑکی پاکستان سے ہو اور لڑکا انگلستان سے، اس میں کچھ زیادہ پرابلم پیش نہیں آتی، کیونکہ وہ بیچاریاں تو گھر سے تعلیم ہی یہ لیکر آتی ہیں کہ بیٹا اب تم نے مر کر ہی اُس گھر سے نکلنا ہے۔ اس لیے خاوند کے جائز و ناجائز مشغلوں پر بھی سر جھکا دینا اُنکا کام ہے۔

شاید اُن کے گھر میں میرے متعلق کوئی کھچڑی پک رہی تھی جسکی سن گن اُس بچی کو بھی مل گئی تھی جسکی وجہ سے اُس نے درج بالا جُملہ میری ٹیبل پر لکھ دیا تھا۔

ایک دن بڑی لڑکی اپنی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر مرکوز کر کے بولی

"Why you smoke too much Mr Khan"

''مسٹر خان! آپ اتنے سگریٹ کیوں پیتے ہیں''

''عادت جو ٹھہری''

"But its very harmful for your health"

''لیکن یہ تمہاری صحت کے لیے بہت نقصان دہ ہے''

''پریٹی گرل! یہ نفع نقصان تو تمہارے ہاں کے بنیے دیکھتے ہیں۔ ہماری یاری تو جس سے لگ گئی بس لگ گئی۔''

''ارے خان! سگریٹ تمہاری گرل فرینڈ ہے'' چھوٹی بچی ایکدم کھلکھلا پڑی اور بڑی والی اس سنجیدہ گفتگو میں اُس کی مداخلتِ بیجا پر اُسے گھور کر رہ گئی شاید وہ ایسے بات بڑھا کر کچھ اور بات کرنا چاہتی تھی۔

چند دن بعد فیکٹری مالک نے مجھے اور بھائی کو باصرار کھانے پر بلایا۔ انڈین بریانی، پاپڑ نما چپاتی کے علاوہ بھی بہت سی ڈشز میرے لیے نئی تھیں۔ کمرے کے باہر جوتے اُتار کر دسترخوان بچھا کر کھانا بھی روایت پسندی کو ظاہر کرتا تھا۔ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ شاید بر دکھاوا تھا، کیونکہ فیکٹری مالک نے چند دن بعد بات بھائی تک پہنچا دی تھی اور بھائی نے اُسے فیملی سے بات کر کے جواب دینے کا بولا تھا۔

ہفتہ وار ایک چھٹی ہوتی تھی۔ اُن دنوں میں ہم ایک ایک بار ''بلیک پول'' اور ''ساؤتھ پورٹ'' گھوم آئے تھے۔ ''بلیک پول'' بلیک برن سے تقریباً 40 میل پر ایک ساحلی قصبہ ہے۔ مجھے تو یہ ایک شریف سا ساحلی قصبہ لگا جہاں نہ تو دھوپ سینکتے اوندھے سیدھے لیٹے اٹھکیلیاں کرتے لوگ تھے اور نہ ہی ساحل پر رنگی برنگی چھتریوں کی بہار۔ سیدھے سبھاؤ لوگ بچوں کو لے کر گھٹنوں تک لباس اُٹھائے لہروں میں پھر رہے تھے یا پھر ایک پلے ہاؤس تھا جہاں کا ماحول ہمارے میلے ٹھیلے جیسا تھا۔ کوئی گردن کٹا بول رہا ہے تو کوئی بندر بنا کھڑا ہے۔ اُس میں اوپر ہواؤں میں لیجاتی اور اُلٹا سیدھا گھماتی الیکٹرک ٹرین اور تیزی سے گھماتے ہوئے الیکٹرک جھولے بھی موجود تھے۔ یہ سب چیزیں میرا من نہ پرچا سکیں۔ یہ شاید میرے اندر کی اُداسی تھی یا میرے مطالعہ کا قصور کہ یہ چیزیں مجھے **Standard** سے بہت کم لگیں۔ ایسے ہی ساؤتھ پورٹ میں بھی میں نے کوئی خاص کشش محسوس نہ کی۔

ہر اتوار کو میرے چچا اپنی دُکان کے سٹاک کی خریداری کے لیے کبھی بریڈفورڈ اور کبھی مانچسٹر جاتے۔ اُن کا بلیک برن میں ''ہاؤس ہولڈ'' یعنی گھریلو سامان کی فروخت کا خاصا بڑا اسٹور ہے۔ یہ دونوں شہر سمت کے تھوڑے فرق کے ساتھ بلیک برن سے تقریباً 50 میل کے ایریے میں آتے ہیں۔ یوں مجھے یہ دونوں شہر بھی گھومنے کا موقعہ ملا۔

''بلیک برن'' ایک خاصا بڑا قصبہ نما شہر تھا۔ جہاں آہستہ آہستہ ایشین آبادی بڑھتی جا رہی تھی۔ بہت ساری سٹریٹس تو صرف ایشیائی لوگوں سے آباد تھیں۔ دراصل جو مجھے پتہ چلا وہ یہ تھا کہ جس سٹریٹ پر پانچ سات ایشین گھر آباد ہو جاتے، گورے لوگ آہستہ آہستہ وہاں سے **Move** کر جاتے اور بالآخر اُس سٹریٹ پر ایشیائی لوگوں کا قبضہ ہو جاتا۔ بڑی بوڑھیاں دن چڑھے اپنے اپنے دروازے میں بیٹھ کر خوب گپیں ہانکتیں۔ یوں وہاں وہ ماحول دیکھنے کو ملتا جو اب ہمارے ہاں بھی مفقود ہے۔

شادی بیاہ عموماً پاکستان میں رشتہ داروں میں کیا جاتا ہے۔ کے لالچ میں مَیں نے اُن لڑکے لڑکیوں بلکہ بوڑھوں کی شادی بھی ہوتے دیکھی جو پاکستان میں ہوتے تو اپنی شکل وصورت کی وجہ سے کبھی شادی نہ کرسکتے۔ پاکستانی مرد زیادہ تر نوکریاں کرتے، بہت کم بزنس لائن میں تھے، لیکن ہندوستانی اکثریت میں بزنس لائن سے وابستہ دیکھے۔ مسجدیں موجود تھیں، مگر اذان کی آواز مسجد کے باہر تک پہنچانا ممنوع ہے۔ اس لیے ایسے سپیکر استعمال کیے جاتے ہیں جو خطبہ یا خطاب صرف مسجد کے اندر سناتے ہیں۔

بریڈفورڈ ایک بڑا قصبہ ہے اور یہاں بھی ایشیائی آبادی کی اکثریت ہے۔ یہ بلیک برن سے زیادہ بڑا کاروباری مرکز ہے۔ یہیں کہیں جہاز میں ملنے والی سیالکوٹن ''لوجی'' کا بھی گھر تھا۔ اُس کیساتھ شروع میں مَیں نے فون پر رابطہ رکھا تھا اور اُس نے ملنے پر شدید اصرار بھی کیا تھا، مگر مَیں بریڈفورڈ کبھی بھی اکیلا نہیں گیا۔ اس لیے ملاقات نہ کرسکا اور اب تو مَیں ویسے بھی اپنے جعلی ''کنوارہ پن'' کی وجہ سے شدید مشکل میں تھا۔ چچا، خالہ اور بھائی کا مشورہ تو یہی تھا کہ دوسری شادی نہ گناہ ہے اور نہ کوئی گھاٹے کا سودا۔ بلکہ خوش قسمتی ہے کہ ایک سیٹ فیملی سے پیشکش موجود ہے۔ ساتھ میں نیشنلٹی مفت میں، لیکن قباحت یہ تھی کہ ہمیں یہاں بھی سفارت خانے کی طرح یہی بتانا تھا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ جو میرے خیال کے مطابق بددیانتی تھی۔ پیپر میرج کی تحریک ہوتی تو کوئی پرابلم نہیں تھی، مگر یہ تو حقیقت میں سب ہونا تھا۔ اُلجھن یہ تھی کہ سب اس طرح ہو جانے پر میں اپنے اندر کے انسان سے شرمندہ رہتا کہ میں نے لالچ میں آکر اصولوں کو پسِ پشت پھینک دیا۔ جو میرے لیے ایک مسلسل عذاب سے کم نہ ہوتا۔ دوسری طرف ایک روشن مستقبل تھا جس سے بے اعتنائی آئندہ زندگی میں آمدہ مشکلات کے وقت مجھے وقت کو کھودینے کا مسلسل احساس دلاتی۔ پھر ساتھ ساتھ اپنوں کے طعنے بھی ہوتے کہ ہم نے تو اِس بیوقوف سے کہا تھا۔ سو یہ کشمکش میری جان کھائے جارہی تھی۔ یوں اس انڈین فیملی کا خلوص میرے لیے سوہانِ روح بن چکا تھا۔

مانچسٹر ایک بہت بڑا شہر ہے۔ شاید انگلینڈ میں لندن کے بعد دوسرا بڑا شہر۔ یہ نا صرف عام کاروبار کے لحاظ سے بلکہ اپنی انڈسٹری ، اُسکی پیداوار اور نت نئی ایجادات کے طفیل انگلینڈ کا دماغ کہلواتا ہے۔ مانچسٹر والے دعویٰ کناں ہیں کہ مانچسٹر جو آج سوچتا ہے وہ باقی انگلینڈ کی سمجھ میں بہت بعد میں آتا ہے۔ اس شہر میں بھی میرے خاصے جاننے والے تھے۔ چچا کے ساتھ یہاں کے بڑے بڑے ویئر ہاؤسز میں جانے کا اتفاق ہوا، جو مال سے اَٹے پڑے تھے۔

کچھ دنوں بعد میں نے فیکٹری مالک سے کہا کہ مجھے اگلے ہفتے کی چھٹی چاہیے

''کیوں خان''؟ اُس نے مخصوص لہجہ میں پوچھا

''میں بھائی اور چند دوستوں کے ساتھ یورپ کے ٹور پر جا رہا ہوں''

''جرور، جرور، بڑی جُمّا داریوں سے پہلے تفریح اچھا ہے۔'' اُس نے تبصرہ کیا۔ شاید وہ رشتہ کے سلسلہ میں پُر امید تھا۔ اگلے دن شام کو چھوٹی لڑکی نے مجھے پوچھا

''Khan! what will you bring for me from Europe''

''خان! میرے لیے یورپ سے کیا لاؤ گے''؟

''You can ask for anything in my approach''

''تم کسی بھی ایسی چیز کی فرمائش کر سکتی ہو جو میرے بس میں ہو''

''And what's about you sweet Lady''

''اور لیڈی آپ کیا کہتی ہیں'' میں نے بڑی والی کو ساتھ ہی چھیڑا۔

"Come back safe and soon. Is it in your approach?"

''صرف جلدی اور محفوظ واپس آ جانا۔ یہ تو تمہارے بس میں ہے ناں؟'' اُس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

اِس فیکٹری میں میرے علاوہ 8 مزدور لڑکے تھے جن میں سے صرف دو پاکستانی تھے۔ ایک تو دبو قسم کے صاحب تھے، مگر دوسرے چلبلے پٹھان خان صاحب تھے جو روز سرمہ ڈال کے، بال تیل سے چُپڑ کر آتے اور اپنی گلابی اُردو سے لڑکیوں کو لائن مارنے کی کوشش کرتے، کیونکہ لڑکیوں کو پشتو نہیں آتی تھی اور وہ گجراتی یا انگریزی دونوں سے پیدل تھے۔ وہ سب کے لیے کھلونا تھے اور لڑکیاں انہیں باتوں اور اداؤں سے خوب گھسیٹتی تھیں۔ اب جبکہ میں پنجابی خان اُدھر پہنچا تو پہلے تو وہ مجھے پٹھان خان سمجھ کر بہت خوش ہوئے اور تیز تیز پشتو میں کچھ جملے بولے، مگر بد قسمتی سے مجھے پشتو کا ایک جملہ بھی نہیں آتا تھا اس لیے خاصے مایوس ہوئے، مگر پھر بھی اُن سے ایک تعلقِ خاطر رہا۔

پاکستان اور انڈیا کے کرکٹ میچ جاری تھے جو کہ فیکٹری میں ریڈیو پر رننگ کمنٹری کی صورت میں سُنے جاتے۔ ایک دن میں کام پر پہنچا تو خان فوراً میرے پاس اُٹھ کر آیا اور کہنے لگا

''خان! یہ سب لوگ نام کا مسلمان ہے۔ کافروں کا حمایت کرتا ہے میچ میں''

''یار! لوگ مخالف نہ ہوں تو کیا مزہ میچ کا یا زندگی کا''

میں نے فلسفہ جھاڑا، مگر وہ اُسی جوشیلے لہجے میں جاری رہا

''خان! انہوں نے اپنے خان صاحب عمران خان کو بھی گالی نکالا گجراتی میں''

''نہیں یار!''

میں نے مصنوعی بے یقینی کا اظہار کیا تو وہ دوسرے پاکستانی کو بھی میرے پاس لے آیا۔ اُس کا چہرہ بھی جوش سے تمتمار ہا تھا۔

جب اُس نے بھی خان صاحب کی تائید کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اِن لوگوں نے فیکٹری کو پاکستان اور انڈیا بنا دیا ہے۔ فیکٹری کا مالک یا تو کسی وجہ سے میری طرح لیٹ تھا یا پھر بینکنگ (Banking) کے لیے گیا تھا اور اِدھر یہ پاک بھارت جنگ چھڑ گئی تھی۔

ابھی وہ مجھے یہ سب بتا رہے تھے کہ گجراتی لڑکے آ کر اپنی صفائی دینے لگے۔ کچھ لڑکیاں بھی اُٹھ کر آ گئیں تھیں اور اُن کا ساتھ دے رہیں تھیں

’’خان! اس نے پل دیو کو گالی دیا ہم نہ بولا، اس نے مہندر کو برا بولا تو ہم پھر بھی نہ بولا۔ ہم نے تو آپس میں عمران کی سپیڈ کا بات کیا جو اس نے گالی سمجھا۔‘‘

وہ لوگ الزام تراشی کے ساتھ ساتھ صفائی بھی دے رہے تھے۔ جو کہ جھوٹ لگتی تھی۔ میں نے کہا۔

’’اچھا تو تمہیں عمران خان سے کوئی رنج نہیں ہے‘‘

’’نہیں خان بالکل نہیں‘‘

’’تو پھر کہو عمران خان زندہ باد‘‘

وہ ایک لمحے کو ہچکچاتے ہوئے جھگڑا سمٹتے دیکھ کر بولے

’’ہاں ہاں، جندہ باد، عمران خان جندہ باد‘‘

پھر انہوں نے اسے شغل بنالیا اور لڑکیاں بھی ’عمران خان جندہ باد‘ کہنے لگیں۔ یوں باآسانی یہ مسئلہ سمٹ گیا۔ بہرحال یہاں اپنے اپنے مُلک کی محبت ضرور نظر آئی۔

دراصل شروع میں جب میں اس فیکٹری میں آیا تھا اور پریسنگ کا کام کرتا تھا تو اُن لوگوں کا رویہ میرے ساتھ خاصا خشک تھا۔ پھر میں کوالٹی چیک کرنے لگا تو میں نے خاصی سختی سے کام لیا۔ لڑکیاں اور لڑکے آپس میں ہنسی مذاق کرتے تو کام سے نظر ہٹ جاتی اور کبھی تو سلائی رہ جاتی اور کبھی ٹیڑھی ہو جاتی۔ مالک نے مجھے یہ کام دیتے ہوئے بریف کر دیا تھا، کیونکہ اس سے اُس کے مال کی کوالٹی میں کمی آتی تھی اور نقصان بھی ہوتا تھا۔ بعد میں اُس نے میری سختی کے جواب میں ورکرز سے موصول ہونے والی شکایات میں میرا ابھرپور ساتھ دیا۔ میں معمولی سے نقص کو بھی متعلقہ میز پر لے جا کر ٹھیک کرواتا۔ متعلقہ شخص یا لڑکی کو وہ کام دوبارہ اُدھیڑ کر کرنا پڑتا جو انہیں بہت دُکھتا، کیونکہ وہاں (Per piece) ریٹ مقرر تھا اور اس طرح اُن کا ٹائم ضائع ہوتا تھا اور کام کم ہو جاتا تھا۔ اس بات پر قابو پانے کے لیے اُن میں سے دو تین خاصی خوبصورت لڑکیوں نے مجھے لائن

مارنے کی کوشش کی، مگر میں سمجھ گیا کہ یہ رعائیت لینے کے لیے اُن کا مشترکہ منصوبہ ہے۔ ناکامی پر مجھے سٹون ہارٹ (Stone Heart)، سٹون فیس (Stone Face) اور سٹون آئز (Stone Eyes) جیسے خطابات عنایت ہوئے جو مجھے کافی عرصہ بعد میں پتا چل سکے، لیکن اب مالک کی نظرِ عنایت کے بعد تو مَیں اُن کے لیے ایک طرح سے مالک کا ہی نمائندہ تھا۔

جیسا کہ اوپر بینکنگ کا ذکر ہوا ہے۔ بینکنگ (Banking) انگلینڈ میں بزنس مینوں کی ڈیلی روٹین کا حصّہ ہے۔ وہاں رقم کے معاملہ میں بہت احتیاط کی جاتی ہے۔ روزانہ کی سیل تقریباً روزانہ ہی بنک میں ڈراپ کردی جاتی ہے۔ ڈراپ کی Term میں نے اس لیے استعمال کی ہے، کیونکہ بینک بزنس مینوں کو باقاعدہ تھیلیاں اور لفافے مہیا کرتے ہیں۔ لفافے نوٹوں کے لیے اور تھیلیاں سِکوں کے لیے۔ اب بزنس مین نے صرف اُن لفافوں اور تھیلیوں پر مخصوص جگہ پر اپنا اکاؤنٹ نمبر اور اُس میں ڈالی ہوئی رقم کی تفصیل لکھنا ہے اور اُسے لائن میں لگنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُن کے لیے علیحدہ مشین ہوتی ہے جس میں اُس نے اپنا ڈیبٹ کارڈ ڈال کر رقم کا اندراج کرنا ہے اور لفافہ اور تھیلی مشین کے اندر پھینک دینا ہے۔ اگلے دن وہ رقم آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہوجائے گی کمی بیشی کی صورت میں بنک آپ سے رابطہ کرلے گا۔ اِسکے علاوہ اب تو انگلینڈ میں کئی بنکوں میں ایسی مشینیں بھی لگ گئی ہیں جن میں آپ ڈیبٹ کارڈ ڈالنے کے بعد بغیر لفافے کے کھلے نوٹ ڈالیں اور وہ گن کر آپ کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرکے آپ کو رسید دے دے گی۔

اِسی طرح بزنس پلیس (Business Place) پر موجود (Till) میں بھی زیادہ رقم رکھنا غلط ہوتا ہے۔ اِس لیے اُنہوں نے عموماً زمین دوز پاکستانی گلّا نما لاکر (Locker) بنائے ہوتے ہیں جو کیش کاؤنٹر کے پاس ہی ہوتے ہیں اور باقاعدہ لاک ہوتے ہیں۔ اب کیشئر (Cashier) جب دیکھتا ہے کہ Till میں رقم زیادہ ہوگئی ہے تو وہ بڑے نوٹ ایک لفافے میں ڈالتا ہے۔ لفافے کے اُوپر رقم کا اندراج کرتا ہے، ڈراپ نمبر لکھتا ہے (مثلاً پہلا ڈراپ ہے،

دوسرا ہے، تیسرا ہے یا۔۔۔۔۔) اور پھر اپنے دستخط کر کے اُس زمین دوز گلّے میں ڈال دیتا ہے جس کی چابی صرف مالک کے پاس ہوتی ہے۔ پھر ڈراپ نمبر اور اُس کی رقم کا اندراج اپنے پاس موجود کاپی میں کر لیتا ہے۔ رات کو یا شفٹ کے اختتام پر حساب کرتے وقت اُن ڈراپس (Drops) کی رقم شامل کر لی جاتی ہے اور حساب ہو جاتا ہے اللہ اللہ خیر صلاّ۔ بعد میں مالک آ کر کِسی وقت کاؤنٹر کے نیچے بیٹھ کر رازداری سے وہ ڈراپس نکالتا ہے اور کسی رنگین شاپر میں ڈال کر اپنے آفس میں لے جاتا ہے جہاں وہ Calculation کے بعد انہیں بینک کے لفافوں میں ڈال کر بینکنگ کے لیے جاتا ہے۔ اس کی اپنی بڑی خریداری عموماً چیک یا کارڈ کے ذریعے ہوتی ہے اس لیے نقد رقم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیب میں عموماً بینک کارڈ، کریڈٹ کارڈ اور سو پچاس کی رقم ہی ہوتی ہے۔ یہ سب احتیاطیں چوروں کو چوری کی ترغیب سے بچانے کیلئے ہوتی ہیں اور بہت کامیاب ہیں۔

میری آمد سے قبل ہی میرے بھائی ضیاالرؤف خان نے ضد پکڑی ہوئی تھی کہ اُسے پاکستان واپس جانا ہے۔ اُس کا دل نہیں لگتا۔ اُسے بھائی انعام نے بہت بھاری فیس بھر کر بہت مہنگے سکول میں داخل کروا کر سٹوڈنٹ کے طور پر بُلایا تھا اور باقاعدہ پڑھا رہا تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر 12-13 سال تھی اور وہ دو سال سے پڑھ رہا تھا، مگر وہ بھائی کے سخت رویہ کا شاکی تھا۔ انکل، بھائی، بھابی، سب اُسے سمجھا کر تھک چکے تھے۔ بعد میں میرے بھی بہت سمجھانے کے باوجود وہ نہ مانا اور بالآخر بھائی کو اُسے واپس بھیجنا پڑا مگر اسے اِس کا بہت افسوس تھا کہ اتنی بھاری فیس بھی ضائع گئی اور حاصل بھی کچھ نہ ہوا۔

بھائی اپنے شہر (بلیک برن) میں بہت سے بینکوں، بلڈنگ سوسائٹیوں (Building Socities) (یہ بھی ایک طرح کے بنک ہوتے ہیں) اور قرضہ دینے والی کمپنیوں کا نمائندہ تھا۔ وہ لوگوں کو اُن اداروں سے Loan لے کر دیتا۔ اُن کو مکانوں کے لیے اور بزنس لون کے لیے

انجیت کرتا۔ اُن کے لیے مکانوں کی Mortgage کرواتا۔ جس پر کمپنیاں اُسے کمیشن ادا کرتیں۔ وہ اپنے پیشے میں انگلینڈ بھر میں ٹاپ کے لوگوں میں سے تھا۔ اس حوالے سے اُس کے کلائنٹس (Clients) زیادہ تر ہندوستانی لوگ تھے اور اُن میں وہ بہت مقبول تھا۔ اس لیے ہمارے دورۂ یورپ کے دو ساتھی بھی انڈین لڑکے ہی تھے۔ میں، بھائی اور وہ دونوں انڈین (عامر اور مقبول) بھائی کی نئی ٹیوٹا میں (جو اُس نے میری آمد سے کچھ دن پہلے خریدی تھی) نکلے۔ ہمارا پروگرام اپنی ٹیوٹا میں فرانس، بلجیئم اور ہالینڈ گھومنے کا تھا۔ یہ ہفتہ بھر کا ٹور (Tour) تھا۔ ہم بلیک برن سے موٹروے پر چڑھے تو لندن سٹاپ کیا۔ وہاں اُنہی دونوں انڈین میں سے کسی ایک کے عزیز کے ہاں رات کا کھانا تھا۔

اب اس دورے میں پہلی دفعہ میری دریائے ٹیمز سے ملاقات ہوئی۔ گدلے پانی سے پُر پختہ کناروں کے بیچ بہتا ہوا دریائے ٹیمز۔ وہی دریائے ٹیمز جس کے اوپر مشہور زمانہ عجوبہ لندن برج ہے، اسے ٹاور برج بھی کہا جاتا ہے۔ جسے بڑے جہازوں کی اس دریا میں آمد پر اوپر اُٹھایا جا سکتا ہے۔ لندن برج بھی گئے۔ ایک عام سا پل جیسا کہ ہمارے دریائے راوی پر ہے کوئی خاص متاثر نہ کر سکا۔ خوش گپیوں میں رات کا کھانا ذرا لیٹ کھایا اور ڈوور (dover) کی بندرگاہ کی طرف چل پڑے جو کہ لندن سے 70-80 میل کے فاصلہ پر ہے۔ ہماری فیری (Fairy) یعنی (بحری جہاز) کا ٹائم علی الصبح تھا جس میں ہمارے دو کمرے بک تھے اور کار کی بکنگ (Booking) بھی تھی۔

ہم ایک ہفتے کا یورپ کا ٹور کر کے واپس آ چکے تھے۔ میں اپنے اور بھائی اپنے کام میں مصروف ہو چکے تھے۔ بھائی کے پیشہ ور مخالفین بھی ایشین ہی تھے جو اُس کی انتہائی تیز رفتار ترقی سے Jealous تھے۔ انہوں نے اپنے تعلقات استعمال کیے۔ لوگوں کو ورغلایا، سبز باغ دکھائے اور اُس کے خلاف مختلف کمپنیوں میں جھوٹی سچی شکایات کے ڈھیر لگا دیے۔ ایک دن بھائی نے مجھے یہ باتیں بتائیں اور کہا۔

"آپ شادی کے متعلق جلد از جلد فیصلہ کریں، کیونکہ میں شدید اُلجھن میں ہوں اور مجھے جلد از جلد کچھ بڑے فیصلے کرنے ہیں"

چند دن بعد اُس نے مجھے کہا

"آپ تو کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے، لیکن میں ایک دو دن میں انگلینڈ چھوڑ رہا ہوں"

بقول اُس کے اُس کیخلاف اُس کے مخالفوں نے اس قدر زیادہ شکایات کر دی تھیں کہ اگر وہ اُن کی انکوائری بھگتنے لگتا تو خجل ہو جاتا اور توہین الگ محسوس ہوتی۔ بہتر تھا کہ وہ Scene سے غائب ہو جائے اور کمپنیاں از خود انکوائری مکمل کر لیں۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہ ہوگا اور چند ماہ بعد آ کر وہ معاملات سنبھال لے گا۔ دو دن بعد اُس نے بمعہ فیملی انگلینڈ چھوڑ دیا۔ اُس کا پروگرام اپنی گاڑی میں پاکستان تک ڈرائیور کر کے جانے کا تھا۔ میں چچا کے ہاں منتقل ہو گیا۔ وہ بھی بھائی کے سسر ہونے کے باوجود اُس کے خاصے مخالف تھے اور بھائی کو شک تھا کہ ان انکوائریوں کے پیچھے اُن کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ مخالفت کی وجہ بھائی کی خود مختاری اور دبو بن کر نہ رہنا تھا۔

بھائی کے جانے کے کچھ دن بعد میں نے بھی واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ چچا نے کافی کہا کہ وہ قانونی کاروائی کے ذریعے میری مدت بڑھا سکتے ہیں، مگر بھائی کے خدشات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ ایک قسم کی سانڈھوں کی لڑائی تھی، اس میں سے میرا کھسک جانا ہی بہتر تھا۔ یار زندہ صحبت باقی، پھر سہی اگر خدا لایا۔ مجھے کسی کا مہرہ نہیں بننا تھا جیسا کہ اُن کی فیور لے کر بننا پڑتا۔ اگلے دن میں نے فیکٹری مالک کو بتایا۔

"میں جاب (Job) چھوڑ رہا ہوں۔"

"ارے کیوں؟" وہ حیران رہ گیا۔

"میرا دل نہیں لگا۔ میں پاکستان جا رہا ہوں۔"

’’دل نہیں لگا‘‘ وہ بڑبڑایا ’’یہ موقعہ بار بار نہیں ملتا، خصوصاً تم جیسے جوان لوگوں کو، تم پچھتاؤ گے، میں خان سے بھی بات کروں گا‘‘

’’اُس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے باس، وہ بزنس ٹور پر آؤٹ آف کنٹری ہے اور میں اُس کی غیر موجودگی میں ہی جانا چاہتا ہوں‘‘

’’کب چھوڑ کر جانا چاہتے ہو‘‘ وہ چڑ سا گیا

’’جب تم مناسب سمجھو۔ ابھی یا پھر ویک اینڈ پر‘‘

وہ چپ سا ہو گیا، کچھ سوچا اور آفس میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک لفافہ دیکر بولا

’’بہتر ہے تم یہ بات پھیلنے سے پہلے ابھی نکل جاؤ۔ یہ تمہاری تنخواہ ہے، لیکن میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ تم واپسی کو ترسو گے اور تمہیں شاید دوبارہ موقع نہ ملے‘‘

تنخواہ ہاتھ میں لے کر اور مناسب طریقے سے کام سے فارغ ہو کر میں جیسے ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے ٹیلیفون نمبر لکھنے والی نوٹ بک اُس کے آگے کر کے کہا۔ "Please" اور اُس نے سچ مچ کچھ الفاظ ہندی یا گجراتی میں لکھ دیئے۔ میں نے اُس کی ہدایت کے بموجب کسی کو بتائے بغیر فیکٹری چھوڑ دی۔

☞ ☞ ☞

لَوٹ چلا ہے بنجارہ

میرے اگلے چند دن گھومنے میں گزرے۔فیصل آباد کے جڑواں بھائی گریٹر مانچسٹر سے تھوڑا مزید تعارف حاصل کیا۔تقریباً20 لاکھ آبادی کا یہ شہر اوراُس کے مضافات خاصے خوبصورت ہیں دریائےIrwellکےمشرقی کنارے آباد یہ شہر 79-78عیسوی سے موجود ہے۔ دریائے Medlock، دریائے Irk،دریائے Tibاور دریائے مرسی Mersey بھی یہاں ہیں۔مانچسٹرکاArndaleیوکےکاسب سے بڑا شاپنگ مال ہے۔یہ شہرلنکاشائرکاؤنٹی میں ہے اورانگلینڈ کا ایک طرح سے انڈسٹریل کیپیٹل (Capital) ہے۔ٹریڈیونین کانگرس یہیں 1868 میں منعقد ہوئی تھی۔یہیں کارل مارکس نے مشہور مصنف اورمزدور لیڈر Friendrich Englesسے ملاقات کی تھی۔

اس شہر کا نام مانچسٹر کیسے پڑا۔اِس کے متعلق مختلف نظریات اورحوالے ہیں،لیکن دو مشہوراورمعقول حوالے درج ذیل ہیں۔

-1 پہلی صدی کے ابتدامیں یہاں رومیوں کا قبضہ تھا۔76-78ءمیں وہاں ایک رومن قلعہ ہوا کرتا تھا،جس کا نامMamucium تھا۔اِسی حوالے سے رومن اِس آبادی کوبھی یہی نام دیتے تھے۔اِس لفظ سے انگریزی ترجمہ Latinisation کیا گیا جس کے شاید تفصیلی معنی "Breast From Mamm" ہیں۔یعنی عورت کے

پستان۔ لکھتے ہیں یہاں ایک پہاڑی عورت کے پستانوں کی طرح تھی۔ جس پر وہ رومن قلعہ تھا اِس لیے انہوں نے یہ نام دیا۔

-2 دوسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ نام انگلش لفظ Mamma سے ماخوذ ہے جس کے معنی ماں کے ہیں اور جو دریائے Medlock کی دیوی ہوتی تھی۔ یہ دریا اِس قلعہ کے نیچے سے بہتا تھا۔ Mamm کا مطلب آئرش لہجے میں عورت کی چھاتیاں اور ویلش ایریا میں ماں بھی لیا جاتا ہے۔

اِس شہر کے نام کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو، اِس پر سب متفق ہیں کہ یہ نام عورت، اُس کی چھاتیوں یا ماں وغیرہ کے گرد ہی گھومتا ہے۔ کہتے ہیں یہاں کے قدیم باشندے Brigantes تھے جو کہ رومیوں پر اکثر حملہ آور ہوتے ۔جن سے بچنے کے لیے رومن جنرل General Aqricola نے 79ء میں مذکورہ قلعہ کی تعمیر کا آرڈر دیا اور اِس کا درج بالا نام Mamucium رکھا۔ اِس قلعہ کے آثار اب بھی Castle Field میں موجود ہیں۔ 2002ء کی رینکنگ کے مطابق یہ انگلینڈ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ جو کہ لندن کے شمال مغرب میں 160 میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ شہر مشہور ساحلی شہر لیور پول کے مشرق میں ہے۔

چوتھی صدی کے بعد اِس شہر کا تاریخ میں کوئی خاص حوالہ نہیں ہے۔ 1066ء میں یہاں نارمن قابض ہو گئے۔ 1282ء میں یہاں مارکیٹ کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔ اِس شہر کو مانچسٹر 1301ء میں پہلی بار پکارے جانے کا ثبوت ملتا ہے۔ Thomas De La Warre جو کہ Lord of the Manor تھا نے 1421ء میں Collegiate Church دریافت کیا اور اُسے دوبارہ تعمیر کیا۔ جس میں اب Chetham,s Library ہے جو کہ 1653ء میں کھولی گئی اور ابتک عوام کے لیے کُھلی ہے۔ یہ برطانیہ کی قدیم ترین فری لائبریری ہے۔ 1540ء میں یہ شہر Woollens and Linen کی دُنیا میں لنکا شائر کا بہترین شہر مانا گیا۔ اِس طرح سولہویں صدی میں یہ اُون کی تجارت میں انتہائی اہم شہر تھا۔

انگلش سول وار (English Civil War) میں مانچسٹر نے Parlimentary طرزِ حکومت کی حمائت کی۔ چارلس ورسلی (Charles Worsley) یہاں سے MP منتخب ہوا جو بعد میں لنکاشائر (Lancashire) چیسشائر (Chesshire) اور سٹیفورڈ شائر (Stafford Shire) کے وسیع علاقے کا میجر جنرل بنا۔ یہ جنرل 1656ء میں فوت ہوا۔ اِسی نے کرسمس کی تقریبات اور Ale Houses پر پابندی لگائی۔

مانچسٹر کی سمندر تک رسائی کیلیے 1736ء میں دریائے Irwell سے دریائے Mersey کے سمندری ڈاک (Docks) تک ایک روٹ بنایا گیا۔ اِس طرح 1761ء میں Bridge Water Canal نامی مصنوعی Water Way بنایا گیا تا کہ Worsley کی کانوں سے کوئلہ سنٹرل مانچسٹر پہنچایا جا سکے۔ 1776ء میں Runcorn نے اِس نہر کو دریائے Mersey تک بڑھایا۔ بعد کے دنوں میں Manchester Ship Canal بنائی گئی جِسے 1894ء میں کھولا گیا۔ یہ 56 کلومیٹر لمبی نہر ہے جو کہ دریائے مرسی اور Irwell سے سمندر تک جاتی ہے اور اِس سے شہر کا رابطہ سمندر سے ڈائریکٹ ہو جاتا ہے۔

1819ء برطانوی سول وار Peter Loo Massacre میں اس شہر نے زبردست رول ادا کیا۔ 1821ء میں مزدوروں کا اخبار Manchester Guardian یہیں جاری ہوا۔ جِس کے تحت مزدور دُشمن Corn Law کے خلاف Anti Corn law League اور Manchester school of Economics جیسی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ جن کی قیادت John Bright اور Richard Cobden جیسے مشہور عالم لیڈروں نے کی۔ انہی کی کوششوں سے 1832ء میں مانچسٹر کی پارلیمنٹ وجود میں آئی اور مانچسٹر Borough بنا۔

کاٹن کی سپننگ کیلیے پہلی مرتبہ مشینری 1789 ء میں یہیں بنائی گئی۔اٹھارویں صدی میں کپڑے کی پروڈکشن میں اِس شہر کا ایک نام تھا۔انگلینڈ کا پہلا میونسپل ائرپورٹ Ring way 1929ء میں اِس شہر میں بنا۔اِس طرح 1830 ء میں دُنیا کا پہلا جدید ترین ریلوے ٹریک The Liverpool and Manchester چالو ہوا۔

یہ شہر مارکسزم سے تعلق کی بھی ایک تاریخ رکھتا ہے۔کارل مارکس کے دوست Friendrich Engels کا تعلق اِسی شہر سے تھا۔یہیں Chetham,s Library میں Karl Marx نے Engels سے ملاقات بھی کی۔مارکس نے اُس وقت جو اکنامکس کی کتابیں یہاں پڑھیں وہ اب بھی اِس لائبریری کے شیلف میں موجود ہیں۔ اُسی دور میں Engels نے اپنی کتاب (The condition of the working class in England) لکھی۔یہ 1844 ء کی بات ہے۔ پہلی ٹریڈ یونین کانگرس (Trade Union Congress) اِسی شہر میں 1868 ء میں (David street, Mechanics Institute) میں ہوئی۔یہ انسٹیٹیوٹ 1824ء میں قائم ہوا۔1851ء میں اِس کے تحت Owens College بنا۔بعد میں یہ دونوں University of Manchester کہلائے۔یہ انگلینڈ کی سب سے بڑی Single Site یونیورسٹی ہے۔ یونیورسٹیوں میں Salford Univeristy بھی یہیں ہے۔

ورکنگ کلاس کی دلچسپی کیلیے بتادوں کہ 1853ء میں یہاں 108 کاٹن ملز موجود تھیں۔اِس سے آپ یہاں مزدوروں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔مشہور عالم John Rylands Library یہیں ہے۔جو کہ 1899 ء میں قائم ہوئی۔Thomas Dequincy جیسے شہرہ آفاق قلمکار کا تعلق بھی یہیں سے تھا۔نیوکلیئر فزکس (Nuclear Physics) کے بڑے نام Johan Dalton، Lord Rutherford اور

Niels Bohr یہیں کے پیدائشی تھے اور یہ شہر Scientific Reserch کا ایک بہت بڑا سنٹر ہے۔ چارلس ڈکنز (Charles Dickens) جیسے مشہورِ عالم ادیب نے اپنا ناول Hard Tmies یہیں پہ لکھا۔ Elizabeth Gaskel اور Mary Barton کی A Tail of Manchester Life بھی 1948ء میں یہیں لکھی گئی۔

یہاں کی یونیورسٹیاں عالم میں مشہور ہیں۔ جن میں بے شمار بین الاقوامی طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یونیورسٹی آف مانچسٹر کے علاوہ وکٹوریا یونیورسٹی آف مانچسٹر (Victoria University of Manchester) اور میٹرو پولیٹن یونیورسٹی آف مانچسٹر (Metropoliton University of Manchester) مشہور درسگاہیں ہیں۔

میڈیا کہ حوالے سے بھی اِس شہر کا ایک نام ہے اور اِس شہر میں BBC کے تین بڑے Bases میں سے ایک واقع ہے۔ Jodrell Bank پر ایک بہت بڑی ریڈیو ٹیلی سکوپ (Telescope) فٹ ہے جو کبھی دنیا میں سب سے بڑی (Telescope) تھی۔ یہاں کئی ایک مشہور آرٹ گیلریاں ہیں جن میں The Halle,s orchestra مشہورِ زمانہ ہے جسے 1857ء میں سر چارلس ہیلز (Sir Charless Halles) نے قائم کیا تھا۔ یہ شہر کیمکل انڈسٹری۔ فارموسٹیکل انڈسٹری اور ریسرچ انڈسٹری کا گڑھ ہے۔ پبلشنگ سنٹر آف نارتھ یہیں پر ہے۔

یہاں کا شاپنگ مال جس کا نام Manchbster Arndale ہے UK کا سب سے بڑا شاپنگ مال ہے۔ اِسی طرح اُونچی عمارتوں میں بھی یہ شہر کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ 47 منزلہ Beetham Tower 2006ء میں تعمیر ہوا۔ یہ 169 میٹر اونچا ہے۔ اِس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ویسٹرن یورپ میں سب سے بلند ترین Residential Accommodation یعنی رہائشی بلڈنگ اور UK میں لندن سے باہر سب سے بلند

عمارت ہے۔ اِس کی نچلی 23 منزلیں ہلٹن ہوٹل کے پاس ہیں جنہوں نے 23 ویں منزل پر Sky Bar بنا رکھا ہے۔ اُوپر والی 24 منزلیں رہائیشی اپارٹمنٹ (Appartments) ہیں۔

سطح سمندر سے 35 سے 42 میٹر بلند اِس پیالہ نما (Bowl Shape) شہر کا سٹی سنٹر دریائے Irwell کے مشرقی کنارے پر ہے۔ یہاں تقریباً 31.76 انچ ایوریج رین فال (Average Rain Fall) ہے، جبکہ پورے UK میں اُسکی Measurment 44.29 انچ ہے۔ یہاں سال میں ایوریج 140.4 دن بارش ہوتی ہے، جبکہ UK کی ایوریج 154.4 دن ہے۔ Humidity بہت ہے۔ سنوفال (Snow fall) نسبتاً کم ہوتی ہے، لیکن شہر کے نواحی علاقوں میں کافی برف باری ہوتی ہے۔

یہاں کی ایک خصوصی چیز Heaton Park بھی ہے۔ یہ پارک شہر کے شمال میں 610 ایکڑ پر محیط ہے اور یورپ کا سب سے بڑا میونسپل پارک مانا جاتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم میں اِس شہر نے بھی بہت تباہ کاری جھیلی ہے۔ 22/23 اور 23/24 دسمبر 1940ء کی راتیں اِس شہر کے لیے قیامت کی راتیں تھیں، جس میں اِس شہر پر 475 ٹن ہائی ایکسپلوسو (High Explosive) اور 37000 بمب گرائے گئے۔ جس میں اِس شہر کے 165 Where Houses، 200 بزنس مقامات اور 150 دفاتر تباہ ہوئے۔ 30000 مکانات ملبہ بن گئے۔ 376 لوگ ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ اِنہی حملوں میں Manchester Cathedral کو بھی نقصان پہنچا، جس کی بحالی اور مرمت میں 20 سال صرف ہوئے۔

مانچسٹر IRA (Irish Republic Army) کا بھی بہت مرتبہ نشانہ بنا۔ IRA نے یہاں 1867, 1920, 1939, 1992 اور 1996 میں حملے کیے۔ 1996ء میں تو IRA نے یہاں انگلینڈ کی تاریخ کا سب سے بڑا حملہ کیا، جس میں 200 لوگ مارے گئے اور تقریباً 400 ملین پاؤنڈ کا نقصان ہوا۔

کھیلوں میں بھی اِس شہر کا ایک نام ہے۔لنکا شائر کاؤنٹی کی کرکٹ ٹیم یہیں سے متعلقہ ہے۔فٹ بال میں مانچسٹر یونائیٹڈ اور مانچسٹر سٹی کے نام سے دو مشہور ٹیمیں ہیں۔اس کے علاوہ یہ شہر 2002ء میں کامن ویلتھ گیمز کا ہوسٹ (Host) بھی رہ چکا ہے۔

2007ء کی بزنس رپورٹ کے مطابق مانچسٹر انگلینڈ کا بزنس کیلیے سب سے بہترین شہر ہے۔ اِس رپورٹ میں اِسے (Fastest Growing City) قرار دیا گیا ہے۔ Gawc گلوبل لسٹ کے مطابق مانچسٹر کو Gamma City کے طور پر رینک (Rank) کیا گیا ہے۔

یہ انگلینڈ کا تیسرا سب سے زیادہ وزٹ کیا جانے والا شہر ہے اور لندن کے بعد دوسرا۔ اِس سب کے باوجود یہ لندن کے مقابلے میں ایک پُرسکون شہر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ ہمارے فیصل آباد کا جڑواں بھائی ہے(فیصل آباد اور مانچسٹر کو جُڑواں شہر قرار دیا جا چکا ہے)

بلیک برن، بریڈفورڈ، بولٹن، اولڈھم اور مانچسٹر کے نواحی علاقوں میں بہت بڑی تعداد میں کشمیری مسلمان نظر آتے ہیں۔وہاں ذات برادری سے زیادہ پاکستان میں موجود اُن کے رہائشی علاقوں کے حساب سے اُن کی گروپنگ نظر آئی۔بچوں کی پیدائش ہسپتالوں میں ہوتی ہے اور ماں کی Pregnancy کے ساتھ ہی اُس کا میڈیکل چیک اَپ شروع ہو جاتا ہے اور بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اُس کا دودھ اور دوسرا خرچہ گورنمنٹ سے جاری ہو جاتا ہے۔سکولوں میں بھی بچوں کو خوراک مہیا کی جاتی ہے۔عوام کے لیے میڈیکل کی سہولت فری ہے،لیکن Self Employed لوگ نسخہ کی دوائیاں خود خریدتے ہیں۔

بیروزگاروں کو گورنمنٹ بیکاری الاؤنس مہیا کرتی ہے۔ساتھ ساتھ اُن کے لیے جاب آفرز اُس کے گھر بھجواتی ہے جو کہ وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو کما کر کھانا چاہتے ہیں۔کام ملنے کی صورت میں کافی بڑی رقم ہر شخص کی تنخواہ سے بطور ٹیکس کٹ جاتی ہے Self Employment کی حوصلہ اَفزائی کی جاتی ہے،گورنمنٹ اُسوقت تک ٹیکس نہیں لیتی جب تک کہ بزنس معقول منافع نہ دینے لگے بلکہ کئی لوگ تو گھاٹا شو کر کے گورنمنٹ سے اُلٹا

امداد لیتے ہیں۔ اگر آپ سال کے آخر میں منافع کما کر اُس سے کوئی نیا یونٹ قائم کر لیتے ہیں تو گورنمنٹ آپ سے ٹیکس نہیں لیتی بلکہ اُس پیسے کو اخراجات میں **Consider** کرتی ہے۔ اس طرح نئی جاب نکلتی ہیں۔

ہر بزنس یونٹ کیلیے **VAT** کی رجسٹریشن اور نمبر ضروری ہے۔ یہ ٹیکس ضروری کھانے پینے کی اشیاء کو چھوڑ کر تقریباً ہر چیز پر دوکاندار گاہک سے وصول کر کے گورنمنٹ کو ادا کرتا ہے۔ اس کی شرح **17-5%** ہے۔ اشیاء کی قیمتیں عموماً راؤنڈ فگر میں نہیں لکھی جاتیں بلکہ **1.99** اور **2.99** کی طرز پر لکھی اور وصول کی جاتی ہیں۔ میں نے برطانوی لوگوں کو بقایا کی صورت میں چاہے ایک پینی ہی کیوں نہ ہو، وصول کرتے دیکھا ہے۔

مسلمان ایشین لوگوں میں قانونی کاروائی کے لیے کونسل کے پاس رجسٹریشن اور ایجاب وقبول کے باوجود با قاعدہ نکاح پڑھایا جاتا ہے اور ہلکی پھلکی دعوت کی جاتی ہے۔ کبھی اپنے گھر میں ہی اور کبھی کسی ریستوران میں **Per head** ریٹ پر۔ مسلمان دلہنیں عموماً سرخ رنگ کے کپڑوں میں ہی ملبوس ہوتی ہیں، جبکہ انگریزوں میں عورتوں کے لیے شادی کے وقت سفید لباس روایت بھی ہے اور پسندیدہ بھی ہے۔

بہت تھوڑے ایشین نوجوان لڑکے یا لڑکیاں اپنی مرضی سے وہیں شادی کرتے ہیں، مگر اُن کا یہ فعل پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔ اِسی طرح جوان بچوں کے ٹائم ٹیبل پر بھی نظر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر انہیں ڈانٹ ڈپٹ سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ صرف دوستانہ لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے جو کہ اکثر رائیگاں جاتی ہے۔ پُرانے لوگ آپس میں مادری زبان بولنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر نوجوان نسل ذریعہ اظہار اکثر انگریزی کو بناتی ہے۔ چند دن کی آوارہ گردی کے بعد میری روانگی کی تاریخ آ گئی اور میری فلائٹ فرینکفرٹ اور عمان سے ہوتی ہوئی پاکستان پہنچ گئی۔

دماغ کا خلل

یہ انگلینڈ میں میرے تیسرے یا چوتھے سفر کی بات ہے۔میں ویلز (WALES) کے ایک چھوٹے سے شہر میں ایک کافی بڑے سٹور کے کیش کاؤنٹر کے پیچھے موجود تھا۔یہاں میں منیجر کے طور پر کام کررہا تھا۔یہ سٹور دراصل میرے ایک پاکستانی دوست کے والد کا تھا۔میرے دوست کا والد کسی وجہ سے زخمی ہوکر قومہ میں چلا گیا تھا۔اُس نے یہاں خود کو کنوارہ ظاہر کر کے دوسری شادی کر لی تھی تاکہ نیشنلٹی حاصل کرسکے۔اسی لیے میرے دوست ،اُس کی والدہ اور دوسرے بچوں کا وہاں اندراج نہ تھا۔اس حادثہ سے قبل میرے دوست کا والد اپنی برطانوی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔سو جب وہ زخمی ہوا تو اُس کے دوستوں نے جو کہ واقفِ حال تھے کسی طرح پاکستان اُس کے بچوں کو اطلاع کردی،لیکن برطانوی ہائی کمیشن نے میرے دوست کو ویزہ دینے سے انکار کردیا کہ اُس کی ولدیت اُس کے والد کے برطانوی کاغذات سے ثابت نہ تھی اس لیے وجہِ سفر بھی نہ بنتی تھی۔بات کسی طرح میرے تک پہنچی تو میں نے اُسے چند مشورے دیے۔جس کی وجہ سے ایمبیسی نے اُس کا ویزہ لگادیا اور وہ فوری طور پر انگلینڈ پہنچ گیا۔میرا دوست خاصا تیز طرار تھا،مگر تھا ان پڑھ۔اُس نے تقریباً تین ماہ تک ملازمین کے ذریعے سٹور کو چلانے کی کوشش کی،مگر کامیاب نہ ہوسکا۔بالآخر اُس نے مجھے پاکستان کال کی اور مجھے میری طرف سے اُسے کی گئی پیش کش یاد دلائی۔اگلے پندرہ بیس دن کے اندر میں لندن پہنچ گیا۔میرے لندن میں موجود دوستوں نے میری

آمد کاسن کر میرے لیے چند جگہوں پر کام کے لیے کہہ دیا تھا اور اب اُن کے پاس میرے لیے کام کی آفر موجود تھی۔ میں نے ترجیح کے طور (Priority Bases) پر اُس دوست کو کال کی تو اُس نے مجھے فوراً ویلز پہنچنے کی درخواست کی۔ سو اِس طرح میں اب اس کے سٹور میں کیش کاؤنٹر کے پیچھے موجود تھا۔ میرے ساتھ دوسری ٹل (Till) مشین پر وہ خود تھا۔

یہ ایک خاصا بڑا سٹور تھا جس میں کھانے پینے اور کاسمیٹکس (Cosmetics) کی اشیاء کے علاوہ بئیر، وائن، لاگر اور ہر طرح کی سوفٹ اور ہارڈ ڈرنک فروخت ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ (Pet food) یعنی جانوروں کی خوراک کا بھی ایک پورشن (Portion) تھا۔ دوسری ضروریاتِ زندگی کی اشیاء بھی دستیاب تھیں۔ سٹور میں کسٹمرز کا مناسب رش ہر وقت موجود رہتا۔ دو فل ٹائم لیڈی ورکرز میرے دوست کے باپ کے زمانے سے کام کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ چھٹی کے دنوں (ہفتہ، اتوار) میں دو کمسن لڑکیاں اور کام پر آ جاتیں جس کی وجہ سے ہمیں مستقل (Permanent) ورکرز کو باری باری ایک ایک چھٹی دینے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ میرے آنے سے قبل میرے دوست نے ایک اور ورکر رکھا ہوا تھا جو کہ کیش اینڈ کیری (Cash & Carry) سے ہفتہ میں دو بار سٹور کی مرسڈیز وین میں سٹور کا سامان لا دیتا۔ یہ ورکر فی الحال کام کر رہا تھا۔ سٹور کے اوپر تین کمروں کا ایک بڑا فلیٹ تھا جس میں میری اور میرے دوست کی رہائش تھی۔ وہاں ہر طرح کی سہولت میسر تھی ماسوائے کسی کام کرنے والی یا دل بہلانے والی کے۔ میرے دوست کے والد اب بھی ہسپتال میں تھے۔ گو کہ وہ قومہ سے باہر آ چکے تھے، مگر اُن کی ایک سائیڈ پر فالج ہو چکا تھا۔ بات کرتے ہوئے زبان اٹکتی تھی۔ کبھی کبھی بالکل نارمل باتیں کرتے اور کبھی ذہنی رو بہک بھی جاتی تھی۔ ویسے اپنے بیٹے کے ساتھ اُن کا رویہ دوستوں جیسا تھا۔ میرے ساتھ تو پچھلے چند دنوں میں ہی کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔ ہسپتال میں اُن کو جو کمرہ ملا ہوا تھا اُس میں ٹی وی کی سہولت میسر تھی۔

میں اور میرا دوست عموماً رات کو سٹور بند کر کے اُن کی مزاج پرسی اور گپ شپ کے لیے روز جاتے کہ ڈاکٹروں کے مطابق یہ بھی اُن کے علاج کا حصّہ تھا۔ایک دن جب ہم دونوں گئے تو ٹی وی پر کوئی فلم چل رہی تھی جس میں ایک نرس کے ساتھ ریپ (Rape) کا سین تھا۔وہ ہمیں ہنس کے بتانے لگے کہ عین اس سے مِلتی جُلتی گوری نرس اسی وارڈ میں ہے۔پھر مجھے ہنس کے کہنے لگے۔

''یار! کسی طرح اُس کی ڈیوٹی مجھ پر نہیں لگ سکتی؟ مجھے جو نرس انہوں نے دے رکھی ہے وہ نرس تھوڑی ہے، مشین ہے مشین، اُسے تو صحیح طرح سے مسکرانا بھی نہیں آتا''

ہم اُن کی رنگین مزاجی سے واقف تھے اور میرا دوست اُن کی بہت سی کہانیاں سُن چکا تھا۔

اُس نے کہا ''ڈیڈی! آپ کونسی نرس کی بات کر رہے ہیں۔؟''

تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس وقت شفٹ انچارج ہے۔

دوست نے میری طرف دیکھا تو میں اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

میں نے جا کر شفٹ انچارج کو دیکھا تو وہ واقع ٹھیک ٹھاک خوبصورت ، بھری بھری جسامت کی بڑی بڑی آنکھوں والی تقریباً 30 سالہ گوری تھی۔جس کے اوپری ہونٹ پر فلم کی اُس ہیروئن کی طرح تِل بھی تھا۔میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ہمارے کمرہ میں تشریف لائے تو پوچھنے لگی۔

اینی ٹربل سر؟ **Any trouble sir?**

(No, Just want to discuss a little bit)

نہیں، بس تھوڑی سی بات کرنا ہے۔

(Ok, Coming in 10 minutes ٹھیک ہے دس منٹ میں آ رہی ہوں۔

میں نے آ کر انہیں بتایا تو وہ بولے، ''بھئی کیا کہو گے تم اُسے۔؟ بے عزتی نہ کروا دینا''

''دیکھتے جائیں''۔

چند منٹ بعد وہ محترمہ تشریف لائیں تو آتے ہی بولیں

’’سوری، ذرا شفٹ کا کام کرنا ہوتا ہے۔اب میں کچھ فری ہوں۔بولو کیا بات ہے؟‘‘

’’پہلے ہم آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتے ہیں۔پلیز دیکھیں اس فلم کی ہیروئن کے متعلق اس جنٹل مین کا خیال ہے کہ ہو بہو آپ سے ملتی شکل کی ہے‘‘

میرے اس طرح کے ڈائرکٹ کمنٹس (Direct coments) پر انکل تھوڑا کھسیا گئے، مگر نرس کا ری ایکشن (Reaction) دیدنی تھا۔

اوہ ریئلی (OH, Really)۔یہ کہہ کر وہ غور سے فلم دیکھنے لگی۔

(There is some resemblance, But No body said me like this before)

’’ہاں کچھ مشابہت تو ہے، مگر پہلے مجھے ایسا کسی نے نہیں بولا‘‘

"OH, Dear old man, Thank You"

اوہ، پیارے بوڑھے آدمی، شکریہ

’’ایک بات اور ہے۔یہ شریف آدمی (Gentleman) تمہیں بہت پسند کرتا ہے‘‘

وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی، (He or You?) یہ یا تم؟

’’میں بھی، مگر یہ مجھ سے پہلا آدمی ہے جسے تم اپنے حسن سے مار رہی ہو‘‘

"Me too, But he is the first before me to whom you are killing with your beauty"

وہ لال ہو گئی اور ہنستے ہوئے بولی (OH, Poor Old man)، ’’ہائے غریب بوڑھا آدمی۔‘‘

انکل اٹکتے ہوئے بولے ’’یہ غلط ہے، میں اتنا بوڑھا نہیں ہوں‘‘

It is wrong, I am not too old

میں نے کہا ''کیا حرج ہے اگر تم اس بیمار آدمی کی دلجوئی کے لیے اس کی دیکھ بھال کرو؟''

ہنستے ہوئے بولی ''کیا انداز ہے سفارش کا، ہمدردیاں بھی ساتھ ساتھ اجاگر کی جا رہی ہیں''

میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"If possible please, Its just a request for favour but no pressure"

''اگر ممکن ہو تو، یہ صرف فیور کی درخواست ہے۔ کوئی دباؤ نہیں۔''

اُس نے بتایا کہ وہ نائٹ شفٹ انچارج ہے، سنئیر نرس ہے، اُس کی ڈیوٹی کسی خاص مریض پر نہیں ہوتی۔ بہرحال وہ خیال رکھے گی۔ پھر اچانک پوچھنے لگی ''کافی پیو گے''

"Sure if possible from your pretty hands "

''یقیناً اگر تمہارے خوبصورت ہاتھوں سے ہو تو۔''

''انہی سے ہوگی، انہی سے ہوگی، مگر آدھے گھنٹے بعد۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ کر چلی گئی

اُس کے جاتے ہی میرا دوست مجھ سے ترجمہ پوچھنے لگا حالانکہ وہ کافی انگریزی سمجھنے لگ گیا تھا۔ اُس کا باپ اُسے فالج زدہ زبان سے ساری بات بتانے لگا اور ساتھ میں تبصرہ بھی کیا کہ لگتا ہے اِس پر ریجھ گئی ہے۔ جس وقت کی یہ بات ہے اُس وقت آتش جوان تھا۔ تقریباً 35 سال عمر تھی۔ انگلینڈ کے کئی پھیروں سے سب جھجک دور ہو چکی تھی۔ محدود انگریزی کو وسیع معنوں میں استعمال کرنا آ چکا تھا۔ حرکات وسکنات اور آنکھوں کے استعمال کی اثر پذیری سے بھی خاصی واقفیت تھی جو کہ میں نے یہاں استعمال کی تھی، لیکن انکل سمجھ گئے تھے، کیونکہ وہ خود کھائے پیئے ہوئے آدمی تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ چار کپ کافی لے کر آئی اور آتے ہی بولی۔

''سوری، مجھے کام بھی دیکھنا ہوتا ہے۔ اب پھر تھوڑی دیر کے لیے فری ہوں۔''

ہم کافی پیتے رہے اور گپیں ہانکتے رہے۔ میں اُس کے من پسند فقرے بولتا رہا اور وہ کھلکھلاتی رہی۔ بالآخر ساڑھے دس بجے بولی۔

"Ok jentlemen, visitors hours are over now"

یعنی مریضوں کے لواحقین کے لیے مخصوص وقت ختم ہو چکا ہے۔

یہ مخصوص وقت 10 بجے تک تھا اور اب ساڑھے دس ہو چکے تھے۔ یقیناً اُسے ڈیوٹی کا احساس بھی تھا۔ ہم سوری کہہ کر چلنے لگے تو ذرا دھیمے لہجے میں مجھ سے بولی

"You have a sharp and killing tongue, See you tomorrow"

''تم ایک تیز اور مار دینے والی زبان رکھتے ہو، کل ملیں گے''

یہ فقرے انکل نے بھی سن لیے اور اُن کی آنکھیں بلنک **(BLINK)** کرنے لگیں۔ ہم راستے میں بھی اُسی کی باتیں کرتے رہے۔ میرے دوست کا خیال تھا کہ میں نے اپنا مشہور عالم ''مکڑی جادو'' اُس کے گرد بکھیر دیا ہے۔ اب اُس کے لیے دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ گھر پہنچ کر ہم جلدی سونے کی کوشش کرنے لگے کہ صبح 8 سے 8 بارہ گھنٹے ڈیوٹی کرنا تھی۔

رات دو بجے کا ٹائم تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف انکل کا ایک دوست تھا جس نے بتایا کہ انکل کو ہسپتال میں کوئی دورہ پڑا ہے اور وہ فوراً وہاں جا رہا ہے، کیونکہ میرے دوست کے آنے سے پہلے انکل کے وہ دوست اُن کے نگہبان تھے اس لیے ہسپتال کے ریکارڈ میں اُنہی کا نمبر تھا اور اُنہی کو اطلاع دی گئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہسپتال جا کر حالات کا پتہ کر کے فون کریں گے۔ اب نیند کِسے آئے؟ ہم بیٹھے تبصرہ کرتے رہے کہ ملاقات کے وقت تو بالکل ٹھیک بلکہ انتہائی خوشگوار موڈ میں تھے۔ پتہ نہیں اچانک کیا ہوا ہے؟ سمجھ سے باہر بات تھی۔

صبح چار بجے کے قریب اُس کا فون آیا کہ یار! پتہ نہیں چل رہا کیا بات ہے۔ غالباً کوئی خواب وغیرہ دیکھ لیا ہے جس کے شدید ترین اثرات ہیں اور اُسے حقیقت سمجھے جا رہے ہیں۔ ایک ہی رَٹ ہے کہ جاوید اور چوہدری پتر (میرا دوست) نے ہسپتال سے نرس اغوا کر لی ہے اور اُسے (Rape) کر کے مار دیا ہے۔ اب انہیں پولیس گرفتار کر لے گی اور اُن کی ساری عمر جیل میں کٹ جائے گی۔ یہاں کی پولیس بہت تیز ہے۔ اُن کے پاس صرف چند گھنٹے ہیں۔ انہیں کہو کہ پاکستان بھاگ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی روئے جا رہے ہیں کہ ہائے میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ جاوید نے ہی اُس نرس سے یاری لگائی تھی۔ اُس نے ہی میرے بیٹے کو خراب کیا ہے۔ وہ قاتل ہے قاتل۔ ہائے میرا معصوم پُتر، وہ تو خوامخواہ پھنس گیا۔ بُری صحبت اُسے بھی لے ڈوبی وغیرہ وغیرہ۔

انہوں نے بتایا کہ وہ انجیکشن بھی نہیں لگوا رہے تھے کہ تم مجھے بے ہوش کر کے میرے بیٹے کو گرفتار کر لو گے۔ بڑی مشکل سے ڈیوٹی ڈاکٹر نے انجیکشن لگایا ہے اور اب سو رہے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اب 8 گھنٹے بعد یعنی صبح 11 بجے ہوش آئے گا۔ ہم نے انہیں درخواست کی کہ رات تو اُن کی ضائع ہو ہی گئی ہے، جس کے لیے معذرت، مگر برائے مہربانی وہ ہمارے پاس آ جائیں تا کہ اگلا پروگرام ترتیب دیا جا سکے۔ وہ آدھے گھنٹے میں تشریف لے آئے۔ اُن کے آنے سے پہلے بات کافی حد تک میری سمجھ میں آ چکی تھی اور میں چوہدری سے بھی ڈسکس کر چکا تھا۔ ہمارے خیال میں ہوا یوں تھا کہ ٹی وی پر ریپ (Rape) کی مووی دیکھنا، میرا نرس کو بلانا، اُس کی میرے ساتھ بے تکلفی اور آخر میں اُس کے الفاظ کہ میری زبان ''قاتل'' ہے۔ ساتھ ساتھ یہ احساس کہ اُس کا بیٹا بھی میرے ساتھ رہ کر میرے جیسا فلرٹ ہو جائے گا۔ اِس سب نے مِل جُل کر ایک خواب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جو بیٹے کے ساتھ پیار کی وجہ سے انتہائی شِدت سے اثر انداز ہوئی تھی۔ ذہنی کمزوری تو پہلے ہی تھی سو یہ بھیانک صورتِ حال سامنے آ گئی۔

اُن صاحب کی آمد پر پتا چلا کہ وہ یہ سب چیخ وپکار پنجابی مین کرر ہے تھے۔ہم نے اُن کے علم میں تمام باتیں لاکر اپنی فائنڈنگز (Findings) اُن کے سامنے رکھیں جن کے ساتھ انہوں نے مکمل اتفاق کیا۔اب سوچ بچار شروع ہوئی کہ اُن کے ہوش میں آنے پر کیا کیا جائے۔یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد انکل یہ باتیں بھول چکے ہوں،لیکن اگر انہیں یاد رہتی ہیں تو کیا کیا جائے؟ کافی بحث ومباحثہ کے بعد درج ذیل نکات طے ہوئے۔

(1) پہلے یہ صاحب انکل کے ہوش آنے پر انہیں ملیں گے۔اگر وہ بھول چکے ہوں تو ٹھیک ورنہ یہ انہیں بتائیں گے کہ رات جو واقعہ ہوا تھا، وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا،مگر نرس کو مرنے سے بچالیا گیا ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہے۔جاوید (یعنی میں) اُس کے ساتھ رابطے کی اور بارگینگ (Bargaining) کی کوشش کرر ہا ہے۔

(2) پھر یہ صاحب انکل کے ردِّعمل کی اطلاع ہمیں دیں گے۔انکل کے مثبت ردِّعمل کی صورت میں واپس جا کر انکل کو بتائیں گے کہ آل ڈن ناؤ (All Done Now) اور یہ کہ جاوید آپ کو ملنے آرہا ہے۔بوتھ آر سیف ناؤ (Both are safe now)۔یعنی میں اور چوہدری (دوست) محفوظ ہیں۔

(3) پھر میرا کردار تھا کہ میں نے انہیں کیسے مطمئن کرنا ہے اور رات کو دوست کی اور اُس نرس کی انکل سے ملاقات تھی،مگر بنیادی نکتہ یہی تھا کہ انہیں جھٹلایا نہ جائے۔

اگلے دن ہوش آنے پر انکل کو سب یاد تھا اور وہ اُسے حقیقت ہی سمجھ رہے تھے۔اُن صاحب نے حسبِ پروگرام سب بتایا تو وہ ایک دم ریلیف ہوگئے اور کہنے لگے

''اچھا بچ گئی ہے؟ اوہ ٹھیک ہے؟ اب جاوید اُس سے نمٹ لے گا۔وہ بہت چلتا پُرزہ ہے اور ویسے بھی وہ گشتی تو اُس پہ ریجھ گئی تھی۔جاوید سے کہو بلیک میل نہ ہو،مناسب رقم مانگے تو دے ورنہ کورٹ میں دیکھ لیں گے۔اب اتنا اندھیر بھی نہیں ہے۔میں خود گواہی دوں گا،لیکن وہ چوہدری پتر؟ ٹھیک ہے جاوید سے کہو جو مانگتی ہے دیکر ہر حال میں اُس سے صلح کرلے''

اسی طرح کی بھی کچھ بھی کچھ قسم کی باتیں انھوں نے کیں، مگر مجموعی طور پر یہ صورتِ حال حوصلہ افزا تھی۔ ہمیں رپورٹ دینے کے بعد اُن صاحب کی اگلی ڈیوٹی یہ تھی کہ انہیں واپس جا کر بتانا تھا کہ (All done safely)، کیونکہ وہ انہیں کہہ کر آئے تھے کہ وہ صورت حال کا فون پر پتہ کر کے بتاتے ہیں۔ واپس جا کر انہوں نے انکل کو وہی رپورٹ دی اور بتایا کہ جاوید آپ سے دو بجے والے وزٹرز آورز میں ملنے آئے گا۔

جب میں ملنے گیا تو وہ کافی مطمئن تھے۔ پوچھنے لگے

''کتنے میں ڈن ہوا؟''

میں نے انہیں بتایا

''ایسے ہی مکر کر رہی تھی۔ خود ہی تو ہمارے ساتھ گئی تھی اور چوہدری نے تو اُسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ سستی جان چھوٹ گئی ہے۔ چوہدری کو میں نے احتیاطاً لندن بھیج دیا تھا۔ اُسے کال کر دی ہے۔ رات کو ملاقات ہوگی اور رات کو وہ فراڈن بھی ڈیوٹی پر ہی ہوگی''

میں آنے لگا تو وہ دھیمے سے کہنے لگے

''زوردار تھی ناں''؟

رات کو میں اور دوست جب ملنے گئے تو میں نے کمرہ میں جانے سے پہلے ہی نرس سے چند منٹ مانگ لیے۔ میں نے ویٹنگ روم میں بیٹھ کر کافی کے کپ کے ساتھ اُسے کل کی ساری اصل صورتِ حال بتائی، کیونکہ رات وہ ڈیوٹی پر تھی اور اُس نے یہ ساری کاروائی ڈیوٹی ڈاکٹر اور دوسرے عملے کے ساتھ مل کر بھگتی تھی اس لیے وہ یہ سب سن کر حیران رہ گئی اور ساتھ ہی شرم سے لال ہو کر بولی

"Oh man, he is an abnormal guy"

بہر حال میری درخواست پر جب وہ ہمارے بیٹھنے کے بعد انکل کے کمرے میں آئی تو ہاتھ میں کافی کے کپ بھی تھے اور اُس کا چہرہ ابھی تک سرخ تھا۔ کافی پینے کے دوران نارمل گپ شپ کے بعد وہ برتن لے جاتے ہوئے حسبِ درخواست انکل کو سنانے کے لیے بولی

"Look boy, Donot did it again as you did yesterday.

Just give me a phone call. I shall be there"

''دیکھ لڑکے! کل جیسی حرکت دوبارہ نہ کرنا۔ صرف مجھے فون کر دینا میں وہاں آجاؤں گی''

یہ الفاظ نہ صرف انکل کو مطمئن کرنے کو کافی تھے کہ **(All done safely)** بلکہ اُن میں ایک دعوت بھی پنہاں تھی۔

☞ ☞ ☞

ایسے میں کوئی دھم سے جو آ جائے تو کیا ہو

میرا دوست اور میں کاؤنٹر کے پیچھے کسٹمرز ڈیل(Deal) کر رہے تھے کہ سٹور کے باہر سرخ رنگ کی چمکتی ہوئی فورڈ سپورٹس ماڈل گاڑی رکی۔ اُس میں سے انتہائی سفید جلد کی حامل خاتون برآمد ہوئی، اُس نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا تو اُس میں سے ایک بہت بڑی جسامت کا کتّا برآمد ہوا جسے لے کر وہ سٹور کے دروازے کی طرف بڑھی تو میرا دوست بولا:

''لو یہ مصیبت پھر آ گئی''

''کون ہے یہ''

''یار وہی، میرے باپ کی سابقہ بیوی اور محبوبہ جس کا میں نے تمہیں بتایا تھا۔''

خاتون نے اندر آ کر ہم پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے کتے سے بولیں

(Hidie, Go to your corner and tell me what you want today.)

یعنی ''ہائیڈی اپنے کونے کی طرف جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ آج تمہیں کس چیز کی خواہش ہے۔''

وہ شیر جیسا کُتا فوراً پیٹ فوڈ(Pet Food) کے کارنر کی طرف بھاگا اور ڈاگ سٹکس (Dog Sticks) کے پاس اگلی ٹانگیں اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ میڈم نے فوراً وہاں سے

(Dog Sticks) کا پیکٹ اُٹھا کر پھاڑا اور ایک دو کتے کے منہ میں دے دیں اور بولیں۔"Stay Here" یعنی یہاں ہی رُکو۔

کسٹمرز شاید سبھی اُسے جانتے تھے اور اُس کے کتے کو بھی۔ اُس کی اُن کے ساتھ ہیلو ہائے جاری ہوگئی۔ کوئی بھی کتے سے خوفزدہ نہ تھا بلکہ کچھ تو اُس کے سر کو ہاتھ لگا کر اُسے پیار کر رہے تھے۔ خاتون نے باسکٹ اُٹھا کر چیزیں اُس میں رکھنا شروع کر دیں۔

''اَج پھیر پنجاواں دی ٹھک گئی'' یعنی آج پھر پچاس کا نقصان ہوگیا۔ یہ میرے دوست کی بڑبڑاہٹ تھی۔ خاتون نے تقریباً آدھا گھنٹا صرف کیا اور پسند کی چیزیں لے کر دندناتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی تو میں کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا اور بولا: ''ہائے''

یس............؟ اُس نے مجھے گھورا۔

کیا یہ تعارف کا مناسب وقت نہیں ہے؟

(Is'nt a good time for introduction?)

''تم کون ہو۔''؟(Who are you)۔ اُس نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا

نیا مینجر اور اصل میں ایک خاندانی دوست

(New Manager and actually a family friend)

(Never see you before, but what do you want?)

پہلے کبھی نہیں دیکھا تمہیں، اُس نے تبصرہ کیا اور ساتھ ہی سوال تھا کہ ''کیا چاہتے ہو۔''

''صرف تعارف اور تھوڑی سی گفتگو''

"Just introduction and a little chat"

''او کے'' اتنا کہہ کر وہ ہمارے کاؤنٹر کے ساتھ بغلی دروازے کی طرف چل پڑی۔ اُسے خود ہی سارا پتا تھا کہ کہاں بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اِس دوران اُس کا کُتّا جارحانہ انداز میں دو تین دفعہ ہولے سے غُرّا چکا تھا اور اُسکی غصیلی نظریں مسلسل مجھ پر تھیں جس نے اُس کی مالکن کا رستہ کھوٹا کیا تھا۔

جان دینا سی ایسی مصیبت لوں" میرا دوست بڑبڑایا۔

ہم اندر جا کر بیٹھ گئے۔ یہ راہداری تھی جو کافی بڑی تھی۔اُس سے سیڑھیاں اوپر فلیٹ میں جاتی تھیں اور یہ حصہ سٹور روم(Store Room)،سٹنگ روم(Sitting Room) اور سموکنگ روم (Smoking Room) کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور اس کا ایک دروازہ مین سٹور میں کھلتا تھا۔

''میں خان ہوں'' میں نے ابتداء کی اور ہاتھ بڑھایا۔

''ہیلن'' اُس نے جواباً گرمجوشی سے مصافحہ کیا تو کتا جیسے ایکدم شانت ہو گیا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔

ہائیڈی!ابھی نہیں "Hidie! Not yet"اس نے اُسے روکا

یہ اُس کے ساتھ گفتگو کی ابتداء تھی۔اُس نے بتایا کہ وہ انکل (دوست کے والد) کی سابقہ بیوی ہے جسے اُس نے چند ماہ قبل کورٹ کے باہر طلاق کے وقت 30 ہزار پونڈ دیے تھے اور 30 ہزار پونڈ مزید ایک ماہ میں دینے کا وعدہ کیا تھا۔اُس نے پرانی رفاقتوں کے طفیل اُس کے وعدے پر اعتبار کر لیا تھا اور کورٹ میں بیان دے کر طلاق کی کاروائی نمٹا دی تھی،لیکن اب کئی ماہ سے انکل اُسے ٹرخائے جا رہے تھے۔

''لیکن کیا یہ ایک غیر معقول رویہ نہیں ہے''

"But is it not an unreasonable Behaviour"

میں بول پڑا۔

"How"''کِس طرح'' اُس نے بے ساختہ کہا۔

اُس نے بتایا کہ اُس نے اور انکل نے جب یہ سٹور خریدا تو زیادہ رقم اور بینک ہسٹری اُس کی تھی۔اُس وقت یہ سٹور ایسا نہیں تھا جیسا اب ہے،بہت خراب حالت میں اور تقریباً خالی تھا۔اِس

کے اوپر یہ فلیٹ بھی رہائش کے لیے نہ تھا۔ ایک چھڑ بتی قسم کا سایہ تھا اور وہ دونوں میاں بیوی رہائش کا کرایہ بچانے کے لیے شدید سردی میں اُس چھڑ بتی کے نیچے کئی کئی کمبل اوڑھ کر گزارہ کرتے تھے یا کوئی سٹور میں کونا ڈھونڈتے تھے، کیونکہ سٹور میں رہائش قانوناً ممنوع تھی، اس لیے بہت مشکل تھی۔

اردگرد کئی سٹور گوروں کے تھے اور وہ انکل سے بُغض محسوس کرتے تھے، کیونکہ یہ کوئی بڑا شہر تو ہے نہیں ایک قصبہ ہے۔ اُس نے انکل کے ساتھ مل کر شدید محنت کی، تعلقات استعمال کیے، نسل کا فائدہ اُٹھایا، مخالفتوں کا سامنا کیا۔ بالآخر کامیاب ہوگئے۔ آف لائسنس (شراب کی فروخت کا اجازت نامہ) بہت مشکل سے حاصل کیا اور پھر ترقی شروع ہوئی۔ سٹور کے اوپر پہلے ایک کمرے کا فلیٹ بنوایا اور اب تین کمروں کا فلیٹ ہے۔ اتنا بڑا ابھرا پُرا سٹور ہے۔ اس سب میں میری محنت، میرا خون شامل ہے۔ اس پہ میرا حق ہے اور ویسے بھی میری 30 ہزار پونڈ کی رقم اب بھی ڈیو (Dew) ہے۔ تو بتاؤ میں کیا غلط کر رہی ہوں............؟

اُس کا مؤقف انتہائی مضبوط تھا۔ اور وہ اگر دوبارہ کورٹ میں چلی جاتی تو انکل کے لیے اور ہمارے لیے خاصی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں، لیکن وہ اب بھی نرم گوشہ رکھتی تھی اور اِس سٹور پر تالے لگتے دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ اُس نے بتایا کہ اوپر ایک کمرہ اُس کے قبضہ میں ہے اور اُس میں اُس کا سامان ہے، لیکن وہ میرے دوست کے ساتھ ایڈجسٹ منٹ محسوس نہیں کرتی اس لیے ایک سہیلی کے ساتھ رہائش شیئر (Share) کر رہی ہے۔ میں نے کہا "اس سب کے باوجود، اِن حالات میں جبکہ انکل ہسپتال میں پڑے ہیں، بزنس کرائسس (Cricis) میں ہے۔ اُس کا رویہ فرینڈلی ہو تو یہ چیزیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں جو وہ لے جا رہی ہے۔"

اُس کے ساتھ یہ گفتگو خاصی مفید رہی۔ اُس کا کتا اوپر جانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا، اُس نے مجھ سے اوپر فلیٹ میں جانے کی اور اپنا کمرہ چیک کرنے کی رسماً اجازت لی اور کتے کے ساتھ اوپر چلی گئی۔ میرے دوست نے اِس پر خاصی ناگواری کا اظہار کیا اور کہا کہ بمشکل تو اِس

سے جان چھوٹی تھی۔ ڈیڈی بھی بے ہوشی کے دوران اِسی کو پکارتے تھے اور اب بھی کبھی کہتے ہیں کہ اُسے ملا دو۔ میں نے اُسے اُس کا سارا موٴقف سمجھایا اور ساتھ اپنے خدشات کا اظہار کیا تو وہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ اُسے اِن سب باتوں کا پتا تو تھا، مگر مشکلات کا ادراک نہیں تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ دوسرے تیسرے دن ایسا ہی کرتی ہے اور سامان وغیرہ بلا قیمت لے جاتی ہے اور بعض مرتبہ تو 40-50 پونڈ دستی مانگ لیتی ہے اور زبردستی لے کر جاتی ہے۔

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ وہ نیچے آئی۔ پہلے اُس نے جو سامان باسکٹ میں ڈال رکھا تھا اُسے واپس اُس کی جگہ پر رکھا۔ کافی کی شیشی لی۔ دودھ کی بوتل اُٹھائی اور پوچھا

کافی کھان............؟

میں نے کہا ''یس پلیز''

پھر میرے دوست سے بولی ''اینڈ یو سلّی بوائے''

تو اُس نے بھی سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کو کافی بنا کر دے گئی اور کہا کہ اُس نے ہمارے لیے انکل کی پسندیدہ دودھ والی کافی بنائی ہے۔ کیا ٹھیک کیا ہے......؟ میں نے ''فائن'' کہا تو دوبارہ اوپر چلی گئی۔

اُسے اوپر فلیٹ میں گئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اوپر چیزیں گھسیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد ہوور **(Hover)** چلنے لگا تو میرا دوست بولا

''یار یہ گوری کیا کر رہی ہے۔''

''ہمارے کمرے تو لاک ہیں۔ تو پھر کیا پرابلم ہے''

تقریباً گھنٹہ بھر بعد وہ نیچے آئی تو پرانے کپڑوں میں تھی اور بالوں میں ہلکی سی گرد تھی۔ کہنے لگی:

''اگر تم پسند کرو تو اپنے کمروں کی چابیاں دے دو تا کہ صفائی کر لوں۔ تم لوگوں نے تو فلیٹ کو بہت گندا رکھا ہوا ہے''

میں نے دوست کی طرف دیکھا تو وہ چپ رہا۔ تب میں نے اُسے کہا

''چلو آؤ میں بھی تمہاری مدد کرتا ہوں'' اور کاؤنٹر کے پیچھے سے باہر آنے لگا تو وہ ہنس کر بولی

''مسٹر خان! بےفکر رہو، ہر چیز محفوظ رہے گی۔ میں ذرا اور طرح کی عورت ہوں''

میں نے شرمندہ سا ہو کر چابیاں اُس کے حوالے کر دیں۔ مجھے پتا تھا کہ اوپر سرہانے کے نیچے میرا بٹوہ ہے جس میں 235 پونڈ ہیں، اس کے علاوہ ایسی کوئی چیز نہ تھی، لیکن میں نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد نیچے آ کر اُس نے چابیاں ہمارے حوالے کیں اور سٹور سے چنوں کے دو سیل بند ڈبے لے کر اوپر چلی گئی۔ دوبارہ کافی دیر بعد نیچے آئی تو نہا دھو کر فریش ہو چکی تھی اور ہاتھ میں کافی کا کپ تھا۔ بے تکلفی سے کاؤنٹر کے پیچھے آ گئی اور کہنے لگی۔

''تم لوگوں نے فلیٹ کتنا گندا کر رکھا تھا، میں نے صاف کر دیا ہے۔ تمہارے استعمال شدہ کپڑے مشین میں ڈال دیے ہیں۔ کئی ایک کی جیبوں میں پیسے اور کاغذ تھے وہ تمہارے مُتعلقہ بستروں کے کونے میں رکھ دیے ہیں، بائی دا وے (By the way) تم کھاتے کیا ہو؟ وہاں تو کچھ بھی کھانے کو نہیں ہے۔ میں نے فی الحال چنے پکا دیے ہیں، بریڈ کے ساتھ استعمال کر لینا''

میں نے شکریہ ادا کیا تو ہنس کر بولی

''اب میں فرینڈلی بی ہیو (Behave) کر رہی ہوں ناں؟'' پھر میرے جواب دینے سے قبل ہی بولی، ''خان! تمہاری رقم محفوظ ہے'' میں نے کہا

''ڈونٹ بی سلّی میم، اگر ایسا خیال ہوتا تو چابیاں تمہارے ہاتھ میں کیوں جاتیں؟''

اس دوران ہماری دونوں ملازمائیں چھوٹی ہیلن اور ڈیبی اُسے کاؤنٹر کے پیچھے ہمارے ساتھ دوستانہ انداز میں کھڑے دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ ہائیڈی (کتا) بغلی دروازے میں چوکنا بیٹھا تھا۔ آتے جاتے گاہک بھی اُس سے ہیلو ہائے کر رہے تھے، کئی ایک کو وہ میرے والی ٹِل سے سرو (Serve) کر چکی تھی۔ کئی ایک نے پوچھا۔

''میم بیک اگین'' (Mamm! back again) تو اُس نے کہا "Not yet"۔

آدھے گھنٹے بعد جاتے ہوئے بولی

''کل یا پرسوں آؤں گی اور تمہارا فلیٹ مکمل فکس (Fix) کردونگی۔''

ہم نے رات کو اوپر جا کر دیکھا تو فلیٹ پہچانا نہیں جارہا تھا۔ میرا دوست حیران تھا کہ میں نے آدھے گھنٹے کی گفتگو میں اُس رِچھنی (بقول اُس کے) کو کیسے قابو کیا۔ میں نے اُسے بتایا

''لگتا ہے وہ تمہارے اور انکل کے رویہ کی وجہ سے Reaction دے رہی تھی۔ میں نے اُسے انکل کی بیماری اور تمہاری مشکلات کا حوالہ دے کر دوستانہ رویہ کی درخواست کی تھی''

باتوں سے پتا چلا کہ باپ کی دوری کا قصوروار اُس گوری کو سمجھتے ہوئے میرے دوست کا رویہ واقع اُس کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ پھر باپ کا بیماری اور بے ہوشی میں بھی اُس کو پکارنا اُسے بُری طرح محسوس ہوتا تھا۔ گو کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا، مگر اپنے رویہ سے اُس نے اُسے یہی باور کروایا تھا کہ 'پیچھا چھوڑ و'۔ اُس نے مجھ سے بھی اِسی خدشے کا اظہار کیا کہ اِس کا یہ آنا جانا اُس کے باپ کو پھر اُس کی طرف مُلتفت نہ کردے۔ میں نے کہا

''دیکھیں گے آگے کیا ہوتا ہے، لیکن اس وقت تو اُسے کول ڈاؤن (Cool Down) رکھنا ضروری ہے''

دوبارہ وہ ایک دن چھوڑ کر آئی اور آتے ہی ہیلو ہائے کے بعد کاؤنٹر کے پیچھے آ گئی۔ اُس کا کتا بغلی دروازے میں اندر کی طرف جا بیٹھا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ اُس کی مخصوص جگہ ہے جس سے وہ کاؤنٹر پر نظر رکھتا ہے اور چند ایک بار ولگر (Vulgar) قسم کے کسٹمرز کیخلاف اُس نے انکل کی باقاعدہ مدد بھی کی تھی۔ ہم سے پوچھنے لگی کہ ہم کھاتے پیتے کیسے ہیں۔ جب اُسے بتایا کہ کبھی دوکان سے ایگ، بریڈ اور جوس اور کبھی بازار سے فش اینڈ چپس، پیزا اور ویجی ٹیبل برگر وغیرہ لے آتے ہیں تو کہنے لگی، خان! آؤ چلیں، مجھے پتا ہے کہاں سے حلال گوشت ملتا ہے۔ میں نے

دوست کی طرف دیکھا تو اُس نے آمادگی سے سر ہلایا کہ جاؤ میں سنبھال لوں گا۔ میں اُس کے ساتھ اُس کی فورڈ سپورٹس میں بیٹھ گیا۔ اُس نے گاڑی پٹرول پمپ پر روکی تو میں بھی اُس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اُس نے نوزل ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ میں نے کہا

''اسے چھوڑ دو، فل ہو کر رُک جائیگی''

وہ بولی ''میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے، میں نے صرف 5 پونڈ کا پٹرول ڈالنا ہے''

میں نے نوزل اُس سے لے کر فکس کر دی۔ تقریباً 20 پونڈ پر جا کر نوزل نے کلک کیا اور میں نے جا کر پے منٹ کر دی اور اُسے کہا کہ یہ ایک دوست کی طرف سے ہے۔ کچھ پینا ہے تو لے لو۔ اُس نے دو کوک کے کین اور پوٹیٹو چپس (Potato Chips) کا ایک پیکٹ پکڑ لیا۔

وہ مجھے 35-30 میل دور ویلز کے دارالحکومت کارڈف (Cardif) میں لے آئی۔ وہاں ہم نے ایک ٹرکش ریستوران میں لنچ کیا، حلال میٹ، چکن، بیف، قیمہ، کچھ سبزیاں، گھی اور مصالحے وغیرہ خریدے اور تقریباً 3 گھنٹے بعد واپس پہنچے۔ اب اُس کا رویہ انتہائی دوستانہ ہو چکا تھا۔ واپس سٹور پر پہنچ کر بولی

"Ok Khan, You may do your job and I am going to do mine."

''اچھا خان! تم اپنا کام کرو اور میں اپنا کرتی ہوں''

شام کو ہم نے سٹور بند کیا تو وہ ہمارے کپڑے دھو کر ریڈی ایٹر (Radiator) پر ڈال چکی تھی۔ تین قسم کے کھانے تیار تھے۔ فلیٹ شیشے کی طرح چمک رہا تھا اور وہ نہا دھو کر اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ہائیڈی اُس کے کمرے کے باہر پہرہ دے رہا تھا۔ اُس نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔ باقی کھانے ہمارے آئندہ استعمال کے لیے فریج میں رکھے اور آئندہ جلد آنے کا کہہ کر یہ جا وہ جا، ہم نے چونکہ ہسپتال جانا تھا اس لیے ہم بھی اُسکے ساتھ نکل پڑے۔

دو دن بعد آ کر اُس نے ہمارے تمام کپڑے پریس کر دیئے۔ اِسی طرح اُس کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ اُس کا رویہ میرے ساتھ انتہائی دوستانہ تھا۔ جب بھی آنا، دن ہمارے ساتھ گزارنا اور چلی جانا۔ ایک دن میرا دوست کہنے لگا

''یار! تمہیں معلوم ہے یہ میری دو نمبر والدہ ہے یہ جیسے تم پر مہربان ہے مجھے تو بات کچھ اور محسوس ہو رہی ہے۔ اب ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق تو نہیں، مگر پاکستان جا کر یہ نہ کہتے پھرنا کہ مَیں نے اِس کی ماں............''

اس کے ساتھ ہی وہ ہنس دیا۔ میں نے اُس سے کہا

''تمہیں معلوم تو ہے میرے ساتھ اُس کے تعلقات عام قسم کے ہیں اور پھر اُس کا تو اب ایک بوائے فرینڈ بھی ہے۔ وہی جس کے دونوں بازوؤں پر ٹاٹو (Tattoo) اور کان میں بالی ہے''

اُس نے کہا ''یہ تو ہے، مگر میں نے تو حالات دیکھتے ہوئے احتیاطاً کہا ہے۔''

کچھ دن بعد میرا دوست اور اُس کا والد پاکستان جا رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے تجویز دی تھی کہ انکل شاید پاکستان کے گرم موسم اور فیملی میں رہ کر جلدی ریکور (Recover) کریں گے۔ ویسے بھی میرے دوست کا ویزہ ختم ہو رہا تھا۔ سٹور بھی پرابلم میں جا رہا تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی محکمہ کا چھاپا، انکوائری۔ کبھی فوڈ (Food) والے آ کر چیزوں کی ایکسپائری چیک کرتے تو وہاں سے ایک آدھ ایکسپائر (Expire) چیز نکل آتی، حالانکہ میں خود اپنی نگرانی میں دونوں ملازم لڑکیوں ہیلن اور ڈیبی سے روزانہ چیکنگ کرواتا تھا۔ اسی طرح کبھی جو لڑکے اور لڑکیاں شکل سے زائد عمر کے نظر نہ آتے، وہ سگریٹ یا شراب خریدنے کے لیے آ جاتے (انگلینڈ میں شراب کی خرید کے لیے 18 سال اور سگریٹ کے لیے 16 سال عمر ہونا ضروری ہے)۔ ناں کی صورت میں ہنگامہ کرنے کی کوشش کرتے یا پھر بڑی بہن یا بھائی کی آئی ڈی دکھا کر سگریٹ یا شراب خریدنے کے لیے کوشش کرتے اور اُسی وقت چیکنگ والے آ جاتے۔ یوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی منظّم سازش ہو رہی ہے۔

اِسی طرح مجھ سے پہلے جو منیجر تھا اُس نے میری آمد کے چند دن بعد ہی میرے دوست کو مجھ پر الزام تراشی کے ذریعے مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ اُس کی جاب پکی رہے۔ میرا دوست ایک چالاک آدمی تھا۔ اُس نے خاموشی سے حالات کا جائزہ لیا، تحقیق کی اور اُس آدمی کی چھٹی کردی، لیکن یہ بات مجھے کافی بعد میں بتائی۔ جو آدمی کیش اینڈ کیری کر کے لاتا تھا، دوست کے ہوتے ہوئے میں اُس کے ساتھ جانے لگا۔ ان لوڈ نگ (Unloading) کے وقت میں نے ملازماؤں کو کہا کہ جو چیز لے کر اندر آؤ مجھے ٹک (Tick) کروا کر رکھو، وہ چونکہ وین سے ان لوڈ نگ کروا رہا تھا اس لیے اُسے اِس چیکنگ (Checking) کا پتا نہ چلا۔ جس وقت اُس نے وین بند کی اور اندر آ کر ''آل ڈن'' کہا تو میں نے دیکھا کہ تقریباً 230 پونڈ کا مال شارٹ ہے۔ میں نے جا کر آہستہ سے لڑکیوں سے انکوائری کی تو انہوں نے بتایا کہ وین تو بالکل خالی ہے۔ خیر وہ چلا گیا تو میں نے دوست کو ساری بات بتائی۔ اُس نے کہا

''تم ساتھ تو تھے''

''لیکن سمجھ نہیں آئی یہ مال کہاں چلا گیا''

تقریباً 3000 پونڈ کی ڈلیوری تھی۔ دوبارہ چیکنگ ہوئی، مگر بات وہی تھی۔ بالآخر میں نے کیش اینڈ کیری فون کیا اور اُن سے انکوائری کی تو پتہ چلا کہ وہ صاحب اس مال کی ایک فل ٹرالی وہاں چھوڑ آئے تھے اور سپروائزر کو کہہ آئے تھے کہ چونکہ وین میں جگہ نہیں ہے، اس لیے وہ دوبارہ آ کر لے جائیں گے اور اب وہ آ کر اپنی کار میں لاد کر لے جا چکے ہیں۔ سپروائزر نے ناگواری سے بتایا کہ یہ صاحب ہر دفعہ وین کی گنجائش سے زیادہ خریداری کر لیتے ہیں اور بعد میں ہمیں ایک یا دو ٹرالی کی نگرانی رکھنا پڑتی ہے۔

میں نے یہ تمام بات دوست کو بتائی تو وہ پریشان ہو گیا کہ یہ صاحب تو اُس کے باپ کے دوستوں میں سے ہیں، اس کے باوجود وہ انہیں ہر کیش اینڈ کیری (Cash and carry)

والے دن 50 پونڈ دیتا ہے۔ جب سے میرا دوست پاکستان سے آیا تھا اور اُس نے سٹور کا چارج لیا تھا کیش اینڈ کیری یہی صاحب کر رہے تھے۔ ہلکی سی ارد گرد سے تحقیق کی تو ہماری ملازماؤں نے بتایا کہ چیزیں تو ہر دفعہ شارٹ ہوتی ہیں، مگر وہ صاحب یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے تھے کہ وہ کیش اینڈ کیری سے بات کر کے بل سے نکلوا دیں گے۔ ایک ملازمہ سے پتا چلا کہ یہ صاحب اپنے داماد کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا سٹور رکھتے ہیں اور اِسی تجربہ کی بنیاد پر تو وہ ہمارے ہاں کیش اینڈ کیری کر رہے ہیں اور غالباً اِسی کیش اینڈ کیری سے وہ اپنا سٹور بھی چلا رہے تھے۔ اُن سے جب اس ضمن میں بمعہ ثبوت بات کی گئی تو انہوں نے سخت غصہ کیا اور ہمیں وارننگ دی کہ آف لائسنس (Off License) اُن کے نام پر ہے جسے وہ کینسل کروا دیں گے۔ دوسرا یہ کہ اُس کا قرض بھی واپس کیا جائے۔

پتا چلا کہ ہیلن سے علیحدگی کے وقت چونکہ شراب وغیرہ کا لائسنس ہیلن کے نام پر تھا تو انکل نے وہ لائسنس اُس شخص کے نام پر ایشو کروالیا تھا۔ نجانے کیا قانونی مسئلہ تھا کہ انہوں نے اپنے نام پر یہ لائسنس نہ لیا۔ اسی طرح کسی بھی بڑی کیش اینڈ کیری میں ہماری (سٹور کی) کوئی کریڈٹ لائن (Credit Line) نہ تھی۔ کیش مال لینا پڑتا اور ساتھ میں پچھلے بل سے بھی کچھ ادا کرنا پڑتا جو کہ سٹور کے کھاتے میں چڑھے ہوئے تھے۔

میرے پوچھنے پر دوست نے بتایا کہ جس وقت انکل زخمی ہوئے تو سٹور کا کوئی والی وارث نہ رہا۔ اگلے دن انکل کے ایک دوست پولیس آفیسر نے سٹور کھول لیا. اُس کی بیوی اور بیٹی مالک کے طور پر سٹور چلانے لگے۔ انکل کئی دن بے ہوش رہے اور پھر قومہ میں چلے گئے، لیکن پولیس آفیسر کے بقول وہ ہوش میں آئے تھے اور فلاں ڈیوٹی ڈاکٹر کے سامنے انہوں نے اُسے سوال کرنے پر واضع اشارے سے سٹور چلانے کی اجازت دی تھی۔ یوں اُس نے میرے دوست کے ویزہ پراسس (Visa Process) کے وقفہ کے دوران 8-10 ہفتے میں آفرز

(Offers) لگا لگا کر قیمت خرید سے بھی کم پر چیزیں بیچ کر سٹور کو پہلے تقریباً خالی کیا اور بیک سٹاک بھی نکال دیا۔ پھر انکل کی گڈول (Good will) سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کیش اینڈ کیری سے ادھار مال اُٹھایا اور بیچ دیا۔ جس وقت میرا دوست پہنچا تو اُس نے انکل کے وکیل کی مداخلت پر سٹور حوالے کیا، مگر ایک پیسے کا بھی حساب نہ دیا اور معاملات انکل کے ساتھ طے کرنے کا کہا، جو ابھی چونکہ مناسب ذہنی حالت میں نہ تھے اس لیے میرے دوست نے اُنہیں کچھ نہ بتایا۔ یہ پُرانے بل وہی تھے اور اِسی وجہ سے سٹور کے لیے مزید کریڈٹ بند تھا۔ کیش اینڈ کیری کرنے والے صاحب سے 5000 قرض بھی میرے دوست نے سٹور چلانے کے لیے ہی لیا تھا۔ جو وہ اب چوری پکڑے جانے پر مانگ رہا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور مصیبت بھی تھی۔ انکل نے علاقہ کے غریب لوگوں کو سٹور کی طرف متوجہ رکھنے کے لیے کارڈ سکیم چلا رکھی تھی، جس میں کسٹمرز کو کارڈ ایشو کیے جاتے تھے اور پورے سال میں اُن کے پاس جب بھی ایک یا دو پونڈ فالتو ہوتے وہ انکل کے پاس جمع کروا دیتے اور کارڈ پر لکھوا کر دستخط کروا لیتے۔ پھر وہ اپنے یہ کارڈ انکل سے کرسمس پر کیش کرواتے۔ یوں انکل کے پاس رقم ایڈوانس آ جاتی اور کرسمس کی سیل بھی بڑھ جاتی۔ اب ہمیں یہ کارڈ بھی کیش کرنے تھے اور رقم پتا نہیں کہاں تھی۔ کرسمس میں بہت تھوڑے دن رہ گئے تھے۔ ادھر اندازہ ہو چکا تھا کہ چھاپوں وغیرہ کے پیچھے اُس پولیس آفیسر کا ہاتھ ہے تاکہ رننگ اونر (Running Owner) مصیبت میں پڑے اور وہ سٹور پر دوبارہ قبضہ کر سکے۔

یہ حالات تھے جن میں مجھے سٹور کو Manage کرنا تھا اور انہی حالات سے گھبرا کر ہی میرے دوست نے مجھے پاکستان کال کیا تھا۔ میں نے دوست کو سب ڈسکس (Discuss) کر کے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ان حالات میں ہیلن کا ساتھ میرے لیے غنیمت ہوگا۔ تو اُس نے اعتراض نہ کیا۔ میں نے ہیلن کے ساتھ مل کر کیش اینڈ کیری خود کرنا شروع کر دی۔ اُسے دیکھ کر بہت سے کیش اینڈ کیری والے مطمئن ہو گئے اور ہمیں اِس کا کافی فائدہ ہوا۔ یوں ہم نے کرسمس بخیر و عافیت گزار دیا۔

مہرباں کیسے کیسے

میری اور میرے دوست کی محنت سے حالات آہستہ آہستہ قابو میں آ رہے تھے، سردی بے تحاشا بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے خصوصی طور پر شراب کی سیل میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ ہم نے بھی جیسے تیسے کر کے شراب کے سٹاک پر خصوصی توجہ دی تھی، کیونکہ آگے کرسمس اور نیو ائیر بھی آ رہے تھے۔ اس علاقے میں غربت بھی کافی تھی۔ بہت سے لوگوں نے بجلی، فون اور گیس کے ایسے میٹر لگوا رکھے تھے جن میں پیسے ڈالو تو متعلقہ سروس آن ہو جاتی تھی اور رقم کے ختم ہونے پر سروس فوری ڈس کنکٹ (Disconnect) ہو جاتی۔ مثلاً آدھی رات کو گیس کے پیسے ختم ہو گئے، سروس بند ہو گئی۔ گھر میں پیسے بھی نہیں ہیں۔ گیس کی سپلائی بند ہونے سے "Radiator" وغیرہ بھی بند ہو گئے۔ اب ساری رات بیچاروں کی سردی میں کانپتے گزرتی۔ بعض لوگ صبح ہوتے ہی ڈیبٹ کارڈ (Debit Card) لے کر کیش مشین کی طرف بھاگتے کہ شاید کچھ ریندھ کھوند نکل آئے اور کچھ گھر سے "Pennies" اکٹھی کر کے ہماری طرف بھاگتے کہ تھوڑی بہت برانڈی خرید کر نمونیا سے بچیں۔ کئی ایک لوگوں کے پاس مطلوبہ شراب کی رقم سے کم پیسے ہوتے تو میں اکثر ان کے ساتھ زبانی ادھار کر لیتا، کیونکہ یہ بیچارے شرابی نہیں ہوتے تھے۔ شراب اُن کے لیے دوائی کی طرح (Life Saving Product) زندگی بچانے کی چیز ہوتی تھی۔ اس ادھار کی کم کم ہی واپسی ہوتی تھی، مگر مجھے اس کا افسوس نہیں ہوتا تھا کہ میری سیل

کبھی بھی لاگت سے کم پر نہیں ہوتی تھی۔ یوں ایسے لوگ خصوصاً میری ٹِل (Till) کا رُخ کرتے اور دھیمی اور مُلتجی آواز میں مجھے اپنا مسئلہ بتاتے۔ مثلاً (Boss,90P are short Please) یعنی میرے پاس 90 پنس کم ہیں اور میں اُسی رازداری سے انہیں Accommodate کر دیتا، وہ سمجھتے کہ میں نے بگ باس (میرا دوست جو کہ ساتھ والی ٹل پر ہوتا) سے چوری اُنہیں Favour دی ہے۔

جونہی ہم سٹور کے اوپر واقع فلیٹ سے اندر ہی اندر نیچے اُترتے، الارم آف کرتے اور سٹور کے دروازے کھولتے، سٹور کی دیوار کے ساتھ لوگوں کی ایک لائن ہوتی جن میں سب سے آگے ہماری دونوں ملازمائیں، انڈے، دودھ اور بریڈ کی سپلائی دینے والے لوگ اور ساتھ ساتھ رات سردی کے ستائے ہوئے کسٹمرز کی لائن ہوتی جو زیادہ تر انڈے، دودھ، بریڈ اور یا پھر برانڈی کے گاہک ہوتے۔ بوڑھے لوگوں کے پاس اکثر پیسے کم ہوتے، میں انہیں فیور دیتا اور ساتھ ساتھ کسی ناگواری کے بغیر میری چرب زبانی جاری رہتی جس میں عام طور پر اُن سے اظہارِ ہمدردی ہوتا۔ بوڑھے متانت سے شکریہ کہتے اور بوڑھیاں زیادہ تر ماتھے اور گال (رخسار) پر بوسے لیتیں اور دعائیں دیتے ہوئے شکریہ کہتیں۔ شاید بوسا ہی اُن کے لیے ہر عمر میں جذبات کے بہترین اظہار کا طریقہ تھا۔ کئی ستم ظریف لڑکیاں جان بوجھ کر کچھ رقم کم دیتیں اور میرے احسان کے بدلے میں ہونٹوں کا پیالہ سا بنا کر کاؤنٹر پر جھک آتیں کہ 'لو وصول کرلو'۔ Short رقم بہت کم ہوتی تھی اس لیے میں پرواہ نہ کرتا، مگر رقم زیادہ کم ہوتی تو میں اُسے چھوٹی بوتل تھما دیتا اور کہتا

''باس تھوڑا ٹائٹ ہو گیا ہے اس لیے اسی سے گزارہ کرو۔''

اس طرح ایک فرینڈلی ماحول Create ہو گیا تھا اور یوں میں ریگولیر کسٹمرز میں خاصا مقبول تھا۔

کرسمس کی آمد آمد اور کام کا رش بڑھ جانے کی وجہ سے اب ہمارے پاس دو پارٹ ٹائم ورکر کام کر رہیں تھیں جو صرف ہفتہ اتوار یعنی چھٹی کے دن آتیں۔ یہ دونوں سٹوڈنٹ تھیں، ایک تقریباً 12 سال کی اور دوسری اُس سے سال بھر بڑی تھی۔ دونوں میں سے چھوٹی زیادہ تیز تھی۔ خوبصورتی میں دونوں لاجواب تھیں اور اپنی عمر سے زیادہ Grown up بھی۔ مجھے بے تکلفی سے خان یا باس کہہ کر بلاتیں اور ایسے ایکشن کرتیں کہ اللہ پناہ، مثلاً ایک دن میں نے چھوٹی سے کہا

''تم مجھے انکل کہہ سکتی ہو'' (دراصل میں خود کو اُن کی طرف سے ذہنی طور پر کچھ ریزرو کرنا چاہتا تھا)

تو کہنے لگی، ''کیوں؟ تم انکل تو نہیں ہو، سویٹ ینگ مین ہو''۔ (میں اُس وقت 35-40 سال کا تھا)

''مگر تم تو ابھی بچی ہوناں'' میں نے کہا تو اُس نے سینہ تان کر کچھ اور زور لگایا تو اُس کی شرٹ کے اوپری کھلے ہوئے بٹنوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

''میں تمہیں بچی نظر آتی ہوں۔''

میں نے جلدی سے نظریں پھیر لیں اور کہا

"You are a grown up baby" تو جھلا کر کہنے لگی

''پھر بے بی''؟ ''خان! بچی کہنا ضروری ہے کیا''؟

اسی طرح ایک دن دوسری لڑکی کہنے لگی

''اگر اجازت ہو تو ہم اوپر فلیٹ وغیرہ کی صفائی بھی کر دیا کریں''؟

ہم اُن سے زیادہ تر ہفتے بعد شیلفوں کی صفائی اور چیزوں کی صفائی کا کام ہی لیتے تھے۔ میں نے منع کر دیا کہ اُن کی ہمارے فلیٹ میں آمد و رفت خطرناک تھی۔ ابھی وہ امیچور بچیاں تھیں، مگر ہمارے فلیٹ تک رسائی کے لیے کوشاں تھیں۔ ایک دن یہی لڑکی بولی۔

’’خان پلیز، ہمیں بھی تھوڑی کاک ٹیل چکھادو۔‘‘

’’ارے تم شراب پیتی ہو۔؟تم تو ابھی کم عمر ہو،اور پھر کاک ٹیل کیا ہوتی ہے‘‘ تو تنتنا کر بولی۔

’’خان! بنومت، آنٹی کارلا مما کو بتارہی تھی کہ تمہاری کاک ٹیل پی کر وہ ایسی مست ہوئی کہ......‘‘ پھر ایکدم ہنس کر بولی

’’خان! اگر آنٹی کارلا کے لگائے ہوئے Scraches درد کررہے ہوں تو میں کمر سہلادوں؟

ہمارے سٹور میں دو لڑکیاں آتیں تھیں، ایک بہت ہیوی باڈی، مگر عام ساقد، جب بھی آتی شرماتی ہوئی چلتی آتی۔ دوسری خوبصورت شیپ کی تھی۔ دونوں اکٹھی آتیں اور زیادہ تر ایگ، بریڈ اور ایک ایک 5 لیٹر پیک لاگر (بئیر کی طرح بہت ہی ہلکی شراب) خریدتیں۔ کچھ دنوں بعد مجھے پتہ چلا کہ دونوں کالج سٹوڈنٹ ہیں، ہوسٹل میں رہتی ہیں اور Gay ہیں۔ ایک دن میں نے شرارت سے پوچھا

’’خاوند کون ہے‘‘؟ **Who is the husband?**

تو موٹی نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرکے مجھے حیران کردیا، کیونکہ اسکی شرماہٹ اور چال سے کسی طرح یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ خاوند کا کردار ادا کرتی ہوگی، مگر یہ انگلینڈ تھا جہاں سیکس کے متعلق میرا اندازہ ہمیشہ غلط ہی رہتا۔ ایک دن میں نے اُن کو چھیڑا کہ

’’کسی دن اپنا ایکٹ مجھے بھی دکھاؤنا‘‘

تو موٹی اُسی شرمائے ہوئے لہجے میں بولی۔

’’ہم 18 سے اوپر ہیں، کسی چھٹی کی رات ہمیں اپنی کاک ٹیل کے لیے مدعو کرو۔ سب مزے کریں گے‘‘

میں پھر حیران رہ گیا۔ میری کاک ٹیل **(Cocktail)** تو پتہ نہیں کہاں کہاں مشہور ہوگئی تھی اور سر چڑھ کر بول رہی تھی۔

میرا دوست کرسمس اور نیوائر بُھگتا کر انکل کے ساتھ پاکستان جا چکا تھا۔ ہیلن کرسمس کے دن آئی تھی۔ ہمارے سٹور میں کسٹمرز کی بہت لمبی لمبی لائینیں تھیں، دونوں ملازمائیں بھاگ بھاگ کر شیلفوں میں سٹاک پورا کر رہی تھیں اور دونوں مشینیں ٹکا ٹک چل رہیں تھیں، سو وہ ہیلو ہائے کے بعد چلی گئی۔ ہم اُس پر زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ پھر نیوائیر آیا اور وہ رات ہم نے کارڈف کی حسیناؤں کے جُھرمٹ میں گزار دی۔ ان دنوں میں تھکن اتنی تھی کہ میں اور میرا دوست مساج سنٹروں سے اور ہال ہو آئے تھے، جہاں فل سروس اور ہاف سروس دونوں تھیں، اب آپ کی مرضی پر ہے یا پھر آپ کی جیب پر کہ کونسی سروس انجوائے کرنا ہے۔ اب دوست پاکستان جا چکا تھا۔ سٹور پر رش کافی کم ہوگیا تھا اور اُس کی بڑی وجہ سٹور میں سامان کی کمی بھی تھی جو پچھلے دنوں بے تحاشا بِک گیا تھا۔ میں سامان کی خریداری کا طریقہ سوچ رہا تھا۔ ہیلن کا میرے پاس نمبر نہیں تھا۔ موبائل فون اُن دنوں تھے نہیں کہ اچانک ہیلن آ گئی۔ اُسکا موڈ کچھ آف تھا، میں نے اُسے کافی وغیرہ آفر کی، اُس کے ساتھ کرسمس کے بعد اور نیوائیر پر رابطہ نہ کرنے کا گلہ کیا تو وہ کُھل گئی۔ دراصل کرسمس کے دن بن ٹھن کے وہ سب سے پہلے ہمیں ہی ملنے آئی تھی، لیکن ہم بزنس میں بُری طرح مصروفیت کی وجہ سے اُس پر کوئی توجہ نہ دے سکے، نہ اُسے کافی کا پوچھا، نہ کوئی شراب کا یا کسی اور طرح کا کرسمس گفٹ دیا، حالانکہ ہم نے اپنے کسٹمرز کے لیے **20** پونڈ کی خریداری سے لے کر زیادہ سے زیادہ خریداری پر کرسمس گفٹ رکھے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اُسے کرسمس وِش بھی نہیں کیا۔ اِس پر وہ خصوصاً مجھ سے سخت ناراض تھی۔ بقول اُس کے میں نے اُس دن اور بعد میں بھی فون پر بھی اُس سے معذرت نہیں کی۔

میں نے اُسے بتایا کہ میں ابھی ابھی اُسے یاد کر رہا تھا۔اُس دن مصروفیت کی وجہ سے زیادتی ضرور ہوئی، مگر اُس نے بھی تو انتظار ہی نہیں کیا۔رہی فون کی بات، تو اُس نے مجھے اپنا نمبر ہی کب دیا ہے۔یہ سن کر وہ ذرا نرم ہوئی اور بولی ''اب سوری بولو'' میں نے کہا ''ریئلی ویری سوری'' تو وہ او کے کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔تھوڑی دیر بعد ایک پیکٹ لے کر آئی اور بولی ''یہ تمہارا گفٹ ہے'' پھر خود ہی ریپر پھاڑ کر شرٹ نکالی اور میرے ساتھ لگا کر دیکھنے لگی۔''بیوٹی فل'' اُسکا تبصرہ تھا۔

شرٹ کی بات کر رہی ہو؟ میں نے چھیڑا

تو اور کیا تمہاری......؟ وہ شرارت سے بولی، پھر کہنے لگی پہن کر یقناً اور ہینڈسم لگو گے۔

''چلو یہ تو مانا کہ میں کچھ ہینڈسم پہلے ہی ہوں۔''

یہ کس نے کہا بچے؟

پھر سریس ہو کر بولی، ''کیا بات ہے سٹور اُجڑا اُجڑا سا ہے''؟

''پیسے تو ہیں پر کیش اینڈ کیری کے لیے ٹائم نہیں ہے''

وہ فوراً تیار ہو گئی۔میں نے ملازمہ جس کا اپنا نام بھی ہیلن تھا اُس کے ساتھ کر دی تا کہ سامان لوڈ کرنے میں سہولت ہو۔اُس نے دو دن مسلسل خریداری کر کے سٹور کو بھر دیا۔اُس رات میں نے اُسے ایک خوابناک ریستوران میں ڈنر دیا۔یہ ریستوران بھی اُسی کی دریافت تھا، وہ دونوں دن خریداری کرتی، ملازماؤں سے کلکولیشن (Calculation) کر کے پرائس گن کے ساتھ پرائس لگواتی اور شیلفنگ کرواتی رہی۔رات میرے ساتھ ہی قیام کرتی۔مجھ سے کہنے لگی

''کیسی ڈل لائف گزار رہے ہو تم۔سٹور بند کیا اور سو رہے۔ٹی وی کے دلچسپ چینل بھی نہیں آن کروائے''

پھر اگلے دن خود ہی کافی سارے چینل چلوا دیے اور مجھ سے چیک بک مانگی۔میں نے کہا ''میرا تو اکاؤنٹ ہی نہیں ہے'' تو حیران ہوئی اور اپنے چیک پوسٹ کر دیے۔اگلے دن میرا

بار کلے میں اپنے ریفرنس کے ساتھ اکاؤنٹ کھلوادیا۔ یہ اتنی آسان بات نہ تھی، مگر ہوگئی۔ رات کو ہم دیر تک آن شدہ نئے چینل دیکھتے رہے جن میں ایڈلٹ چینل (Adult Chanel) بھی تھا۔

رات ایک بجے سوئے ہونگے کہ تین بجے کے قریب سٹور اور فلیٹ میں الارم بُری طرح چیخنے لگے۔ ہائیڈی (کتا) بڑی بُری طرح بھونک رہا تھا۔ میں اور ہیلن ہڑ بڑا کر اُٹھ گئے۔ وہ فوراً پسٹل پکڑ کر نیچے کو بھاگی۔ ہائیڈی کبھی سیڑھیوں پر اور کبھی نیچے مسلسل سپیڈ کے ساتھ چکر لگا رہا تھا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے جلدی سے اٹنڈ کیا تو وہ پولیس اسٹیشن سے تھا۔ وہ مجھ سے الارم بجنے کی وجہ پوچھ رہے تھے کہ کیا کسی نے سٹور میں چوری کی کوشش کی ہے یا شیشہ وغیرہ توڑا ہے؟ میں جواب دینے کو تھا کہ ہیلن ہانپتی ہوئی اوپر آئی اور بولی "ٹیکنیکل فالٹ"۔ فون میرے ہاتھ میں دیکھ کر اُس نے لے لیا اور انہیں بتایا کہ سیکورٹی سسٹم کی سکرین بتا رہی ہے کہ "ٹیکنیکل فالٹ، کال دا انجینئر "Technical fault, Call the Engineer" ۔ ایسا ایک دفعہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اس لیے میں مطمئن تھا۔ سیکورٹی سسٹم کا ایک سوئچ پولیس اسٹیشن میں تھا جو انہیں گڑ بڑ کا بتا دیتا تھا۔

ہیلن نے سسٹم آف کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس کا دوبارہ فون آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

مسٹر مجھے صرف یس اور نو میں جواب دو۔ وہ چند منٹ سوال جواب کر کے بند کر گیا۔
ہیلن نے مجھے بتایا کہ اس بات کا مقصد یہ تھا کہ اگر تم گن پوائنٹ پر بھی ہو تو وہ سوال و جواب سے گڑ بڑ سمجھ جائے یا تمہیں کہیں اشارے کا موقعہ مل جائے۔ پستول کے متعلق کہنے لگی کہ یہ تو یہاں مستقل ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔

"لیکن میں تو اُسے نہیں بتا سکا کہ واقع گن پوائنٹ پر ہوں"

وہ میرا اشارہ سمجھ کر ہنس کر بولی "یہ تمہاری نا اہلی ہے اُس کی نہیں"

اسی طرح دن گزرتے رہے، وہ آتی تو میرے تمام کپڑے دھو کر، پریس کر کے جاتی۔

میرے لیے دو تین قسم کے کھانے اور برگر بنا کر چھوڑ جاتی۔ اُس نے ہائیڈی کو مستقل میری حفاظت کے لیے میرے پاس چھوڑ دیا تھا۔ یہ کتا انسانوں کی زبان مکمل سمجھتا تھا اور بالکل صاف ستھرا تھا۔ جہاں وہ رہ رہی تھی وہاں یہ تنگ تھا۔ وہ کبھی دو تین دن میرے ساتھ رہتی، کبھی ہفتہ ہفتہ غائب ہو جاتی، مگر میرا اور سٹور وغیرہ کا مکمل خیال رکھتی۔ میں اُس کی غیر موجودگی میں ڈیبی اور چھوٹی ہیلن، یعنی ملازماؤں سے شغل کرتا رہتا۔ ڈیبی کے کئی بچے تھے، مگر اُس نے شادی نہیں کی تھی۔ سبھی بوائے فرینڈز سے تھے۔ وہ شادی کو "جسٹ پیس آف اے پیپر" کہتی تھی۔ میں اُسے چھیڑتا کہ ڈیبی پلیز میرا نام آئندہ بننے والی بوائے فرینڈز کی لسٹ میں ذرا نزدیک کر کے لکھ لو تو وہ کہتی باس، تم Priority کو Enjoy کیوں نہیں کرتے۔ اسی طرح باتوں میں پتا چلا کہ چھوٹی ہیلن نے پہلے بچے کی پیدائش پر خوب شور مچایا تھا کہ اُس اُلو کے پٹھے (خاوند) کو بلاؤ۔ وہ دیکھے کہ کیسے جان نکلتی ہے اور پھر اُس نے جس وقت بچہ جنا، خاوند سرہانے کھڑا، ایزی بے بی ایزی کہہ رہا تھا اور وہ تکلیف کے باوجود اُسے مغلظات سے نواز رہی تھی۔ میں اُسے بھی چھیڑتا رہتا کہ دوسرے بچے کے وقت کیا ہوا تھا......؟ بہر حال دونوں عورتیں انتہائی سخت جان تھیں اور انتھک بھی۔ دونوں سگریٹ بھی پیتی تھیں۔ اس طرح یہ ہم میں قدرِ مشترک بھی تھی۔

میرے دوست کو شک تھا کہ انکل کی چوٹ میں اِن دونوں کا بھی ہاتھ ہے، کیونکہ اُن کے گھر والے اور مذکورہ پولیس آفیسر انکل کے دوست تھے اور رات گئے تک فلیٹ میں مفت کی پیتے تھے۔ انکل فلیٹ کی سیڑھیوں کے نیچے بے ہوش پائے گئے تھے، لیکن اُس دن کسی نے بھی مان کر نہ دیا کہ وہ انکل کے ساتھ تھا۔ صبح صبح جو دودھ اور بریڈ کی ڈلیوری لے کر آتے تھے انہوں نے "No Response" پر پولیس کو کال کی تو تب وہ بے ہوش دریافت ہوئے۔ اِسی طرح اُس پولیس آفیسر کا سٹور پر قبضہ، ان دونوں کا مسلسل اُس کے ساتھ بھی کام پر رہنا، آئے روز کے چھاپے، ہماری نگرانی کے باوجود ریک سے "Over Dated" چیزوں کا نکلنا، یہ سب کسی

سازش کی کڑی لگ رہا تھا۔ میرا دوست جا چکا تھا اور مجھے یہ سب **Face** ہی نہیں کنٹرول بھی کرنا تھا۔ مَیں اِسی موضوع پر بات کرنے کے لیے ہیلن کے انتظار میں تھا جو کئی دن سے غائب تھی۔

اگلے دن ہیلن آ تو گئی، مگر بہت پریشان تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو سسکنے لگی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کچھ دنوں سے **"Pregnancy"** محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے ہسپتال کے لیے آج کا ٹائم لے رکھا تھا، مگر اُس کے بوائے فرینڈ کو جو ایک کارپینٹر تھا، اچانک ایک جاب کال آ گئی اور اُس کی سہیلی جس کے ساتھ وہ فلیٹ میں رہتی تھی، اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر چلی گئی تھی۔ وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی کہ وہ آج اپنے آپ کو اس دنیا میں بہت اکیلا محسوس کر رہی ہے۔ وہ کار کی بجائے ٹیکسی بھی کر سکتی تھی، مگر بات تو فیلنگ اور تنہائی کی ہے۔ میں نے اُسے اپنی آفر دی تو وہ ایک دم خوش ہو گئی مگر پھر بولی۔ ''لیکن یہ تمہارا مسئلہ تو نہیں ہے۔ یہ تو میرے بوائے فرینڈ کی ڈیوٹی تھی۔ کرسمس پر تمہارے ہاں سے انتہائی **"Disheart"** ہو کر میں نے کافی زیادہ پی لی تھی جس کی وجہ سے میں احتیاط نہ کر سکی۔ بعد میں اگلے چند دن میں نے خود احتیاط نہ کی۔ میں اُس (انکل) کو بتانا چاہتی تھی کہ اُس کا یہ الزام غلط ہے کہ میں بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔'' ''پھر کہنے لگی

''تمہارا یہ پرابلم بھی ہے کہ تمہارے پاس لائسنس بھی نہیں ہے اور سٹور پر ہیلن بھی نظر نہیں آ رہی، یہ نئی لڑکی ڈیبی کے ساتھ ہے۔ یہاں کا کیا ہو گا''

میں نے اُسے کہا، ''یار! یہ سب مسئلے حل شدہ سمجھو، سیدھی بات کرو کہ تمہیں میرا ساتھ منظور ہے یا نہیں

''میں نے یہ دوٹوک سا لہجہ اس لیے اختیار کیا تھا کہ اُسے اس خود ترسی کی کیفیت سے نکالوں۔ اُس نے چونک کر مجھے دیکھا اور آگے بڑھ کر میرا گال چوم کر بولی،

''منظور ہے، منظور ہے، منظور ہے، ایسا ہی کہتے ہیں ناں! تمہارے ہاں''

وہ بات کو دوسری طرف لے گئی تھی۔ میں نے ڈیبی کو اس کی گاڑی پر **"L"** کے سٹکر

لگانے کو کہا جو ہم سٹور پر فروخت کرتے تھے۔ خود ہیلن کو کاؤنٹر پر چھوڑا، اوپر جا کر کپڑے بدلے، اپنا لرننگ لائسنس "Learning License" لیا اور نیچے آ کر ڈیبی سے کہا۔

''تم سینئر ہو، اس لیے کاؤنٹر تم ڈیل کرو گی''

جس سے وہ خوش ہوگئی اور ساتھ ہی میں نے آنکھ بچا کر دوسری لڑکی کو ہدایت دی کہ ڈیبی پر نظر رکھے۔ تھوڑی دیر بعد میں ہیلن کے ساتھ کارڈف ہسپتال جا رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ٹیسٹ کے لیے اُسے کوئی ایسی دوائیں دیں گے جو کہ نشہ کر دیتی ہیں۔ اس لیے اُس کو خصوصی تاکید کی گئی تھی کہ کسی کو ساتھ لائے جو اسے واپس ڈرائیو کر سکے۔

ایک نرس چیک اپ کے بعد اُسے میرے تک پہنچانے آئی تو وہ خاصے نشے جیسی کیفیت میں تھی۔ خدا جانے یہ کس قسم کا ٹیسٹ تھا۔ میں اُسے سیفلی (Safely) ڈرائیو کر کے واپس لے آیا۔ راستے میں اُس پر دوبارہ وہی قنوطیت کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ انکل اور اپنے بوائے فرینڈ دونوں کو گالیاں دے رہی تھی۔ انکل کو اس لیے کہ بارہ سال ساتھ رہا کچھ نہ کر سکا تو الزام اُس پر دھر دیا۔ بوائے فرینڈ کو اس لیے کہ آج کا یہ فرض اُس کا تھا جو میں نے ادا کیا اور اب وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھے گی۔ سٹور پر پہنچ کر میں نے اُسے اوپر فلیٹ میں لٹا دیا۔ پانی کا جگ اور گلاس پاس رکھا اور نیچے کام پر پہنچ گیا۔ شام تک وقفے وقفے سے ملازماؤں کو اُس کو دیکھنے بھیجتا رہا۔ وہ مسلسل غنودگی میں تھی۔ رات کو سٹور بند کر کے اوپر پہنچ کر کھانا گرم کر کے اُسے اُٹھایا تو وہ بہتر حالت میں تھی۔ ہلکا پھلکا کھایا تو اور بہتر ہوگئی اور کہنے لگی......

''خان! ڈیبی مجھے رازداری سے بتا رہی تھی کہ تم پاکستان سے آئے ہو۔ اس بات کا اُس کے کانوں تک پہنچنا کہ تم برطانوی نہیں ہو غیر مناسب ہے۔ وہ بہت غصے میں تھی، کیونکہ تم نے اُن کو ہفتے میں دو دو دن چھٹی دینا شروع کر دی ہے اور چار دن کے لیے ایک اور ورکر رکھ لی ہے''

وہ کہہ رہی تھی ''یہ آہستہ آہستہ ہماری چھٹی کروانا چاہتا ہے، مگر نہیں اس کی اپنی چھٹی نہ ہو جائے''

مجھے سازش کی بُو آ رہی ہے۔ اس کا کوئی عزیز امیگریشن میں بھی ہے۔ پھر کہنے لگی

''تمہارا اگر کوئی امیگریشن پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ، اگر مجھے پروپوز کرو تو میں بھی حاضر ہوں ورنہ کسی سہیلی کے ساتھ پیپر ارینجمنٹ (Paper Arrangement) کروادوں گی۔''

میں نے اُسے کہا ''ہنی! آج آرام کرو، مجھے بھی اس مسئلہ پر اور کچھ دوسرے مسائل پر تم سے بات کرنا ہے جو پھر کبھی کریں گے۔''

وہ کہنے لگی ''میں بہت سریس ہوں اس وقت اور نشے میں بھی نہیں ہوں، مگر جیسی تمہاری مرضی، مجھے تمہارے پاس وقت کم لگتا ہے''

اگلے دن وہ تیار ہو کے بولی ''رات کو آؤں گی، میں اپنے بوائے فرینڈ کی پشت پر لات مارنے جا رہی ہوں'' اور ساتھ ہی اُسے گالی دی۔

"I am gona kick the Ass of my boy friend, Ass hole"

پھر مجھے کہا کہ فریج میں برگر ہے دوپہر کو کھالینا، مزید شام کو آ کر دیکھیں گے۔ آج چھوٹی ہیلن اور ڈیبی دونوں ڈیوٹی پر تھیں۔ دوپہر کو میں نے کہا

''پلیز کوئی ایک اوپر جا کر مجھے ایک برگر گرم کر کے اور کافی کا کپ بنا کر لا دے''

چھوٹی ہیلن (ملازمہ) جا کر دونوں چیزیں لے آئی۔ میں نے ایک دو بائٹ (Bite) کے بعد برگر پھینک دیا کہ اُس کا ذائقہ انتہائی عجیب تھا۔ ملازمہ کو بتایا تو کہنے لگی شاید کئی دن کا پرانا ہو اور خراب ہو گیا ہوگا۔ کافی بھی بمشکل آدھی پی اور چھوڑ دی۔ طبعیت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ جیسے تیسے آخری چند گھنٹے گزارے اور سٹور بند کر کے اوپر پہنچا۔ اس دوران دو تین دفعہ ٹوائلٹ بھی گیا، مگر طبعیت خراب ہوتی چلی گئی۔ بلآخر تقریباً 10 بجے رات ہیلن آئی تو میں نے بمشکل دروازہ

کھولا۔ اُس کی گاڑی اُس کے سامان سے بھری ہوئی تھی اور وہ خود بھی بھری ہوئی تھی۔ جلدی جلدی سامان اندر رکھتی رہی اور بتاتی رہی کہ

”وہ اپنے بوائے فرینڈ کو انگلی دکھا آئی ہے اور سہیلی کو بھی کھری کھری سنا آئی ہے۔“

آخری پھیرے میں وہ گاڑی پارک کر کے آئی۔ دروازہ لگایا، الارم آن کیا اور کہا

”آؤ سامان اوپر پہنچا کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔“ پھر چونک کر بولی

”کیا بات ہے میرا آنا بُرا لگا ہے تمہیں؟“

”ہیلن! میری طبعیت بہت خراب ہے“

ہیں......؟ وہ پریشان ہوگئی۔ جلدی سے میرا ہاتھ پکڑا۔ پھر ماتھے کو ہاتھ لگایا۔

”اوخدا! تم تو جل رہے ہو“ **"OH God. You are burning"**

کیا ڈاکٹر کو فون کیا ہے؟

میں نے کہا، ”نہیں، میرے پاس میڈیکل کارڈ بھی نہیں ہے“

کہنے لگی ”فک دا میڈیکل کارڈ، یہ ایمرجنسی ہے“

"Fuck the Medical card, it is Emergency"

اُس نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا۔ اُس نے بھی غالباً کارڈ وغیرہ سے متعلقہ کوئی سوال کیا تھا جس پر وہ گرم ہوگئی اور ڈاکٹر کو آنے کا وعدہ کرنا پڑا۔ کہنے لگی آدھے گھنٹے میں آ رہا ہے۔ پھر مجھ سے تفصیل پوچھنے لگی۔ میں نے اُسے بتایا

”اُس کا بنا کے چھوڑا ہوا برگر چھوٹی ہیلن سے منگوایا تھا اور ساتھ کافی تھی اور تو کوئی چیز لی ہی نہیں۔ پھر کئی موشن آئے، سٹور بند کر کے اوپر آیا تو اندر ایک آگ سی محسوس ہو رہی تھی اس لیے ٹھنڈا ٹھار پانی بہت سارا پی گیا۔ تھوڑی دیر بعد اتنی الٹیاں آئیں کہ آنتیں باہر آتی محسوس ہو رہی تھیں اور اب یہ زبردست بخار کی کیفیت ہے۔ جسم انتہائی بے جان محسوس ہو رہا ہے“

بولی کہ برگر تو میں صبح تازہ بنا کے گئی تھی تمہارے لیے۔ ضرور کوئی اور گڑ بڑ ہے

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا۔ اُسے ہیلن نے تمام تفصیل بتائی۔ اُس نے معائنہ کے بعد کہا کہ یہ ہسپتال کیس ہے۔ دو تین فون کیے اور ایک قریبی قصبہ میں ہسپتال میں انتظام کر کے ہیلن سے پوچھا

''ایمبولینس کا کہوں؟''

کہنے لگی ''نہیں میں خود لے جاتی ہوں''

''پرنس چارلس ہسپتال'' میں مجھے ایڈمٹ کر لیا گیا۔ تین دنوں تک وہ میرے ٹیسٹ کرتے رہے کہ بخار کیوں ہے اور یہ اس کی کونسی قسم ہے۔ معدہ میرا بالکل خالی تھا، خون میں ملیریا بھی نہیں نکلا۔ بہر حال جنرل تحقیق کے مطابق مجھے کچھ بھی نہیں تھا (یا کچھ بھی دریافت نہ ہوا) اگلے دن بخار ٹوٹ گیا۔ میرے بائیں رخسار پر اور دائیں پاؤں کی ایک انگلی پر ایک ایک سفید منہ والا دانہ نمودار ہوا۔ انہیں کریدا تو مواد نکلا اور خسار پر تقریباً 1/2 انچ اور انگلی پر 1/4 انچ گہرا گڑھا بن گیا۔ دونوں جگہ دوائیاں بھر کر پٹیاں کر دی گئیں۔ پھر تحقیق شروع ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی نامعلوم وجہ سے میرے جسم کی بیماریوں کے خلاف مزاحمت کی قوت بالکل ختم ہو گئی ہے اور بلڈ کے وائٹ سیل بھی متاثر ہوئے ہیں جو کہ زخموں کو بھرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ تیسرے دن جا کر مکمل علاج شروع ہوا اور تین دن اور رکھ کر بہت سی دواؤں اور ہدایات کے ساتھ فارغ کر دیا گیا۔ اس دوران میرا معدہ بھی واش کیا گیا۔ مجھے ایک دن چھوڑ کر اگلے دن رخسار اور انگلی پر پٹی تبدیل کروانا تھی۔ المختصر اب میری زندگی محفوظ تھی۔

اس علاقے میں میرا سوائے ہیلن کے کوئی زیادہ واقف کار نہ تھا۔ وہ وزٹنگ ہاورز (Visiting Hours) میں آتی، مجھے بے تحاشا تسلیاں دیتی اور سٹور کی طرف سے بے فکر رہنے کو کہتی۔ اُسے یقین تھا کہ میرے ساتھ کچھ گڑ بڑ کی گئی ہے، مگر موشن اور اُلٹیوں کی وجہ سے معدہ

صاف ہوگیا تھا۔اُس نے میرے ہسپتال داخل ہونے کے بعد فوراً جا کر کاؤنٹر کے پیچھے ڈسٹ بن چیک کیا تھا،مگر وہ خالی تھا،اُس میں میرا پھینکا ہوا برگر نہ تھا حالانکہ ڈسٹ بن عموماً اگلے دن صبح آ کر ملازمائیں صاف کرتی تھیں۔پھر اس نے بتایا کہ وہ واپس جا کر تمام رات نہیں سوئی۔سوچتی اور روتی رہی۔کہنے لگی۔

’’خان! ہم دونوں کتنے تنہا ہیں،تم ٹھیک ہو جاؤ پھر بات کریں گے۔‘‘

ہسپتال سے واپسی پر دیکھا کہ اُس نے سٹور کو مکمل کنٹرول کے ساتھ سنبھالے رکھا تھا۔ ہر چیز نارمل تھی۔میری بیماری کی وجہ سے انکل نے فون کر کے اپنے اُسی دوست کو جو 5000 پونڈ کا دعوٰی کنندہ تھا،سٹور پر بھیج دیا تھا،سو وہ بھی آ رہا تھا۔ہیلن مجھے ریگولر پٹی کے لیے لے کر جاتی، میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ میں پاکستان میں شادی شدہ ہوں،مگر اُس نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔میں آہستہ آہستہ کاؤنٹر پر اپنا وقت بڑھا رہا تھا اور چیزیں نارمل ہو رہی تھیں۔

سٹور بہت سارے Debits سے نکل چکا تھا۔انکل کا مقرر کردہ آدمی ابھی نہیں آیا تھا وہ عموماً مرضی سے ہی آتا تھا۔میں کاؤنٹر کے پیچھے اِکا دکا کسٹمرز بھگتا رہا تھا،مگر میری نظریں اُس پولیس آفیسر پر تھیں جس نے سٹور پر قبضہ کیے رکھا تھا۔وہ چند منٹ پہلے سٹور میں داخل ہوا تھا اور میری دونوں ملازمائیں اُس کے گرد گھوم رہیں تھیں اور پتہ نہیں آہستہ آہستہ کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے آواز لگائی

ڈیبی،ہیلن،پلیز ڈو یور ڈیوٹیز

"Debby,Helen! Please do your duties"

وہ دونوں بھنائی ہوئی بکھر گئیں تو آفیسر سیدھا میری طرف آ گیا اور کاؤنٹر پر کہنیاں رکھ کر بولا

مسٹر! میرا ایک سوال ہے **"MR! I have a question"**

سر!......میں ایکدم الرٹ ہو گیا۔

یہ جب بھی خود، اسکی بیوی یا بیٹی سٹور میں آتے کوئی مسئلہ ضرور کھڑا ہوتا تھا۔ وہ بولا

''انگلینڈ میں تو جانوروں کے لیے "PET Food" ہوتی ہے۔ تم لوگ اپنے کتے اور بلیوں کو کیا کھلاتے ہو''

اس کے لہجے میں طنز و حقارت اور آنکھوں میں شرارت تھی۔ جسے میں نے سیدھا دل پر محسوس کیا۔

''سر! ہمارے کتے اور بلیاں فرنچ فرائز فش اور پیزا بہت پسند کرتے ہیں اور ہم انہیں وہی دیتے ہیں''

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ میرے واپسی وار کو سہہ نہ سکا اور اُس نے گالی کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چلا دیا۔ میں نے معمولی سا پیچھے ہٹ کر وار خالی جانے دیا تو اُس کے منہ سے گالیوں کا ایک فوارہ سا اُبل پڑا۔ اب میری باری تھی، اِدھر میں نے وار کیا اور اُدھر ہائیڈی نے غراتے ہوئے اُس پر چھلانگ لگا دی، جو اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر پہلے ہی غرا رہا تھا۔ ہائیڈی کے دھکے سے وہ پیچھے کو ہوا جس کی وجہ سے میرا وار معمولی سا اُس کے منہ پر لگا۔ اِس دوران ہیلن جو کہ اوپر کافی لینے گئی تھی، آ گئی اور اُس نے فوراً ہائیڈی کو کنٹرول کیا۔ آفیسر کے ناک سے میرے پنچ کی وجہ سے اور ہاتھ سے ہائیڈی کے دانت کی وجہ سے خون اور منہ سے مغلظات کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ تھانہ اکراس دا سٹریٹ (Accross the street) تھا۔ سوا گلے دس منٹ میں مَیں تھانے میں تھا۔ آفیسر ہسپتال جا چکا تھا اور ہیلن نے تھانے میں طوفان اُٹھا رکھا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ آفیسر واپس آیا تو ہاتھ پر پٹی تھی اور ناک سوجی ہوئی۔ مزاج کافی ٹھنڈا تھا، مگر ہر بات میں کوئی نہ کوئی گالی لُڑھکا دیتا جس کے متعلق میں نے دوسرے پولیس والوں کو نشاندھی کر کے گواہ بنا لیا تا کہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ اس کی آمد کے بعد جب تھانہ میں رپورٹ کی کاروائی ہونے لگی تو میں نے متعلقہ انچارج سے درخواست کی کہ مجھے اور اُس پولیس

آفیسر کو ٹھنڈا رہنے کی ہدایت کے ساتھ دس منٹ علیحدگی میں بات کرنے کی اجازت دی جائے۔ جو کہ آدھ گھنٹے میں **Manage** کردی گئی اور اگلے آدھ گھنٹے بعد میں ہیلن کے ساتھ سٹور پر تھا۔

بات صرف اتنی تھی کہ مجھے اُسے سمجھانا پڑا تھا کہ

''کورٹ میں ہمیں بتانا پڑے گا کہ ہماری دشمنی کی بنیاد کیا ہے اور اُس نے کاؤنٹر پر میرے سٹور کے اندر مجھ پر پہلے حملہ کیوں کیا جس کی گواہ ہیلن یہاں بھی موجود ہے اور چند کسٹمرز بھی رنگ ونسل کی بنیاد کے باوجود اس کی گواہی دیں گے۔تو پھر تیرا کیا ہوگا گوریا......؟ رہا میں تو میری تو شخصی ضمانت ہیلن کی صورت میں تھانے میں موجود ہے''

اور یوں کسی کیس کے بغیر، مگر دیکھ لینے کی دھمکیوں کے ساتھ میں واپس سٹور میں تھا۔ انچارج نے مجھے رویہ درست کرنے کی وارننگ ضرور دی تھی۔

عید سر پہ آرہی تھی اور ویسے بھی مجھے انگلینڈ میں داخل ہوئے پانچ ماہ کے قریب ہو رہے تھے۔اب قانونی طور پر مجھے کچھ دن کے لیے انگلینڈ چھوڑنا تھا۔میں نے پی آئی اے سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ عید کی آمد کی وجہ سے بہت رش ہے اور متعلقہ کلاس میں سیٹ نہیں ہے۔کلاس تبدیل کرنے کے لیے مجھے خود یا کسی نمائندہ کو لندن آفس میں آنا ہوگا اور **Difference** ادا کرنا ہوگا۔میں نے انکل وغیرہ سے بات کرلی تھی اور مہینہ بھر کے لیے سٹور کے لیے **Arrangment** کا بھی سوچ لیا تھا۔سو میں اگلے دن اپنی ٹویوٹا گاڑی میں لندن چلا گیا۔یہ گاڑی ہم نے انکل کی پاکستان روانگی سے قبل لے لی تھی۔لندن میں مَیں اپنے دوست ممتاز کے پاس گیا۔ٹکٹ اُس کے حوالے کی۔اُس نے کہا کہ وہ جلد ہی جس دن اُس کا کام سے آف ڈے ہوگا جا کر ٹکٹ تبدیل کروالائے گا۔

لندن میں مَیں صرف ایک رات رہا۔اُس رات بھی ممتاز میرے خراٹوں سے تنگ رہا۔ یہ خراٹے میری بیماری کے دوران پھر شروع ہو گئے تھے اور ممتاز کو خراٹوں میں نیند نہیں آتی تھی۔

بہر حال اگلے دن میں دو پہر کو واپس سٹور پر پہنچ گیا۔ ہیلن کسی کام سے گئی ہوئی تھی اور کاؤنٹر پر انکل کے دوست موجود تھے۔ میں نے اوپر جا کر ڈریس تبدیل کیا، کافی بنائی اور کپ لے کر کاؤنٹر کے پیچھے داخل ہوا ہی تھا کہ ایک گورا داخل ہوا۔ اُس نے میرا نام پوچھ کر مجھے اپنا کارڈ دکھایا اور اوپر میرے رہائشی کمرے میں چلنے کو کہا۔ ہیلن کے خدشات ٹھیک تھے۔

مجھ پر امیگریشن کا چھاپا پڑ چکا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ امیگریشن والے بڑی تحقیق اور ثبوتوں کے ساتھ آتے ہیں۔

پھر اگلے چند گھنٹے ہنگامہ خیز تھے۔ ہیلن کا بلکنا، اُس کی مجھے فوری چھڑانے کے لیے 30 ہزار پونڈ کی کیش گارنٹی کی باتیں، مجھے وکیل کر کے نکلوانے کی ممتاز اور ہیلن دونوں کی پیشکش وغیرہ، مگر میں فوراً اس مصیبت سے نکلنے اور پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میرا ذاتی مقولہ تھا۔ ''جب تم چاروں طرف سے گھیرے میں آ جاؤ (جو میں یہاں آ چکا تھا) تو جو بھی کمزور سائیڈ نظر آئے اُدھر سے گھیرا توڑ کر نکلنے کی کوشش کرو۔ ایسا کرنے سے تم بے شک زخمی تو ہو گے، مگر جان بچ جانے کے چانسز (Chances) موجود رہیں گے دوسری صورت میں تو ٹوٹل لاس (Total Loss) ہے''۔ سو میں نے ممتاز کے ذریعے فوراً ٹکٹ بک کرائی۔ مَیں نے برطانوی حکام کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا تھا کہ وہ ٹکٹ کے مسئلہ میں حکومتی خرچہ حتی الامکان بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے لیے یہ پسندیدہ بات ہوتی ہے کہ کوئی Victim بغیر کسی مزید قانونی کاروائی کے ملک چھوڑنے کو تیار ہو جائے۔ یہ اُن کی کمزور سائیڈ تھی جہاں سے میں نے سینندھ لگائی تھی۔ سو چند گھنٹے بعد میں ائرپورٹ پر تھا۔ جہاں سے فون پر ہیلن کو الوداع کہا تو سسکیوں میں اُس کی آواز دب رہی تھی۔

☞ ☞ ☞

تجرباتی پنگا

"Sorry Sir! I can not board you in this flight."

''مجھے افسوس ہے جناب! میں آپ کو اس فلائیٹ میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتی''

''**Why ? What,s wrong**'' کیوں؟ کیا غلط ہے۔؟

"Your visa for the UK has Left up to tomorrow only"

''تمہارا انگلینڈ کے لیے ویزا صرف کل تک کے لیے ہے''

''تو اس میں پرابلم کی کیا بات ہے''

یہ بحث جرمنی کے ایک ساحلی شہر **"BREMEN"** کے ائیر پورٹ پر ہو رہی تھی جہاں سے میں لندن کے لیے پرواز کرنا چاہتا تھا مگر بورڈنگ کرنے والی لڑکی مجھے بورڈنگ کارڈ ایشو کرنے سے انکار کر رہی تھی، کیونکہ میری انگلینڈ انٹری کی تاریخ ویزے پر اگلے دن تک تھی۔ مجھے پتا تھا کہ وہ قانونی طور پر غلط کہہ رہی ہے۔ اُس کا مؤقف تھا کہ کیونکہ میرے پاس کل کی ریٹرن ٹکٹ نہیں ہے اس لیے وہ مجھے بورڈ نہیں کر سکتی۔ اُس وقت ویزے کا طریقہ کار یہ تھا کہ ویزہ جاری کر دیا جاتا تو اُس پر لکھی مدّت میں آدمی کسی بھی وقت انگلینڈ میں داخل ہو سکتا تھا۔ وہ کتنی مُدّت قیام کر سکتا ہے اس کا فیصلہ ائیر پورٹ پر امیگریشن آفیسر **(Immigration Officer)** کرتا تھا۔ جو کہ وزٹ ویزہ والوں کیلیے عموماً چھ ماہ ہوتی تھی اور جس کی ابتدا، اُس انٹری کی تاریخ سے گنی جاتی

تھی نہ کہ ویزہ پر پرنٹ تاریخ سے۔ میں اُس سے بحث اس لیے کر رہا تھا کہ اگر آج کی یہ فلائیٹ مِس ہو جاتی تو اگلے دن پتا نہیں فلائیٹ ملتی یا نہیں اور پھر اگلے دن تو اور مسئلہ بن جاتا۔ میں دراصل نیویارک سے فرینکفرٹ اُترا تھا اور میرا پروگرام جرمنی میں صرف ایک دن قیام کا تھا۔

جرمنی کا یہ دورہ مجھے ہنگامی طور پر کرنا پڑا تھا، پہلے سے میرے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ پروگرام کے مطابق تو مجھے آٹھ دن پہلے نیویارک سے سیدھا لندن جانا تھا جہاں دو ہفتے کے کچھ خصوصی پروگرام تھے اور پھر دو ہفتے بعد مجھے پاکستان چلے جانا تھا۔ دو مہینے پہلے کمپنی والوں نے مجھے نیویارک میں ایک شاگرد دیا تھا کہ اسے ٹرینڈ کردو۔ میں وہاں ایک پٹرول پمپ پر ملازمت کر رہا تھا اور وہ لڑکا جرمنی سے 15 دن پہلے ہی آیا تھا اور ہفتہ بھر سے اسی کمپنی میں ایک اور پمپ پر ایک دوسرے سینئر ملازم کیساتھ شاگرد تھا، مگر اُس اللہ کے بندے نے اُسے سوائے پٹرول بھرنے کے کوئی کام نہیں سکھایا تھا جس کی وجہ سے مینجر نے اُسے میرے حوالے کر دیا تھا اور ٹھیک کیا تھا۔ میں تو خود اِسی قسم کی چالاکیوں کا ڈسا ہوا تھا۔ اس لیے اگر کوئی ایسا کیس نظر میں آجاتا تو اِسے میں فرض سمجھ کر پورا کرتا کہ علم بانٹنے سے بڑھتا ہے۔ وہ شخص اگر میرے دیئے ہوئے علم کو جو کہ میں نے بڑے دھکے کھا کر حاصل کیا تھا، مجھ سے حاصل کر کے کِسی ایک ضرورت مند کو بھی آگے منتقل کر دیتا تو میرا صدقہ جاریہ شروع ہو جاتا۔ ویسے بھی اگر ایک مزدور، مزدور کی مدد نہیں کرتا تو وہ اپنی برادری سے غدّاری کا مُرتکب ہوتا ہے اور غدار کیلیے تو ہر جگہ قانون میں سزائے موت ہے جو کِسی نہ کِسی طرح کِسی نہ کِسی شکل میں اُسے آلیتی ہے۔

پھر اُس کے ساتھ تعلق استوار ہوا تو پتہ چلا کہ یہ کم سن مزدور منڈی بہاؤ الدین (پاکستان) سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس کا بھائی چند سال پہلے اچھے دنوں میں کِسی ایجنٹ کے ذریعے جرمنی پہنچا اور اب کِسی نہ کِسی طرح Legal حیثیت میں تھا۔ چند ہفتے پہلے اُس نے میرے شاگرد کو بھی اپنے پاسپورٹ پر جرمنی بُلا لیا۔ دراصل دونوں بھائیوں کی صُورتوں میں سرمو فرق نہیں

تھااور جو معمولی فرق تھا وہ دونوں نے داڑھیاں رکھ کر مٹادیا تھا۔ اِس لیے اُس نے اپنے بھائی کے پاسپورٹ پر یورپ کا سفر کیا جو اس نے کسی طرح پاکستان بھیج دیا تھا اور پاکستانی ائیر پورٹ پر پیسے دے کر اُڑان کروادی تھی۔ میرے ساتھی کو چونکہ جرمن نہیں آتی تھی اس لیے اُس کی لینڈنگ فرانس میں کروائی تاکہ ائیر پورٹ پر مسئلہ نہ بنے اور خود اُسے جا کر لے آیا۔ پھر اس نے امریکن ویزہ اپلائی کیا۔ اپنے ڈاکومنٹس کے ساتھ، مگر فوٹو بھائی کی مہیا کیں تاکہ وہ ویزہ میں سکین "Scan" ہوسکیں اور یوں میرا یہ 21-22 سالہ شاگرد اب میرے پاس تھا۔

میں چونکہ خود بھی ایک اوسط گھرانے کا فرد تھا اور بڑے دھکے کھا کے بلکہ زخم کھا کر یہاں تک پہنچا تھا اسلیے مجھے اُن کی جدوجہد کی یہ کاروائی پسند آئی اور وہ لڑکا اپنی خدمت گزاری اور نیازمندی سے میرے قریب ہوتا گیا۔ اُس کے بھائی نے بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا۔ اپنے پاسپورٹ اور سٹیٹس (Status) کا رسک (Risk) لے کر سب کیا تھا۔ جب میں اپنے پروگرام کے مطابق واپسی کے سفر کی تیاری کر رہا تھا، تو اُس نے مجھے منت بھرے انداز میں کہا

''کیا آپ یہ پاسپورٹ ،لائسنس، کریڈٹ کارڈ اور دوسرے کاغذات جرمنی میں میرے بھائی تک پہنچا سکتے ہیں؟'' تو میں انکار نہ کرسکا۔ جرمنی میں ائیر پورٹ پر اگر تلاشی ہوجاتی تو یہ چیزیں میرے لیے وبالِ جان بن جاتیں مگر میں اپنی سرپھری طبعیت کا کیا کرتا کسی پر ہاتھ رکھ دیا تو سوائے اُس کی بے وفائی کے کوئی رسک یا رکاوٹ میرے لیے کبھی بھی اہمیت کی حامل نہیں رہی۔ یار ہے تو پھر یار ہے باقی سب کچھ دیگر ہے۔

میں نے ائیر لائن سے پتا کیا کہ کیا میرا روٹ تبدیل ہوسکتا ہے تو انہوں نے کہا کہ آپ لندن کی بجائے اگر VIA فرینکفرٹ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو کچھ رقم کے عوض یہ کر دیا جائے گا، مگر آپکو واپسی فرینکفرٹ سے ہی پاکستان جانا پڑے گا۔ یہ بات میں نے اُسے بتائی تو وہ کہنے لگا۔

''سر! جرمنی سے لندن اور لندن سے واپسی کے لیے ریٹرن ٹکٹ ہم آپ کو مہیا کریں گے''

میں نے ٹکٹ تبدیل کروائی، اور فرینکفرٹ جا اُترا۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا کہ

''آپ سمجھیں باہر میں کھڑا ہونگا''

واقع اُس کا بھائی مکمل اُس کی تصویر تھا مجھے اُسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی، لیکن مجھے حیرانی تب ہوئی جب میرے مخاطب ہونے سے پہلے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھا اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے اُس سے پوچھا:

''برادر! تم نے مجھے کیسے پہچانا؟''

اُس نے کہا

میرے بھائی نے آپ کی پہچان بتائی تھی کہ ''گہرے گھنگریالے بالوں اور بڑی بڑی لارڈ ٹائپ مونچھوں والا شخص، ایشین، وزٹر لابی میں آتے ہی سموکنگ کارنر کا رُخ کرے گا۔ دائیں ہاتھ سے ڈبی سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ میں پکڑے فلٹر میں فٹ کر کے سنہری لائیٹر سے سلگائے گا اور پھر اپنی سنہری فریم کی عینک سے لابی کا جائزہ لے گا، وہی ہمارا جاوید بھائی ہوگا اور ہاں آپ کے دائیں ہاتھ میں موٹی کرنیں بکھیرتے سفید نگ والی انگوٹھی بھی پہچان تھی۔

میں اُس کے بھائی کے اپنے متعلق عمیق مشاہدہ سے حیران رہ گیا۔

قِصہ مختصر کہ میرا یہ دو دن اور ایک رات کا وزٹ پورے ہفتہ کے ٹور پر محیط ہو گیا۔ وہاں منڈی بہاؤالدین کے اور بھی دوست تھے، کچھ دوسرے علاقوں کے بھی تھے۔ فرینکفرٹ سے اُن کا شہر 6-7 گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ سب پُرخلوص اور میرے مرید۔ زیادہ لوگ تارڑ فیملی سے تھے۔ یہاں آ کر مجھے پتا چلا کہ اُن کے پاس تو میرے پچھلے دو ماہ کی لحہ بہ لحہ رپورٹ تھی اور انہیں پتا تھا کہ اب اُن کا بھائی اور عزیز امریکہ میں کبھی مار نہیں کھائے گا، کیونکہ پورے دو ماہ میں نے اُس کی کام میں ہی نہیں، زمانہ سازی میں بھی تربیت کی تھی۔

لیکن اُن کا یہ خلوص اب مجھے دشواری میں مبتلا کر رہا تھا اور ایئر لائن کی نمائندہ مجھے بورڈنگ کارڈ ایشو کرنے سے انکاری تھی۔

"Mamm! It is just seems the matter of lack of information. Please call your senior. I want to talk with him"

''محترمہ ! یہ صرف معلومات کی کمی کا معاملہ دِکھتا ہے۔ برائے مہربانی اپنے سینئر کو بلائیے۔ میں اُس سے بات کرنا چاہتا ہوں''

بالآخر میں نے اُن محترمہ کی خود ساختہ قانونی مہارت سے اُکتا کر درج بالا جُملہ بولا۔''Sure, Sure''اب اُس کے لیے اُسے بلانا ضروری ہو گیا تھا، کیونکہ میں مطالبہ کر چکا تھا۔ اپنے آپ تو اُس نے کسی سے مشورہ کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

سپر وائزر کو میں نے ساری بات سمجھائی تو اُس نے اُسی لڑکی سے کہا کہ وہ لندن "Gatwick" ایئر پورٹ پر امیگریشن کاؤنٹر سے بات کرے اور سچویشن بتا کر ہدایات لے لے۔ دس منٹ بعد وہ واپس آئی تو اُس نے خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ کر مجھے بورڈنگ کارڈ جاری کر دیا۔

''کیا کہا انہوں نے'' میں نے کارڈ ہاتھوں میں لے کر شرارتاً پوچھا

''انہوں نے کہا ہے کہ اِسے آنے دو ہم خود دیکھ لیں گے'' وہ غصیلے لہجے میں بولی مگر پھر شاید اُسے اپنے لہجے اور سابقہ رویہ کا کچھ احساس ہوا۔ کہنے لگی

'Sorry for Trouble'' یعنی تکلیف کے لیے معذرت۔

''Its ok darling,Have a good day.''

''کوئی بات نہیں، تمہارا دن خوشگوار گزرے''

چھوٹا سا طیارہ تھا اور ہم 75-70 مسافر ڈیڑھ گھنٹے میں ابھی چائے پانی سے فارغ

ہوئے ہی تھے کہ لندن آ گیا۔شاید میرے علاوہ تمام یورپین تھے۔دوسری فلائیٹوں کا ہیتھرو کی طرح رش بھی نہیں تھا۔میری باری امیگریشن کاؤنٹر پرجلد ہی آ گئی، کیونکہ یورپین تو اپنا کارڈیا پاسپورٹ دکھا کرجلدی جلدی گزر رہے تھے۔میں نے اپنا پُر شدہ **Embarkment** کارڈ اور پاسپورٹ آفیسر کے سامنے کاؤنٹر پر رکھا تو اُس نے میرے پاسپورٹ کو غور سے چیک کیا۔ویزہ دیکھااور بولا

Where from you comming Sir,?

’’کہاں سے آرہے ہیں جناب؟‘‘

Actually from USA, But right now from Germany.

’’اصل میں امریکہ سے،لیکن ابھی ابھی جرمنی سے‘‘

What is the purpose of your this visit Sir?

’’آپ کے اس دورہ کا مقصد کیا ہے‘‘؟

To see some family members, particularly to my youger brother Who is studying over here.

’’اپنی فیملی کے کچھ لوگوں سے ملنااور خصوصی طور پراپنے بھائی سے جو یہاں پڑھ رہا ہے‘‘

‘‘How long you want to stay Sir’’

’’آپ کتنا عرصہ قیام کریں گے؟‘‘

میرا عشرے سے زیادہ عرصے کا تجربہ کہتا تھا کہ عموماً یہ آخری سوال ہوتا ہے اور مدت بتانے پر انٹری دے دی جاتی ہے۔لیکن میں ذرا تجربہ گین کرنے کے موڈ میں تھا کہ اگر کِسی سوال کا معمول سے ہٹ کر جواب دیا جائے تو کیا ہوتا ہے۔سو میں نے درج بالا سوال کے جواب میں کہا

Cannot say sir ’’کچھ کہہ نہیں سکتا‘‘

اِس کے بعد سوال و جواب کی ایک لمبی چین’’**Chain**‘‘ چل پڑی۔

کیا کرتے ہو؟ اتنے سفر کرنے کا مقصد کیا ہے؟ بزنس مین ہو کے تمہیں اپنے شیڈول کا نہیں پتا ہے؟ تمہارا بھائی کیا پڑھ رہا ہے؟ کتنی رقم ہے تمہارے پاس وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران مجھ سے رقم کاؤنٹر پر رکھوا کر گنی جا چکی تھی۔ دو اور امیگریشن آفیسرز (ایک مرد اور ایک خاتون) بھی فارغ ہونے کی وجہ سے یہ صورتِ حال واچ کر رہے تھے۔ اُس نے اُن سے بھی کچھ مشورہ کیا اور بولا۔

"Yes gentelman, Let me know what's the true story."

’’ہاں شریف آدمی! اب حقیقت بیان کرو‘‘

’’سر! آپ کے مُلک میں میرا صرف دو ہفتے کے قیام کا پروگرام ہے۔ مجھے واپس بریمن جانا ہے۔ وہاں سے اُسی دن فرینکفرٹ اور اُسی دن پاکستان کے لیے واپسی۔ میرا تمام روٹ کنفرم ہے۔‘‘

Sir! actually I have only two weeks programme in your country.I have to go backto Bremen,same day to Frankfort from there and again same day to Pakistan. My all route is confirmed.

یہ کہتے ہوئے میں نے بریف کیس سے پاکستان واپسی کی ٹکٹ بھی نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔

Then why you said ’’تو تم نے پہلے کیوں کہا تھا کہ مجھے نہیں پتہ‘‘ ‘‘**you can not say**

‘‘**I was just joking sir** ’’ ’’میں صرف مذاق کر رہا تھا سر!‘‘

''ایں! مذاق اور امیگریشن آفیسر سے ۔ تمہیں پتا ہے میں تمہیں انٹری ریفیوز (Entry Refuse) بھی کرسکتا ہوں ۔؟ تمہاری تو انٹری کلیئرنس بھی صرف کل تک ہے۔ بڑا دل گردہ ہے تمہارا''

''معذرت چاہتا ہوں جناب'' "Sorry about that Sir" میں اب کسی طرح جان چھڑانا چاہتا تھا۔

لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟ (But why you did it) وہ تھوڑا نرم ہو کر بولا۔

''سر آپ کے دوستانہ رویہ اور چہرے سے لگا کہ آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ تبھی جرأت ہوئی''

Oh! Boy!Never do it again.Be very very careful in front of an Immigration officer.

''او لڑکے! دوبارہ ایسا کبھی مت کرنا۔ ایک امیگریشن آفیسر کے روبرو بہت احتیاط کیا کرو۔''

یہ کہہ کر اُس نے چھ ماہ کے لیے انٹری کی مہر لگائی اور مسکرا کر اپنے ڈیسک کے ساتھ لگی ہوئی رکاوٹ ہٹا دی گو کہ اُس نے انتہائی مہربانی کا سلوک کیا تھا، مگر یہ ایک اچھی نصیحت تھی کہ ہر سوال کا جواب اُس کے میرٹ کے مطابق، دوٹوک اور مختصر ہو تو جان آرام سے چھوٹ جاتی ہے ورنہ سیدھے سبھاؤ ائیر پورٹ سے ہی گھر کو واپسی ہو سکتی ہے۔

☞ ☞ ☞

خوش دل۔فرض شناس گورا

فنز بری پارک(Finsbury Park) لندن میں مَیں اور اشفاق داخل ہوئے تو شام کا وقت تھا اور چاروں طرف خاصی رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کچھ جوان لڑکیاں اورلڑکے جاگنگ کررہے تھے۔کچھ جوان جوڑے ایک دوسرے میں گم چہل قدمی کررہے تھے۔اسی طرح بنچ بھی پُر تھے۔کچھ بچے بھی والدین کے ساتھ تھے اور شوخیاں کررہے تھے اور کچھ بزرگ شاید گھمبیر مسائل پر سوچ رہے تھے۔اِسی طرح کچھ لوگوں کے ساتھ اُن کے کتے بھی تھے جن کو وہ ٹہلا رہے تھے۔ہم نے مناسب جگہ گاڑی پارک کی۔گاڑی سے سنیکس اور ڈرنکس کا لفافہ پکڑا۔کاغذ قلم لیے اور ہاتھوں میں ابھی ابھی خریدی ہوئی کافی کے کپ پکڑکر کسی مناسب اور تنہا گوشے کی تلاش شروع کردی۔ترجیح یہ تھی کہ گاڑی بھی نظر میں رہے۔اس لیے ذرا مشکل پیش آرہی تھی۔اچانک لائٹس آن ہوگئیں تو الیکٹرک پول کے پاس پڑے بنچ پر ایک دوسرے میں گم جوڑے نے چونک کر دیکھا۔جلدی سے اُٹھے اور ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے شاید کسی تاریک گوشے کی تلاش میں ایک طرف کو بڑھ گئے۔مَیں اور اشفاق نے جلدی سے بڑھ کر اُس بنچ پر قبضہ کرلیا۔

ہم نے اپنی چیزیں درمیان میں رکھیں اور ایک دوسرے کی جانب منہ کرکے کاغذ قلم سنبھال کے بحث ومباحثہ میں ڈوب گئے۔ہمیں ایک نئے عزم کے ساتھ امپورٹ ایکسپورٹ کی پلاننگ کرنا تھی۔ ممتاز کے سابقہ باس تنویر نے جو کالوں کے لیے خصوصی کاسمیٹکس

(Cosmetics) کے بزنس میں انگلینڈ میں ایک بڑا نام ہے ہمیں ہماری درخواست پر یہ آپشن (Option) دی تھی کہ امریکہ کی کچھ مخصوص کمپنیوں سے کاسمیٹکس کی چند آئٹم انہیں فراہم کر دیں، جس میں ہمارا معقول منافع ہوگا۔ یعنی امریکہ سے انگلینڈ میں سپلائی۔ یہ سپلائی انہیں پہلے بھی مل رہی تھی، مگر ظاہر ہے اُن کا سپلائر اُن سے منافع کے ساتھ ہی وصولی کرتا تھا۔ اب یہ کام اگر کر سکیں تو ہمیں کرنا تھا۔ مسئلہ تھا سرمائے کی فراہمی۔ اگر ہم ذرا اور جُھک کر بات کرتے تو ممتاز سے یا تنویر سے کچھ ایڈوانس سرمائے کی فراہمی بھی ممکن تھی، مگر میں سابقہ تلخ تجربوں کی وجہ سے اِس کے حق میں نہیں تھا۔

اِسی طرح کا دوسرا آرڈر ہمارے پاس ممتاز کی طرف سے تھا جو ہماری درخواست پر ہمیں دیا گیا تھا۔ اس میں جنرل سٹور آئٹمز اور بالوں سے متعلقہ اشیاء (Hair Accessories) کی پاکستان سے انگلینڈ سپلائی دینا تھی۔ ہمیں فیصلہ یہ کرنا تھا کہ کس نے کونسا سٹیشن سنبھالنا ہے اور سرمایہ کہاں سے لانا ہے۔ امریکہ سے انگلینڈ والی سپلائی دینے کا فیصلہ میرے بارے میں ہوا، کیونکہ میری امریکہ کے اداروں میں تقریباً ایک لاکھ ڈالر کی کریڈٹ لائن پہلے ہی موجود تھی اور اب مجھے وہاں جا کر مزید کئی لاکھ ڈالر کے لیے بات چیت کر کے سپلائی دینا تھی۔ اس کے علاوہ میرے وہاں ایسے رابطے تھے جو میرے لیے مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ اس طرح پاکستان سے انگلینڈ سپلائی کا فیصلہ اشفاق کے لیے ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا آٹھ دس لاکھ روپے کا آرڈر تھا۔ پاکستان میں واقفیت کی وجہ سے اشفاق مال کریڈٹ پر بھی اُٹھا سکتا تھا، اس کے علاوہ وہ پاکستان میں پیسہ اکٹھا کرنا اچھی طرح جانتا تھا۔ یوں موٹی موٹی باتیں طے کر کے جب ہم نے سر اُٹھایا تو اندھیرا گھِرا ہو چکا تھا اور پارک کی چہل پہل کم ہو چکی تھی۔ ہماری گاڑی کے پاس ایک دو گاڑیاں اور کھڑی تھیں۔ میں نے کہا:

''یار! اس پارک کی کوئی مخصوص ٹائمنگ تو نہیں؟ لگتا ہے اجاڑ پڑ گئی ہے''۔

اشفاق کہنے لگا: ''ہم تو مانا نئے ہیں، مگر یہ جو دوسروں کی گاڑیاں کھڑی ہیں اگر ایسا ہوتا تو یہ یہاں نہ ہوتیں''

یوں ہم ایک دفعہ پھر اپنے منصوبہ کی جُزیات میں الجھ کر گُم ہو گئے۔ ہم جب اس طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی ڈسکس میں پڑتے تھے تو سگریٹ اور لائٹر کی گردش کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ اس کے نتائج ہمیشہ اچھے نکلے تھے، مگر کئی دفعہ ہمیں اس اردگرد سے لاتعلقی نے شرمندہ بھی کیا تھا۔

ایسے ہی ایک دفعہ ہم دوبئی ایئرپورٹ پر ٹرانزٹ پر تھے۔ ہمیں انگلینڈ ہی آنا تھا۔ ہم پاکستان سے لندن کے لیے ڈبل بورڈنگ لے چکے تھے۔ اگلی فلائیٹ میں کافی وقت تھا۔ اس لیے ہم نے ایئرپورٹ کے اندر کی دنیا وزٹ کرنے کا پروگرام بنایا۔ ہینڈ بیگ ہاتھوں میں لیے ہم گھومنے لگے۔ ہمارے بڑے بیگ لاہور سے ہی انگلینڈ کے سٹکروں کے ساتھ لوڈ ہو چکے تھے اور یہ ائیرلائن انتظامیہ کا کام تھا کہ وہ انہیں اگلے جہاز پر پہنچائے اور ہمیں ہیتھرو ایئرپورٹ پر ڈیلیوری دے۔ یوں ہم بے فکری سے گھومتے ہوئے ایک لمبے سے کوریڈور میں بیٹھ گئے۔ وہاں شیشے لگے ہوئے تھے اور باہر ایئرپورٹ پر فلائیٹ لوڈنگ، ان لوڈنگ، چیچنگ اور رن وے پر دوڑتے اور فضا میں ابھرتے جہاز نظر آ رہے تھے۔ ہم اس کوریڈور میں اس لیے بیٹھے تھے کہ ہمیں یہیں سے گزر کر پسنجر لاؤنج میں جانا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ جونہی فلائیٹ، اناؤنسمنٹ ہو گی ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔

اور پھر یوں ہوا کہ ہم بحث و مباحثہ میں الجھ گئے۔ کیا اناؤنسمنٹس ہوتی رہیں۔ ہمارے کان سن رہے تھے، مگر فالو (**Follow**) نہیں کر رہے تھے۔ آخر اشفاق چونک کر بولا،

''خان! پتہ کریں فلائیٹ لیٹ لگتی ہے۔ ٹائم تو ہو چکا ہے''

میں نے کہا کسی سے پوچھتے ہیں۔ کہنے لگا ''وہ دیکھو، وہ جو ''بڈاوا'' سا آ رہا ہے اُدھر، یہ انہیں میں سے ہے یعنی ''اِیویں پریشان'''''

یہ اصلاح ہم اُن لوگوں کے لیے استعمال کرتے تھے جو کام کرتے ہوئے شو کرتے ہیں کہ سارے زمانے کے کاموں کا بوجھ اُن پر ہے۔ وہ اپنی حرکات سے ہم سے یہ خطاب حاصل کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک چھوٹے قد کی ہستی کاریڈور میں آتی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگا تو ہم نے اُسے روک لیا۔

''ہائے۔ کیا کام کا بوجھ بہت زیادہ ہے؟'' میں نے اُسے چھیڑا۔

اُس نے چونک کر ہمیں دیکھا اور بولا۔ ''دو مسافر گم ہو گئے ہیں، فلائٹ تیار ہے، کئی دفعہ اناؤسمنٹ کی گئی ہے۔ میں سارے ایئرپورٹ پر کئی دفعہ ڈھونڈ آیا ہوں۔ کیا غیر ذمہ داری ہے؟ اب ہمیں اُن کا سامان ڈھونڈ کر ان لوڈ کرنا پڑے گا''۔

میں نے کہا، ''اچھا؟''۔ یہ تو بہت غیر ذمہ داری ہے۔ بائی دا وے کیا اس نمبر کی فلائٹ لیٹ ہے، لندن کے لیے۔ اگر تمہیں پتہ ہو تو پلیز بتاؤ''۔ میں نے اپنی فلائٹ کا نمبر بتایا تو وہ دوبارہ چونک کر ہمیں غور سے دیکھنے لگا۔

''کیا تمہارے نام مسٹر اشفاق اور جاوید تو نہیں ہیں؟''

میں نے کہا، "Yes we are" کیا ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟''

میرے فقرے کا دوسرا حصہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اُس نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور دانت کچکچا کر بولا۔

''سر، وہ مسافر آپ ہی تو ہیں اور میں اُسی فلائٹ کی تو بات کر رہا ہوں''۔

سو اس طرح ہم اپنے مباحثے میں ''ڈب'' یعنی ڈوب جایا کرتے تھے۔ اُس دن پارک میں ہم دوبارہ ڈوب کر ابھرے تو اس لیے کہ ہمارے سگریٹ قریب الختم تھے۔ ہم نے آ کے اپنی گاڑی سٹارٹ کی تو پتہ نہیں کس کونے کھدرے سے ایک کالا اور اُس کے ساتھ گوری نکلے اور پچھلی گاڑی سٹارٹ کرنے لگے۔ ایک آدھ منٹ کے وقفہ سے تیسری گاڑی بھی سٹارٹ ہو گئی۔ اُس

میں بھی ایک محبت بھرا جوڑا تھا۔ گیٹ پر پہنچے تو گیٹ بند تھا۔ گیٹ کے ساتھ نوٹس بورڈ پڑھا تو اُس پر واضح طور پر کلوزنگ ٹائم درج تھا۔ جو کب کا گزر چکا تھا۔ اب سوائے ایمر جنسی والوں کو فون کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا، مگر دوسرے دونوں جوڑوں کی یقیناً کوئی خصوصی پرابلم تھی کہ وہ پولیس کو فون کرنے کو تیار نہ تھے۔ آخر یہ کام ہمیں کرنا پڑا۔ 911 ملاتے ہی پوچھا گیا،

''کیا چاہیے،'' پولیس، ایمبولینس یا کوئی اور ہیلپ''

ہم نے مختصراً بتایا کہ ہم فنز بری پارک میں قید ہو گئے ہیں تو وہ ہنسا اور بولا۔

''فون آن رکھنا، پولیس تم سے رابطہ کرے گی''

تقریباً ایک منٹ بعد پولیس کا فون آ گیا۔ اُس نے پوری تفصیل معلوم کی اور انتظار کے لیے کہا۔ پانچ منٹ بعد دوبارہ پولیس نے فون کیا اور بتایا کہ متعلقہ آدمی سے رابطہ ہو گیا ہے، وہ ایک شادی کی پارٹی میں شریک تھا۔ وہ بیس منٹ میں پہنچ جائے گا۔ ڈونٹ وری؟۔ کوئی اور امداد؟ ہم نے شکریہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ تقریباً 20 منٹ بعد ایک موٹا سا انگریز گاڑی سے اترا۔ وہ مسکرا رہا تھا، حالانکہ اُسے ہماری وجہ سے شادی کی تقریب چھوڑ کے آنا پڑا تھا۔ اُس نے گیٹ کھولا اور بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے سوری کہا تو مسکرا دیا۔ دوسری دو گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ نکل آئیں۔ اُن میں بیٹھی لڑکیاں جانے کدھر کھسک گئی تھیں۔

☞ ☞ ☞

تبلیغی مِشن

"Looking, Looking, Watching, Watching, all the time watching, Are we theives?"

یہ ایک نیگرو خاتون کے الفاظ تھے جو میرے ساتھ لڑنے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

مطلب یہ تھا کہ ہر وقت ہماری نگرانی کرتے رہتے ہو، کیا ہم چور ہیں؟

''نہیں خاتون، میں نے تو ایسا کبھی نہیں کہا''

(No Mamm, I Never said like this)

"Cameras, Mirrors and You, I shall not come here again."

''کیمرے ہیں، آئینے لگے ہیں اور پھر تم ہو، میں دوبارہ یہاں نہیں آؤں گی۔''

''بہرحال یہ میری ڈیوٹی ہے۔'' **(Any how, It is my duty Mamm)**

میں نے کندھے جھٹک کر کہا اور اگلی رو کی طرف مڑ گیا۔

''اوئے! بات سنو'' **(Hay! Listen)**

''غصہ مت کرو، پلیز اپنی خریداری کرو،''

(Do not panic, Do Your shopping Please)

میں نے کہا اور آگے بڑھتا رہا۔ جونہی میں گھوم کر تیسری رو کی طرف مڑا میں نے ایک سوا چھ فٹ کے مضبوط قسم کے نیگرو کو جلدی جلدی بے بی فوڈ کے ڈبوں کو زپ کھول کر اپنی لیدر جیکٹ کے اندر سینے اور پیٹ کے پاس بھرتے دیکھا

''دوست تم کیا کر رہے ہو؟''(What are you doing friend)

میں نے ٹھنڈے لہجے میں دور سے ہانک لگائی۔

''Oh, You Bloody'' کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ میں پکڑے ڈبے میری طرف پھینکے اور باہری دروازے کی طرف بھاگا۔

''اِسے روکو ذرا'' میں نے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے دو لڑکوں کو آواز لگائی۔

کاؤنٹر دروازے کے پاس تھا۔ ایک لڑکا جلدی سے کاؤنٹر سے نکلا تو اُس نیگرو نے اُسے بھاگتے ہوئے دھکا دیا، وہ پیچھے کو گرا مگر گرتے گرتے بھی اُس کا پاؤں نیگرو کی ٹانگوں سے الجھ گیا۔ نیگرو سنبھلتے سنبھلتے دروازے کے باہر فٹ پاتھ پر گرا۔ پلٹیاں کھائیں اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے چوری شدہ ڈبے نکل کر فٹ پاتھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پلٹ کر دیکھتا جا رہا تھا اور اُس کے ناک، منہ اور سر سے بہتا خون نظر آ رہا تھا۔ ہم نے اطمینان سے ڈبے جن کی مالیت تقریباً 45 پونڈ تھی سمیٹے اور اندر آ گئے۔

اس سٹور کا مالک سعید تھا جو وِگ والے کاؤنٹر کے پیچھے سے تجسس کے ساتھ سب دیکھ رہا تھا۔ اُسے پتا تھا کہ میں بات جلد اور اطمینان بخش طریقے سے ختم کر لونگا، کیونکہ یہ کوئی پہلا واقع نہیں تھا۔ جب سے مَیں اس سٹور میں سکیورٹی جاب پر تعینات ہوا تھا دوسرے چوتھے یہ معمول سا بن گیا تھا۔ ایک دو دفعہ ہی پولیس بلانا پڑی تھی ورنہ کام ایسے ہی چل جاتا تھا۔ بعض مرتبہ میں ہاتھ پاؤں بھی استعمال کر جاتا تھا جو کہ قانوناً ممنوع تھا، مگر ایسے موقعوں پر ہم خود چور کو بھاگنے کا موقع دیتے تھے اور مار کھا کر بھاگا ہوا چور پلٹ کر پولیس کے پاس ہماری شکایت تو لے جانے سے رہا۔

یہ سپر سٹور لندن کے ایک علاقہ "Harlsden" میں خالص کالوں کے علاقہ میں تھا۔ سٹور میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایسی تازہ سبزیوں کا سیکشن تھا جو زیادہ تر کالوں کی خوراک تھیں۔ بائیں طرف مین (Main) کاؤنٹر تھا۔ پھر اُس سے کافی آگے مختلف قسم کی وِگوں کا سیکشن تھا اور اُس کے آگے اُس پراڈکٹ (وِگوں) کے لیے علیحدہ کاؤنٹر بھی تھا۔ یہاں زیادہ تر کالوں سے متعلقہ اشیاء تھیں جن میں اُن کی پسندیدہ سبزیاں، کاسمیٹک، ڈرنک، ہیئر زیعنی بالوں کے متعلقہ اشیاء اور وگیں تھیں۔ اس کے علاوہ عام جنرل سٹور کا سامان بھی بہت سے ریکوں میں سجا تھا۔ میں اس سٹور میں اپنے دوست ممتاز کے ریفرنس سے پہنچا تھا، کیونکہ سٹور کا مالک سعید اُس کا دوست تھا۔ پہلے دن سعید نے مجھے کہا

''یار! بندے تو میرے پاس پورے ہیں، لیکن تمہارے پاس تگڑے بندے کی سفارش ہے، اچھا بتاؤ، تمہیں ہمارے عام لوگوں کی طرح کالوں سے ڈر تو نہیں لگتا؟''

''کام بتاؤ برادر۔ مجھے پتہ ہے یہ کالوں کا علاقہ ہے۔''

''میں تمہیں ایسی جاب دینے کا سوچ رہا ہوں جس میں اگر تم کامیاب ہو گئے تو اپنے ساتھ دو دوسرے لڑکوں کی بھی تنخواہ نکال کر مجھے دو گے۔ یوں تم مجھے بار محسوس نہیں ہو گے۔ جیسا کہ مجھے تمہارے متعلق پتہ چلا ہے، تم ویسے ہی اتھرے نظر بھی آ رہے ہو۔ تم کامیاب رہو گے۔''

''ایسا کیا کام ہے جس کی یہ تمہید باندھی جا رہی ہے؟ باڈی گارڈ رکھو گے۔'' میں نے ہنس کر کہا تو کہنے لگا

''میرا اندازہ ہے کہ میرے سٹور سے ہر ہفتے 500 پونڈ سے زیادہ کی چوری ہوتی ہے۔ تمہیں اُسے روکنا ہے، اور یہی تمہاری جاب ہے''

''ایسا ممکن تو ہے، مگر......؟''

وہ جلدی سے بولا ''لیکن زیادہ پھڈا نہیں ہونا چاہیے ہمیں یہاں بزنس بھی کرنا ہے اور

پولیس کے اعتراض سے بھی بچنا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی مسئلہ نہیں، مگر میری غیر موجودگی میں 'ہتھ ہولا' رکھنا۔''

اور یوں میں یہاں ڈیوٹی پر تھا۔

سٹور میں گو کیمرے لگے ہوئے تھے جو باری باری ہر رو (Row) کی تصویر کاؤنٹر کے پاس ٹی وی پر دکھاتے رہتے، اس کے علاوہ بڑے بڑے آئینے کارنرز میں فٹ تھے جو اُس رو کا عکس دکھاتے اور جن پر کاؤنٹر مین کی نظر رہتی، مگر چوری پھر بھی ہو رہی تھی۔ اگلے دو دن میں مَیں نے جائزہ مکمل کر لیا کہ چوری کیسے ہوتی ہے۔ مثلاً ایک رو میں لمبے قد کا نیگرو کیمرے کی طرف پشت یا منہ کر کے کھڑا ہے اور اُس کے سائے میں دوسرا آدمی بیٹھ کر کارروائی ڈال رہا ہے۔ اِسی طرح ایک نیگرو عورت چار پانچ بچوں کے ساتھ تشریف لائی ہیں، ایک بچے کے سر میں کرلنگ رول (Curling Roll) یا کنگھی اٹکی ہوئی ہے، مگر جب وہ اپنی فوج کے ساتھ واپس جاتی ہے تو ہر ایک کے سر میں تین چار کنگھیاں (Combs) ہیں۔ اُس نے ایک پونڈ کی خریداری کی ہے اور 10 پونڈ کی چوری۔ کنگھیاں اور کرلنگ رول سر میں اڑائے رکھنا فیشن بھی ہے اور بالوں کے ڈیزائن کے لیے بھی وہ استعمال کرتے ہیں۔ اگر کاؤنٹر مین نے پوچھ لیا تو اُس نے سر آ جانا ہے کہ ''تم ہمیں چور سمجھتے ہو، یہ تو ہم گھر سے لگا کر لائے تھے۔ ہم دوبارہ تمہارے سٹور پر کبھی خریداری کو نہیں آئیں گے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ اب کاؤنٹر مین ہر وقت تو کیمرہ ٹی وی پر یا شیشے پر نظر نہیں رکھ سکتا، اُسے بہت زیادہ کسٹمرز بھی ڈیل کرنا ہوتے ہیں۔

میں نے کچھ باتوں کے آسان سے حل ڈھونڈ لیے، مثلاً جب ایسی بچوں والی عورت سٹور میں داخل ہوتی تو میں آگے بڑھ کر بچوں سے اور اُس عورت سے مخاطب ہوتا۔

''ہائے بے بی، ہائے ماسٹر، کیا بات ہے میم، ماسٹر کے بالوں میں کنگھی ہے، جبکہ باقی بچوں کے نہیں، کیا انہیں یہ سٹائل پسند نہیں۔؟ ضرور آپ ان کے لیے کومب (Combs) سیکشن میں خریداری کے لیے آئی ہوں گی۔'' وغیرہ وغیرہ

اب میڈم یا اُن کے بچوں کے لیے یہ چوری ناممکن ہوگئی، کیونکہ میں کنفرم کر چکا تھا کہ کنگھی بس ایک کے سر میں ہے۔ پھر یوں ہوتا کہ میڈم بے دلی سے ایک آدھ پونڈ کی خریداری کرتی یا ایسے ہی چکر لگا کر منہ بناتی ہوئی نکل جاتی۔ اُس کے جانے کے بعد ہم خوب ہنستے۔ ویسے بھی میں کونسا اُس کا پیچھا چھوڑتا تھا۔ اُس کے ساتھ سپیشلسٹ کے طور پر لگ جاتا اور اُسے خریداری میں مشورے بھی دیتا۔ خیر یہ تو ایک مثال تھی۔ مَیں ایسے کئی ٹوٹکے ایجاد کر چکا تھا جس سے چوری میں کافی کمی محسوس ہو رہی تھی اور ناچتی آنکھوں اور پارے کی طرح مچلتے جسموں والے لوگوں کی آمد سٹور میں واضح طور پر کم ہوئی تھی۔ یہ لوگ اگر آتے بھی تھے تو اُن کی نظریں واضح طور پر میری نقل و حرکت پر ہوتی تھیں اور میری اُن پر۔ یوں ایک دلچسپ Tussel جاری تھی، مگر اس کے باوجود کوئی نہ کوئی واقعہ دوسرے تیسرے دن ہو جاتا تھا۔ سٹور کا مالک سعید بہت خوش تھا۔

''ہیلو خان! عیسائی بننے کے متعلق کیا خیال ہے۔''

یہ میرا دوست اشفاق تھا جو موبائل پر مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ یہ خاصا دل والا آدمی ہے اور اُس کی سب سے بڑی خوبی اُس کی باتوں کا وہ جال ہے جس میں آیا ہوا پرندہ بس پر ہی پھڑ پھڑاتا ہے، اُڑنا اُسے بہت بعد میں یاد آتا ہے۔

''یار، پہلے ہی کونسے پکے مسلمان ہیں ہم''

''پھر شام 5 بجے تیار رہنا۔ دو دلچسپ کرداروں سے ملاقات اور ڈنر ہے آج، باس کو بتا کر جلدی چھٹی کر لینا۔''

پھر اس نے جو تھوڑی سی تفصیل بتائی اس سے پتہ چلا کہ دو امریکن لڑکیاں تبلیغ کے مشن پر صاحب سے ٹکرا گئیں تھیں پھر کیا ہونا تھا......؟ اُس کی باتوں کی مکڑی نے جالا بننا شروع کر دیا۔ اُن کی باتوں میں زبردست دلچسپی ظاہر کی اور بتایا کہ اُس کا ایک دوست (یعنی میں) تو اُس سے بھی زیادہ حق کا متلاشی ہے۔ اِس طرح آج ہماری ملاقات اور ڈنر وغیرہ طے تھا۔ دونوں بیچاریوں

کو چرچ میں جہاں اُن کا قیام تھا یہ جھوٹ بولنا تھا کہ کسی **Female** کے ساتھ اُن کی ملاقات ڈنر پر طے ہے جو دین کے متعلق جاننا چاہتی ہے۔

سعید نے خوش دلی سے مجھے چھٹی دی اور جب اشفاق اُن دونوں کے ساتھ آیا تو اُن کا اس سے بھی تعارف کرایا اور ساتھ ہی کہا کہ یہ بھی تم سے کچھ جاننا چاہتا ہے، اگلی ملاقات میں اِس سے بھی بات ہوگی۔ تو وہ بہت خوش ہوئیں کہ ڈھیر سارے مسلمان عیسائیت کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ سعید نے ہنس کر مجھ سے پوچھا

''یار یہ کیا ڈرامہ بازی ہے''

''کل بتاؤں گا باس...... بائے''

اشفاق کیمرہ وغیرہ لے کر آیا تھا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور دونوں ہولی ورکرز نے مجھ پر طبع آزمائی شروع کر دی تھی اور میں انہیں چُن چُن کر مشہور شاعری سے یا خود گھڑ کر صلیب اور حضرت عیسیٰؑ کی قربانی سے متعلقہ شعر سنا رہا تھا اور ساتھ ساتھ کبھی میں اور کبھی اشفاق انگلش میں ترجمہ کرتے جا رہے تھے۔ یہ ہمارا اپنا ٹریک تھا اور اُن بیچاریوں کو تبلیغ بھولتی جا رہی تھی۔ پھر اشفاق نے گانا شروع کر دیا۔ یہ اُس کی ایک اور خوبی ہے۔ وہ اونچے سُروں کا اچھا گلوکار ہے۔ اُس کی آواز کا رچاؤ بات سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اُنہیں متاثر کر رہا تھا۔ پھر میں نے ساتھ ساتھ اچھی بُری ٹرانسلیشن بھی شروع کر دی۔ اشفاق نے انہیں بتایا کہ میں بھی ایک شاعر ہوں اور اُس نے میری ایک غزل گانی شروع کر دی، اُس نے میری کئی غزلوں کی دھنیں خود تیار کی ہوئیں تھیں۔

؎ یا میرے جسم کو سُکھ سیج مہیا کر دو　　یا میری روح بھی سولی پہ چڑھا دی جائے

اس شعر کو گا کر مجھے ترجمہ کا حکم دیا، کیونکہ ہم اُن ہولی ورکرز **(Holy Workers)** کی حِس کو بھی تسکین دینا چاہتے تھے۔ اس شعر کے ترجمہ پر انہوں نے خوب داد دی، کیونکہ اس میں سولی کا ذکر بھی تھا اور ترجمہ بھی میں نے ماحول کے مطابق کیا تھا جو کہ اُن کے مطلب کے مطابق تھا۔ انہیں جب چرچ سے فون موصول ہوا تو وہ چونک پڑیں

’’ارے اتنا وقت ہو گیا۔ اب ہمیں کہیں بیٹھ کر بات کرنا چاہیے۔

ہم اُنہیں ساؤتھ ہال کے علاقہ میں ایک سردار جی کے ریسٹورنٹ میں لے آئے۔ سردار جی سے پوچھا

’’بابیو! کوئی حلال چیز وی اے۔‘‘

’’لو جی اِیسے سیاپے پاروں اساں ساریاں چیجاں ای حلال رکھیاں نیں‘‘

سو ہم نے پکوڑوں، تکوں، کبابوں اور ایک کری کے ساتھ ساتھ دال اور بریانی کا آرڈر دیا۔ سپلائی کے ساتھ ساتھ ہم اپنی مہمانوں کو اُن کھانوں کے ناموں سے آشنا کرتے رہے۔ ساؤتھ ہال کے علاقہ میں ہمارے دیسی ریستورانوں میں گورے ذرا کم کم ہی کھانے آتے ہیں اس لیے یہ دونوں سردار جی اور اُن کے سردار ملازموں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث تھیں۔ اس لیے ہماری دیکھ بھال ذرا اچھے طریقے سے ہو رہی تھی جسے وہ ہماری خاص گڈ ول (Good will) سمجھ کر مرعوب ہو رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک کا نام Sufi تھا اور دوسری کا نام یاد نہیں آ رہا۔ وہ امریکہ کی ایک چھوٹی سی ریاست یوٹا (UTAH) سے تعلق رکھتی تھیں اور بقول اُن کے وہاں مذہبی عنصر اتنا زیادہ تھا کہ اُس ریاست کے اوپر پرواز کرنے والے جہازوں میں بھی اُس ریاست کی حدود میں شراب سپلائی نہیں ہو سکتی تھی۔ واللہ عالم بالصواب۔ صُوفی کا قد میرے برابر تھا، مگر ایک تو پتلی اور دوسرے عورت ہونے کی وجہ سے، بہت لمبی لگتی تھی۔ صورت بس واجبی تھی، مگر دوسری یوٹا والی مناسب جسم والی، خاصے اچھے مال و اسباب کے ساتھ خاصے کی چیز لگتی تھی۔ ہماری خوش گپیاں سن کر اور ’’پکورے‘‘ ’’ٹکا‘‘ اور ’’ڈال‘‘ وغیرہ کھا کر اُن کی سُوں سُوں اور کُھلے ہاسے سارے ریستوران کے لیے مزے دار تھے۔

اُن کے لیے دوبارہ چرچ سے فون آیا تو پتہ چلا 9 بج چکے ہیں اور انہیں 10 بجے سے پہلے چرچ واپس پہنچنا ہے۔ چرچ سے باقاعدہ اُن کا رابطہ اور وہاں سے اُن کی نگرانی رہتی تھی، لیکن

یوں ہم انہیں کیسے واپس جانے دیتے کہ ابھی تو ہمارا دل بھی نہیں بھرا تھا، لیکن ہم ریسٹوران سے اُٹھ گئے۔ ہماری باتیں غور سے سننے اور چرچ کی مداخلت سے بچنے کے لیے انہیں کچھ دیر کے لیے اپنا فون بند بھی رکھنا پڑا تھا اور پھر کچھ گھنٹے گم ہو گئے۔

بارہ بج کر کچھ منٹ پر ہم نے اُنہیں چرچ سے کچھ دور اُتارا تا کہ چرچ سے ہمیں دیکھا نہ جا سکے۔ تب تک وہ مسلمانوں کے متعلق اس راز سے آگاہ ہو چکی تھیں کہ خدا دونوں کا ایک ہے۔ نبی مختلف ضرور ہیں، مگر تعلیمات دونوں کی راستی کے لیے ہیں۔ باقی سب بکھیڑے ہیں۔

یہ باتیں اگلے دن میں نے سعید کو بتائیں تو وہ خوب ہنسا۔

سفر ہے شرط............

وہ جھجکتے ہوئے قدموں سے سٹور میں داخل ہو رہی تھی۔اُس کے ساتھ ہماری ایک ریگولر کسٹمر بھی تھی۔سوائے قد کے اُس کی ہر چیز بہت بڑی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، بڑے بڑے سڈول کولہے جو پینٹ میں پھنسے ہوئے تھے اور سینہ، خدا کی پناہ، لگتا تھا شرٹ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ قد درمیانہ تھا یعنی عام کالیوں سے کافی کم۔ جھجک کہہ رہی تھی کہ اس ایریا میں ہی نہیں شاید انگلینڈ میں بھی نئی ہے۔میں نے حسبِ عادت سکیورٹی کے نقطہ نظر سے اُس پر نظر ڈالی تھی مگر نظر اُسی میں الجھ گئی اور میری طبیعت کی چڑچڑاہٹ جو صبح سے موجود تھی ہوا ہوتی محسوس ہوئی۔ دراصل پچھلے دنوں سے کافی سردی پڑ رہی تھی اور مجھے پچھلے سال سے یہ عارضہ لاحق ہو گیا تھا کہ سردی کے دنوں میں میرے خراٹے سب کو ڈسٹرب کرتے تھے۔پچھلی دو راتوں سے میرے پاکستانی روم میٹ نے یہ وطیرہ پکڑا تھا کہ جب بھی میرے خراٹے تیز ہوئے وہ کسی نہ کسی چیز سے مجھے ہجوکا دیتا۔ میں جاگ پڑتا تو وہ آرام سے سو جاتا کیونکہ اُسے پتہ تھا کہ اب مجھے کافی دیر نیند نہیں آئے گی۔ یوں پچھلی دو راتوں سے میں تقریباً جاگ رہا تھا اور وہ آرام سے سوتا رہا تھا۔گو کہ ہماری مُنہ ماری بھی ہوئی تھی، مگر حقیقتاً قصور نہ میرا تھا نہ اُس کا۔سو اس لیے میں چڑچڑا سا ہو رہا تھا۔اس کے علاوہ میرا روم میٹ پیسے پیسے پر مرنے والا آدمی تھا۔میرے پہلے ہفتے کے آخر پر جب سعید ہمیں تنخواہ دے رہا تھا تو اُس نے اُس کے ساتھ کافی بحث کی۔ پتہ چلا کہ یہ اُسکی روٹین ہے۔(گھر کے خرچ

کے سلسلہ میں وہ میرے ساتھ بھی ایسے ہی کرتا تھا جس سے مجھے چڑھی) جب سعید نے مجھے تنخواہ کا لفافہ دیا تو میں نے حسبِ عادت بغیر رقم گنے اُسے جیب میں ڈال لیا۔سعید نے کہا

’’خان، گن تو لو پورے بھی ہیں‘‘

’’پورے ہی ہونگے بھئی، تم نے کیا بے ایمانی کرنا ہے؟ چند پونڈ کی بے ایمانی سے تمہارا کیا بنے گا؟‘‘

میرے اِس جواب پر وہ خوش ہوگیا اور بولا

’’خان! تمہارے اِس روم میٹ کی طرح جو لوگ رقم کو گن گن کر رکھتے ہیں، اللہ اُنہیں اُتنا ہی دیتا ہے جتنا وہ گن سکیں۔ جو اس طرف سے بے پرواہ رہتے ہیں، وہ پرواہ کرنے والا اُنہیں بے حساب دیتا ہے۔ یقیناً تم کبھی بھی خالی ہاتھ نہ رہو گے‘‘

سوا پنے روم میٹ کی اِن حرکتوں سے میں کافی بوریت محسوس کر رہا تھا۔

اُس نے اپنی سہیلی کے ساتھ سٹور کا چکر لگایا۔ لگتا تھا سہیلی اُسے صرف سیر کرانے یا علاقہ سے واقف کروانے نکلی ہے۔ ایک آدھ چھوٹی موٹی چیز اُٹھائی۔ میری نظریں پیشہ ورانہ ضرورت کے طور پر اور کچھ دلچسپی کی وجہ سے اُن پر رہیں۔ اُس نے میری چُبھتی ہوئی نظریں اپنی زنانہ حِس سے محسوس کر لیں اور اپنی سہیلی سے کچھ کہا۔ اُس نے سنتے ہی چونک کر مجھے دیکھا اور ہنس کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر میری طرف بڑھی، مگر اُس نے ہاتھ کھینچ کر اسے روک دیا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی اشیاء کی کاؤنٹر پر پے منٹ کی اور دروازے کی طرف بڑھیں۔ میں جلدی سے اُن کے پیچھے گیا تو کاؤنٹر والے نے پوچھا

’’کیا ہوا؟‘‘

میں ’’کچھ نہیں‘‘ کہہ کر باہر نکلا۔ وہ ابھی پاس ہی کھڑی شاید اگلی سمت متعین کر رہی تھیں کہ میں پہنچ گیا۔ میں نے کہا

"ایکسپوزری"

''یس خان؟'' اُس کی سہیلی اور ہماری ریگولر کسٹمر سوالیہ انداز میں بولی

"I have a question, but not from you, from this gorgious girl only"

''میرا ایک سوال ہے، مگر تم سے نہیں، اس شاندار لڑکی سے ہے''

''کیا......؟'' دونوں نے بیک وقت پوچھا

''تم نے یہ بڑی بڑی چیزیں کیسے بنائیں''۔

"How you develops all these busty things"

میرا سوال تھا، مگر میری آنکھوں کا اشارہ اُس کے سینے کی طرف تھا۔ اُس کی سہیلی کھلکھلا دی۔ وہ شرماتے ہوئے، مگر تیکھے لہجے میں بولی

"You mean, you dislike it"

''تمہارا مطلب ہے تمہیں یہ ناپسند ہیں''

"Oh. God! You are kidding, What are you saying? These are killing things for all, Killing for me particularly"

''میرے خدا! تم مذاق کر رہی ہو۔ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ تو سب کو مار دینے والی چیزیں ہیں، خاص کر مجھے مار دینے والی''

میں نے اُس کی شرارت سمجھتے ہوئے صاف لہجے میں کہا۔ اُس کی سہیلی نے تعجب سے کہا۔

''جیڈ، تم نے تو پہلے ہی دن ایک قدردان پالیا''

"You have got a praiser very first day Jade"

سہیلی ہنستے ہوئے مزید بولی

"What a handsome guy, but be careful, he seems me prank

یعنی ''کیا ہینڈسم لڑکا ہے، مگر محتاط رہنا، یہ مجھے شوخ لگتا ہے''

میں نے فوراً احتجاجاً کہا

"It is very wrong judgment about me, I am very serious"

''یہ بہت غلط تاثر ہے، میں بہت سنجیدہ ہوں''

"Serious? wao, In very few minutes, never seen before."

''سنجیدہ؟ صرف چند منٹ میں ہی، ایسا تو کبھی نہیں دیکھا۔'' اُس نے طنزیہ لہجے میں تبصرہ کیا۔

اور میں انہیں پہلی نظر میں محبت پر زور وشور سے لیکچر دینے لگا۔ ہم فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ کاؤنٹر مین جھانک کر دیکھ گیا تھا کہ سب او کے ہے۔ کئی کسٹمرز مجھے ہائے خان اور کئی اُس کی سہیلی کو ہائے جیکی کہہ کر گزر چکے تھے۔ کالوں میں گوروں کے برعکس ہیلو ہائے کا خاصا رواج ہے۔ القصہ مختصر کہ پندرہ بیس منٹ بعد جب میں نے اُن کی جان چھوڑی تو وہ رات کو میرے ساتھ برگر اور کافی کھانے کا وعدہ کر چکیں تھیں۔ فی الحال مجھے جیڈ کے ساتھ جیکی (جیکولین) کو بھی برداشت کرنا تھا۔

اگلی چند ایک ملاقاتوں میں اُس کی ہر شے اور ہر بیک گراؤنڈ کھل کر میرے سامنے آ چکی تھی۔ بلکہ اُس کی سہیلی کی بھی ہر چیز میرے سامنے آ گئی۔ وہ یوگنڈا سے آئی تھی اور انیسویں سال میں تھی۔ جیکی اُس کی عزیز تھی، اُس سے تین سال بڑی تھی اور اب ایک برٹش کے ذریعے کا غذات پکے کر کے اُس سے جان چھڑا چکی تھی۔ اُسی نے شرمیلی جیڈ کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ یوگنڈا کیونکہ کامن ویلتھ کا ممبر تھا اس لیے یہ انٹری مشکل نہ تھی، مگر اصل مسئلہ کسی مناسب برٹش کی تلاش کا تھا۔ یہ اُس کے بقول اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے مَیں مل گیا تھا جس سے اُس کا دل بھی مل گیا تھا۔ بھلا مجھ سے اچھا اور پکا برٹش کون ہوسکتا تھا۔

یہ بات مجھے جیڈ کے ذریعے ہی معلوم ہوئی کہ گوروں اور کالوں میں بھی بہت سی لڑکیاں 20-19 سال کی عمر کو پہنچنے تک بھی کنواری ہوسکتی ہیں۔ اُنہی لوگوں کے طفیل مجھے کالوں کا رف Rough لہجہ سمجھنے کا موقعہ ملا۔ جس نے بعد میں میری امریکہ میں بہت مدد کی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ گوروں کے برعکس کالے فیملی لائف پسند کرتے ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا کمپلیکس اُن کے نین نقش نہیں ہیں بلکہ اُن کی جلد اور بال ہیں۔ جس کے لیے کاسمیٹکس کی خریداری پر وہ بہت خرچ کرتے ہیں۔ (اس کا مجھے اسٹور پر کچھ کچھ تجربہ بھی تھا)۔ اکثر لوگ اپنی فطرت میں بہت بھولے بھالے ہوتے ہیں (جیسی کہ یہ خود تھی)، مگر چونکہ ان کے ڈیل ڈول سے دوسرے مرعوب ہوجاتے ہیں، اس لیے اُن میں سے کچھ شر پسند اِسی ڈیل ڈول کو بدمعاشی کا ذریعہ بنالیتے ہیں جس سے سب بدنام ہوتے ہیں۔ ان میں غربت کی وجہ بچوں کا زیادہ ہونا، مناسب حد تک تعلیم نہ ہونا اور کچھ کچھ گوروں کا ترجیحی سلوک بھی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ہماری ملاقاتیں جاری رہیں، یورپ کی زبان میں کسی سریس تعلق سے پیشتر ہم ایک دوسرے کو سمجھ رہے تھے، لیکن شاید اُس نے مجھے سارا سمجھ لیا تھا۔ اس لیے اب وہ سریس ہوچکی تھی، لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنے ٹور کے آخری دنوں میں تھا۔ میں نے سعید کو کام چھوڑ دینے کے متعلق بتادیا تھا۔ پرسوں شام کے وقت میری فلائٹ تھی اور آج کام پر آخری دن۔ شام کو میں نے اور جیڈ نے کچھ وقت اکٹھے گزارا۔

کہنے لگی، ''جیکی کہہ رہی تھی، یہ بندہ گھن چکر ہے۔ اس کی آنکھوں میں ذرا دور تک دیکھو تو وہاں تجربہ اور پتھر نظر آتے ہیں، مگر یہ اُس وقت نظر نہیں آتے جب آدمی خود اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہو بلکہ اِسے اُس وقت دیکھو جب وہ کسی اور کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہو۔ بات ایسے کرتا ہے کہ میں تو اس کے اعتماد کے سامنے خود کو بچہ محسوس کرتی ہوں''۔ پھر بتانے لگی کہ جیکی کہہ رہی تھی کہ ''یہ آدمی سنجیدہ نہیں ہے، کسی اور کو دیکھتے ہیں۔ پر میں نے اُسے کہا ہے کہ مَیں بچی نہیں

ہوں۔اُس کے لہجے میں اعتماد بول رہا تھا،اُس نے مجھے **Speachless** کر دیا۔پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ کیا میں ابھی تک کسی فیصلہ پر نہیں پہنچا؟''

میں آج اُسے بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔اُسے بتانا چاہتا تھا کہ میں پاکستانی ہوں اور برطانوی شہریت نہیں رکھتا۔پاکستان میں مَیں شادی شدہ ہوں اور مجھ سے اُس کی لگی ہوئی امیدیں بار آور ثابت نہیں ہوسکتیں،اور یہ بھی کہ تم نے اپنی کزن سے غلط کہا ہے کہ 'تم بچی نہیں ہو '۔تم ذہنی طور پر ابھی **Immature** ہو۔

میں اُسے یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ میں آج کام چھوڑ کر، بلکہ اُس کی یہ دُنیا چھوڑ کر جارہا ہوں، مگر اُسکے پُر اعتماد لہجے نے اور اُسکی آنکھوں کی جوت نے مجھ سے میرے الفاظ چھین لیے۔میں بے بس ہو گیا اور سوائے اس کے کچھ نہ کہہ سکا کہ

''پرسوں رات ڈنر اکٹھے کریں گے اور ڈنر پر ساری بات ہو گی''۔وہ خوش ہو گئی اور بولی **"Sure"**؟۔میں نے کہا **"Why are you doubted"**۔تمہیں شک کیوں ہے۔

میں نے اُسے تسلی دی، ساتھ لگایا اور الوداع کہا۔ہمیشہ کے لیے شاید۔

تیسرے دن ایئر پورٹ سے میں نے سٹور پر الوداعی فون کیا تو میرے روم میٹ نے بتایا کہ سٹور کھلتے ہی جیڈ بن ٹھن کے پہنچی تھی۔اب تک کئی چکر لگا چکی ہے اور شام کو تو رو ہی پڑی تھی۔

''یار اُسے کیا بتاؤں؟''

میں شرمندہ سا ہو گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا، بلکہ کہا۔

''پھر ملیں گے یار۔جہاز پر جانے کے لیے اناؤنسمنٹ ہو رہی ہے''

اناؤنسمنٹ واقعی ہو رہی تھی۔میں نے فون بند کیا اور بھاری قدموں سے پسنجر لاؤنج سے جہاز پر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔میں نے فون دوبارہ سوئچ آف کر دیا۔جو پچھلے دو دن سے بند تھا اور ابھی چند منٹ کے لیے میں نے کھولا تھا۔اس دوران جیڈ کی دو کالیں ویٹنگ میں مس ہو گئیں تھیں۔

عشق ۔ زیرکی کا دشمن

میں سڑک پر نامحسوس انداز میں گشت کر رہا تھا اور میری نظریں ایک مخصوص دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ہر پانچ سات منٹ بعد میں ٹیلیفون کر کے اپنے دوست اشفاق سے بات کرتا جو اُس مخصوص گھر میں اپنی نو بیاہتا بھابھی کے ساتھ تھا۔ میرے پاس مناسب اسلحہ بھی موجود نہیں تھا۔ ایک زبردست Tension کی فضا تھی۔

اشفاق نے کل مجھے فون کر کے آج آنے کو کہا تھا اور ساتھ یہ بھی کہا تھا

”یار ! وہی بھابھی والا مسئلہ ہے، ذہن میں رکھنا ۔ کل دس بجے فنز بری پارک (Finsbury Park) کے اسٹیشن پر ملاقات ہوگی“

اُسے پتہ تھا کہ میں اور طرح کا بندہ ہوں، میرے لیے یہی کافی تھا کہ دوستوں کو میری ضرورت ہے اور بس۔ اس لیے وہ تفصیل میں نہیں گیا تھا اور میں نے بھی نہیں پوچھا تھا کہ جو ہوگا کل سامنے آ جائے گا۔ تھوڑے دن قبل میرے دوست اور اشفاق کے سگے بھائی ممتاز کی شادی اُس لڑکی کے ساتھ اشفاق نے کروائی تھی۔ جس سے وہ صاحب کافی عرصہ سے عشق فرما رہے تھے۔ ممتاز کا لندن میں گارمنٹ کا سٹور تھا، والتھم سٹو (Waltham Stow) کے علاقہ میں۔ وہیں اس کی ملاقات اُس لڑکی سے ہوئی اور پھر بات چل نکلی اور دور تک چلی گئی۔ ممتاز پاکستان میں شادی شدہ اور بال بچے دار تھا، لیکن صاف گو تھا۔ لڑکی کو بھی بتا دیا، مگر دونوں کے عشق

میں کوئی فرق نہ آیا، لیکن بات جب لڑکی کے والدین تک پہنچی تو انہوں نے شادی سے صاف انکار کر دیا اور لڑکی کی ممکنہ حد تک نگرانی بھی شروع کر دی۔

اس نگرانی سے کچھ فرق تو پڑا، مگر دونوں دیوانے ملتے رہے۔ اب لڑکی کے والدین نے ممتاز کو دھمکیاں دینا شروع کر دیں اور ساتھ ہی لڑکی پر سختی شروع کر دی۔ اُسے ایک طرح سے گھر میں مقید کر لیا۔ کسی ضروری کام کے سلسلہ میں بھی اُسے کسی اعتماد والے کی زیر نگرانی ہی باہر جانے کی اجازت ملتی۔ جی ہاں! یہ سب لندن جیسے شہر میں ہو رہا تھا۔ لڑکی کے والد اور چچا پیشہ کے لحاظ سے قصاب تھے اور انہوں نے لڑکی سے کہا تھا کہ وہ دونوں کو ''وڈ'' دیں گے یعنی کاٹ دیں گے۔ اس وجہ سے لڑکی بہت خوفزدہ ہو گئی تھی، مگر عشق پیچا کسی نہ کسی طرح جاری تھا۔ اب اس عاشق جوڑے کی خوش قسمتی یا لڑکی کے والدین کی بدقسمتی کہ اس Tussel میں میرا اور اشفاق کا قدم لندن میں آ پڑا۔ ہم اپنے ذاتی پروگراموں کے تحت لندن وارد ہوئے تھے، مگر ممتاز نہ صرف میرا دوست تھا بلکہ اشفاق کا سگا بھائی بھی تھا۔ وہ اللہ کا بندہ عاشق ہونے کے باوجود "Hesitant" تھا، مگر اب جب کہ ہم دونوں نے قدم رنجہ فرمایا تھا تو یہ کوئی عام بات نہ تھی۔

اگلے چند دنوں میں ممتاز اور لڑکی دونوں کو Encourage کر دیا گیا اور پھر ایک دن کمانڈو ایکشن ہوا۔ لڑکی اپنی خاص کزن کم سہیلی کے ساتھ نکلی تو واپس نہ گئی۔ اگلے چند گھنٹے میں اُن کا نکاح ہو چکا تھا اور کنٹری سائیڈ کے ایک بڑے ہوٹل میں اُن کا حجلہ عروسی تیار تھا۔ جہاں وہ دونوں سہاگ رات کے لیے چلے گئے اور ہم لوگ فلیٹ پر پولیس کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے یا پھر دوسری صورت میں چُھریوں کا مقابلہ کرنا تھا جو ''اب'' بھابھی کی سہیلی کے بقول تیز کی جا رہی تھیں۔ اُسے دھمکا کر تمام صورتِ حال معلوم کی جا چکی تھی۔ بہرحال آدھی رات کو پولیس نے چھاپہ مارا۔ ادھر بیان پہلے ہی تیار تھا۔ انہیں بتایا گیا کہ لڑکی آئی ضرور تھی، مگر کوئی اغواء وغیرہ نہیں ہوا۔ وہ جوان ہے اور اپنی مرضی سے مسٹر ممتاز کیساتھ موج میلے کے لیے جا چکی ہے۔ انہوں نے

سوال جواب ضرور کیے، مگر سامنے بھی اشفاق جیسے پلے پیڈے لوگ تھے۔ دراصل لڑکی کے والدین نے اغواء کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ پولیس ممتاز اور لڑکی کا ٹھکانا پوچھتی رہی، مگر ادھر سے لاعلمی کا اظہار ہوتا رہا۔ بالآخر وہ مسٹر ممتاز کے لیے پیغام دے گئے کہ جونہی اُس سے رابطہ ہو اُسے بتایا جائے کہ پولیس اُس سے انٹرویو کرنا چاہتی ہے۔

اگلے دن پوری ذہنی تیاری کے ساتھ مسٹر اور مسز ممتاز پولیس سٹیشن میں تھے۔ پولیس نے صرف لڑکی سے چند ایک سوالات کیے اور مطمئن ہو گئے کہ دو بالغ لوگوں نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا۔ سو نو پرابلم۔ بلکہ انہوں نے دونوں کو شادی کی مبارکباد دی اور کہا کہ وہ لڑکی کے والدین سے رویہ درست رکھنے کی بات کریں گے۔ اُسی دن نئے جوڑے کی ہنی مون کے لیے جرمنی کی فلائٹ تھی۔ وہاں ممتاز کو ہمارے لیے **"Class"** کمپنی میں ہارویسٹر کے ہیڈرالک پمپ بھی آرڈر کرنے تھے جن کے متعلق ڈسکس کے لیے اور خرید کے لیے ہم نے اپنا یہ دورہ رکھا تھا۔ یہ انگلینڈ میں بھی دستیاب تھے، مگر اصل میں جرمن میڈ تھے اور وہاں سے سستے ملنے کی اُمید تھی۔ بعد میں ہمیں یہ پاکستان میں فروخت کرنا تھے۔ شادی بیاہ کے مسئلے کے باوجود ہم نے یہ سب ہوم ورک مکمل کر لیا تھا اور فیصلہ ہوا تھا کہ جرمن کمپنی سے خریدنے میں فائدہ ہے۔ سو اب ممتاز نے ہنی مون کے ساتھ یہ کام بھی کرنا تھا۔ یعنی ایک پنتھ دو کاج۔

چند دن بعد ممتاز ہنی مون سے واپس آ گیا۔ پمپ آرڈر ہو چکے تھے اور اُن کی پاکستان میں ڈلیوری تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ملنی تھی۔ اشفاق کا مذکورہ فون جو موصول ہوا تو بات یہ تھی کہ جرمنی سے واپسی پر ممتاز نے اپنی بیوی کو اپنی اُسی کزن کے ساتھ رابطے کی اجازت دے دی تھی۔ مقصد جو بھی تھا، مگر بات چل پڑی تو والدہ کی غشی، گھر والوں کی بے عزتی اور پتہ نہیں کیا کیا شروع ہو گیا، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہ والد اور چچا کہتے ہیں کہ جب بھی داؤ لگ گیا تو دونوں کو بس ''گھڑچ'' کر دینا ہے۔ اشفاق نے بھائی کو روکا بھی کہ جب تک کم از کم **"Pregnancy"** نہ ہو جائے بھابھی کو

والدین سے دور ہی رکھو، مگر ہمارے ممتاز بھائی ان معاملات میں اللہ لوک ہیں۔ بیوی نے ماں کو ملنے پر زور دیا تو مان گئے۔ ممتاز نے اپنی ایک جاننے والی خاتون کو جو کہ نکاح میں بھی شریک تھیں تیار کیا۔ ممتاز کو ہم نے خود نہ جانے دیا۔ سو اب میں، اشفاق اور ساتھ وہ خاتون بھابھی کو لے کر اُس کے والدین کے گھر ماں کو ملانے لائے۔ پروگرام کے مطابق مجھے سٹریٹ کے باہر ہی اتر جانا تھا۔

میرا کام یہ تھا کہ مجھے ہر پانچ سات منٹ بعد اپنے موبائل سے یا سٹریٹ کی نکڑ پر لگے فون بوتھ سے اشفاق کو فون کرنا تھا اور احتیاطاً تھوڑی مختلف آوازیں بنا کر بات کرنا تھی۔ میرے علاوہ ممتاز اور ایک آدھ دوست کو بھی اشفاق سے مسلسل رابطہ میں رہنا تھا۔ اُدھر اشفاق کا کام یہ تھا کہ اُس نے ہر فون کال کے جواب میں بتانا تھا کہ وہ اس وقت کہاں بیٹھا ہے۔ اُسے اُس گھر میں اس بات کا بھی دھیان رکھنا تھا کہ بھابھی کو اُس کی یا اُس خاتون کی نظروں سے اُس گھر میں اوجھل نہ کیا جا سکے۔ یعنی بھابھی کو صرف ڈرائنگ روم تک محدود رہنا تھا اور اشفاق وغیرہ کو خیال رکھنا تھا کہ جو بھی چاہے وہیں ملاقات کرے۔ ایسا نہ ہو کہ اُسے اکیلے میں کمرے میں بلا کر دھمکایا یا بلیک میل کیا جائے۔

میرا دوسرا کام یہ تھا کہ خطرے کی صورت میں اشفاق نے فون کے ذریعے یا گھر سے کسی بھی صورت میں باہر نکل کر شور کرنا تھا اور پھر مجھے دیوانہ وار موو (Move) کرنا تھا۔ سب سے بڑی ترجیح کسی بھی صورت میں بھابھی کو اُس گھر سے باہر نکالنا تھا کہ وہ اب ہماری عزت تھی۔ اس کے لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ مجھ سے زیادہ اشفاق کو خطرہ تھا کہ پہلا اٹیک اُسی پر ہونا تھا اور خطرہ کی صورت میں اُسی نے کسی بھی حالت میں مجھے آگاہ بھی کرنا تھا، مگر وہ دلیر آدمی تھا اور میں تو تھا ہی مست ملنگ۔ ہماری اس ساری احتیاط کے باوجود کوئی بھی انہونی ہو سکتی تھی، مگر ہمیں اپنی سی تو کرنی ہی تھی۔ شکر ہے کہ کچھ بھی نہ ہوا۔ لڑکی کا چچا گھر پر ہونے کے باوجود شاید ہماری حکمتِ عملی کی وجہ سے کوئی دلیری نہ دکھا سکا اور اشفاق کافی دیر بعد...... بلکہ مجھے تو لگا جیسے صدیوں بعد...... بھابھی اور اُس خاتون کے ہمراہ برآمد ہوا اور بات ختم ہو گئی۔

بعد میں عقل مندوں نے کافی باتیں کیں کہ اس پاکستانی سٹائل کی ضرورت نہ تھی۔ لڑکی صرف پولیس کو اطلاع دیتی کہ وہ اپنی ماں سے ملنے جا رہی ہے تو پولیس اُس کے والدین کو وارننگ دیتی اور بات ختم۔ لیکن انہیں اس چیز کا ادراک نہیں تھا کہ غیرت میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ غیرت میں اگر وہ کچھ کر جاتے تو کیا ہم پولیس سے درخواست کرتے رہ جاتے؟ لڑکی اُن کے پاس ہوتی تو وہ اُسے دھمکا کر یا ترلے واسطے سے کوئی بھی بیان دلا دیتے اور پھر کیا ہماری غیرت یہ گوارہ کرتی؟ یہ اور طرح کی باتیں تھیں جو ہم جیسے پاگل ہی سوچتے ہیں۔ کسی سیانے کا قول ہے کہ ''عزتیں تو جذباتی ہو کر ہی بچائی جا سکتی ہیں'' گو یہ کچھ بعد کی باتیں ہیں، مگر بر سبیل تذکرہ عرض ہیں کہ ممتاز نے بھابھی کو والدین سے کچھ عرصہ دور رکھنے کی بات جو کہ اشفاق نے سمجھائی تھی، اپنی نوبیاہتا بیگم کے کہنے پر نہ مانی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ہم پاکستان پہنچ گئے۔ اُس کی بیگم والدین کے ہتھے چڑھ گئی اور بالآخر طلاق ہو کے رہی۔

انگلینڈ میں والدین کے اسی رویے کی بدولت ایشین (Asian) لوگوں میں بھی طلاق کی شرح کچھ کم نہیں ہے۔ بڑے بوڑھے کمائی یا سہولتوں کے شوق میں انگلینڈ میں ڈیرہ تو لگا بیٹھے ہیں۔ خود جوانی میں ایڈجسٹ ہونے کیلیے جو بھی کیا، مگر بچوں سے وہی پاکستان والی برخورداری کی توقع رکھتے ہیں، مگر میں نے وہاں یہی دیکھا کہ وہاں کے بچے خود اعتمادی میں پاکستانی جوانوں سے کہیں آگے ہیں اور انہیں اپنے حقوق کا بھی پورا ادراک ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ذرا مختلف گھریلو ماحول کی وجہ سے وہ والدین سے بالکل آزاد نہیں ہوتے، مگر اپنی آزادی کے لیے مسلسل اصرار ضرور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہاں چھوٹے بچے بھی آگاہ ہیں کہ والدین اُن پر تشدد کا حق نہیں رکھتے ورنہ اپنی ٹیچر کو بتا دینا ہی کافی ہوگا اور پھر قانون انہیں خود سمجھ لے گا۔

میں نے تو انگلینڈ میں اُس خاوند کو بھی سزا ہوتے دیکھی ہے، جس نے جاری ناراضگی کے باوجود بیوی کی مرضی کے بغیر اُس سے ازدواجی تعلق قائم کیا۔ ایسے **Women Dominant** معاشرہ میں دیسی والدین جس کرب کا شکار ہیں وہ اپنی جگہ، مگر بچے تو اُسی معاشرہ کی پیداوار ہیں اور اپنے آپ کو درست سمجھتے ہیں۔ یہ گنجلک صورتِ حال کیا رنگ لاتی ہے، یہ تو وقت بتائے گا، مگر لگتا یہی ہے کہ اُن کی آئندہ نسل صرف برٹش ہوگی۔ آدھی پاکستانی اور آدھی انگلش نہیں۔

سرِ راہ ٹوائلٹ

جن دنوں ممتاز جرمنی میں ہنی مون منا رہا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں اشفاق اُس کے بزنس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ہم دونوں اکثر رات کو ممتاز کی کار لے کر نکل جاتے۔ سمت کی تخصیص نہیں تھی۔ جدھر گاڑی کا منہ ہو گیا، ہو گیا۔ دونوں کے پاس پاکستانی انٹرنیشنل لائسنس تھے۔ ہم لندن کے علاقوں سے نابلد تھے اس لیے روز ''گواچ'' جاتے، مگر ہمیں اعتماد تھا کہ گھر پہنچ جائیں گے، کیونکہ ہمیں معلوم تھا ہمارا گھر نارتھ میں ہے اس لیے کئی گھنٹے کی کھجل خواری کے بعد ہم کسی بڑی روڈ کا سائن پکڑ کر اُس پہ چڑھ جاتے۔ پھر اُس سے لندن کے رنگ روڈ پر۔ یہ روڈ لندن کے چاروں طرف گھومتی ہے۔ رنگ روڈ پر ہم نارتھ کا سائن فالو کرتے ہوئے اپنے مخصوص St. Pancras Exit پر یہ سڑک چھوڑتے۔ پھر تھوڑا گھومتے ہوئے ایک ایسی نشانی تک جا پہنچتے جہاں سے ہمیں اپنے گھر تک پہنچنا پکا یاد تھا۔ یہ نشانی ایک مکمل برہنہ عورت کا مجسمہ تھا جو ایک اونچی بلڈنگ کے باہر اوپر سے سڑک کی جانب جھکا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی ہم رقص کے انداز میں گاڑی میں ہی بَل کھانے لگتے کہ پالیا، پالیا۔

اسی طرح گھومتے ہوئے ایک رات ہم لندن برج (London Bridge) یا ٹاور برج پر جا نکلے۔ یہ لندن کا مشہور عالم پل ہے جو کبھی عجائبات میں بھی شامل رہا ہے۔ یہ پل دریائے ٹیمز کے اوپر ایستادہ ہے اور سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ اس کی مشہوری کا بڑا سبب ایک تو اس کی

قدامت ہے اور دوسرا وہ وصف ہے کہ جب کوئی بڑی Fairy یعنی بحری جہاز یہاں دریا میں سے گزارنا ہو تو یہ پل اوپر کو دونوں جانب اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اُس وقت بڑے احسن طریقے سے ٹریفک دوسرے پلوں کی طرف موڑ دی جاتی ہے۔ اس پل کی سائیڈوں پر لوگوں کے لیے تفریح اور کھانے پینے کے لیے کھلے ریستوران ہیں۔ وقت کافی ہو گیا تھا اور وہ جگہیں بھی بند تھیں۔ ہم نے کار سائیڈ پر پارک کر رکھی تھی اور پیدل برج پر گھومتے ہوئے گپیں لگا رہے تھے، حالانکہ اس وقت ایسا کرنا سکیورٹی کے نقطہ نظر سے ٹھیک نہیں تھا، مگر ہم دونوں ہی منچلے تھے اور ایسی چیزوں کی پرواہ کم ہی کرتے تھے۔

اچانک اشفاق نے کہا

’’یار! مجھے تو کافی دیر سے ’’موتر‘‘ نے تنگ کر رکھا ہے۔ کیا کریں‘‘

’’آؤ دیکھیں۔ کوئی کمرشل جگہ کھلی مل گئی تو وہاں باتھ روم میں فارغ ہو لینا‘‘

پہلی دفعہ اس حوالہ سے ذہن دوڑایا تو سمجھ آئی کہ ارد گرد کوئی پمپ یا ریستوران اس ٹائم کھلا نہیں ملے گا۔ ہم ٹہلتے ہوئے آگے بڑھے تو ایک نائیٹ کلب کے چمکتے بورڈ پر نظر پڑی۔

میں نے کہا ’’یار کام بن گیا آؤ اندر چلیں‘‘

تب وہ بولا ’’بھائی سوری، تمہیں بتانا بھول گیا۔ میری جیبوں میں آج کی سٹور کی ساری سیل (sale) ہے‘‘۔

’’اوئے بیڑا اتر جائے۔ یہ کیا کِیا؟ اتنی رقم اس گنجل رات میں ساتھ لیے پھرتے ہو‘‘۔

’’جو بھی ہے اب تمہیں بتا دیا ہے، اب تُو جان اور تیرا کام میرا ذمہ اوش پوش‘‘

وہ اکثر ایسا ہی کرتا تھا۔ بات میرے ذمے ڈال کر آپ بے فکر ہو جاتا بلکہ زیادہ لاپرواہی دکھاتا اور میں سب کچھ بھول بھال کر چیتے کی طرح چوکنا ہو جاتا۔ میں نے کہا

’’ٹھیک ہے مگر اندر کسی لڑکی کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا بھی نہیں ہے۔ اب پینے پلانے کا چکر تو بالکل ختم سمجھو (وہ عادتاً پیتا بھی نہیں تھا)۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ آؤ‘‘

ہم اندر داخل ہوئے تو تیز میوزک سے کان کے پردے جھنجھنانے لگے۔ چند لڑکیاں جو کہ فل میک اپ اور مختصر لباس میں اپسرا لگ رہی تھیں دیوانہ وار ڈانس کر رہیں تھیں۔ اشفاق اُنہیں بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ میں نے اُن سے جلدی سے نگاہیں ہٹائیں اور اشفاق کو ہجو کا مار کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ڈانس گروپ سے بچھڑ کر ایک لڑکی ہماری طرف آئی اور بولی

"Hay Dudes! what I can help you?"

یعنی ''ہاں دوستو! میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

میں نے جلدی سے کہا، **"Can we have cofee"**

''کیا ہمیں کافی مل سکتی ہے؟''

"What? cofee?" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

And in this night club ، اُس نے مزید کہا **What a joke** وہ ٹکڑوں میں بولی۔ اتنے میں کچھ دوسری لڑکیاں ڈانس چھوڑ کر ہمارے سر پر سوار ہو چکیں تھیں۔

Hay ڈانس کرو گے ہمارے ساتھ

It not cost you much, almost free because it is our off time now. We are just enjoying our self right now

یہ تمہیں زیادہ مہنگا نہیں پڑے گا، فری ہی سمجھو، کیونکہ اب ہمارا آف ٹائم ہے۔ ہم صرف مزے لے رہے ہیں۔

میں نے اشفاق کی طرف دیکھا۔ وہ مسحور ہونے کے قریب تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"No thanks, we are looking for cofee. I think we should see any where else"

''نہیں شکریہ۔ ہم صرف کافی کی تلاش میں ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں کہیں اور دیکھنا چاہیے''۔

میں نے جلدی سے اشفاق کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے چلا۔

''Hay ???? بچو! کافی کے لیے تمہیں دودھ کی ضرورت ہو گی، اس وقت کہاں سے لو گے، میں آؤں؟''۔

ایک دل جلی نے ہانک لگائی اور وہ سب کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

ہم بھنا گئے، مگر بات رقم کی تھی۔ ہم رک جاتے تو یقیناً لٹ لٹا کر نکلتے۔ اس لیے جبر کر کے باہر کو چل دیئے۔

باہر نکل کر میں نے جل تُو جلال تُو کہہ کر منہ پر ہاتھ پھیرا تو اشفاق کھل کر ہنس دیا۔

''خان! اسی لیے تو تمہیں بتا دیا تھا۔ مجھے تو بڑا مزا آ رہا تھا''

وہ ستم ظریف ایسے موقعوں پر اِسی طرح کی باتیں کر کے مجھے اور جلایا کرتا تھا۔ میں نے جب واپسی گھورا تو جلدی سے بولا،

''یار میں تو مذاق کر رہا تھا، وہ پیشاب کا مسئلہ تو وہیں رہ گیا''

اُسے بھی میری خان خانی کا پتا تھا کہ اگر بگڑ گیا تو واپس جا کر تمام پیسے وہیں لُٹا دوں گا بعد میں چاہے جو بھی ہو۔

ہم نے طے کیا کہ واپس گاڑی کے پاس چلتے ہیں۔ میں نگرانی کرونگا اور وہ پاکستانی سٹائل میں گاڑی کے ٹائر کے پاس بیٹھ کر فارغ ہونے کی کوشش کرے گا۔ ہم شارٹ کٹ کے ذریعے دوسری سڑک پر نکلے تو فٹ پاتھ پر ایک چھوٹے کمرے کی طرح کا ڈربہ نما ڈبہ دیکھا جو چاروں طرف سے بند تھا اور اُس کے اوپر ٹوائلٹ کے الفاظ چمک رہے تھے۔ یہ اُس وقت ہمارے لیے نئی چیز تھی

''یار یہ کیا ہے؟ اوپر تو ٹوائلٹ لکھا ہے''

اگلے دس منٹ تک ہم نے اُس کا معائنہ کیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ پبلک ٹوائلٹ ہے

جس میں 20 پنس کا سکہ پڑتا ہے اور یہ 10 منٹ کے لیے قابل استعمال ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر ٹوائلٹ بنی ہے۔ اشفاق الجھن میں تھا۔

''یار اگر 10 منٹ سے زائد ہو گئے تو کیا ہو گا؟ بندہ اندر سے سکہ ڈال کر باہر کیسے نکلے گا؟''

ایک تجویز یہ ذہن میں آئی کہ دروازہ تھوڑا کھلا رکھا جائے، مگر یہ بات غیر مناسب تھی اِس لیے ختم ہو گئی۔ آخر ہم نے جیبیں پھرولیں تو 20 پنس والے کئی سکے نکل آئے۔

اب اشفاق نے ایک سکہ اُس ڈربے کے نشان زدہ خانے میں ڈالا اور ہینڈل گھمایا جو آرام سے کھل گیا۔ مجھے ڈیوٹی دینا تھی کہ دیر ہو جائے تو اندر لاک ہونے کی صورت میں اشفاق اندر سے تھپتھپائے گا اور مجھے ادھر دھیان رکھنا تھا اور ایک اور سکہ ڈال کر اُسے باہر نکالنا تھا، لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور وہ باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر لمبی سانس کھینچی اور پتہ نہیں کس کو گالی نکال کر بولا

''یار یہ بھی کوئی تک ہے، تمام انتظام کے باوجود نگاہیں گھڑی پر لگی رہیں۔ سب کچھ اوپر کو چڑھ رہا تھا''۔

میں ہنس دیا تو وہ بولا۔ ''ہنسو، ہنسو، کبھی تم اندر پھنسے ناں تو میں بھی باہر سے کھولنے والا نہیں''۔

لیکن میں نے کبھی اُس کے ہوتے ہوئے یہ ٹوائلٹ استعمال نہیں کیا، وہ ایسی انتقامی باتوں کو کم ہی بھولتا ہے حالانکہ اندر لاک ہونے والی کوئی بات نہیں۔ اندر سے بھی سارا انتظام ہے۔ پر کیا پتہ یہ باہر سے کوئی کاروائی ڈال دے۔

☞ ☞ ☞

گھاٹے کا سودا

کل رات ہماری واپسی فلائٹ تھی۔ ممتاز کافی دن پہلے جرمنی میں ہارویسٹر کے ہائیڈرالک پمپ کا آرڈر کر کے واپس آ گیا تھا۔ اُس نے فون پر مجھے کہا تھا کہ یار ایک ضروری بات کرنا ہے، اس لیے ایک آدھ دن واپسی سے قبل سپئیر (Spare) رکھنا۔ سو آج میں نے سٹور سے کام چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس ٹور کے ہمارے مقاصد تقریباً پورے ہو گئے تھے اس لیے پرسوں ہماری واپسی پرواز تھی۔ کل رات اشفاق مجھے میری رہائش گاہ سے اُٹھا لایا تھا جہاں میں نے جیڈ سے فارغ ہو کر جلدی جلدی کلوزنگ کی تھی۔ میرا سرحد کا رہنے والا روم میٹ جو میرے خراٹوں سے تنگ تھا میرے جانے سے خوش ہونے کے بجائے رونے کے قریب ہو رہا تھا۔ مگر مجھے یہ سب چھوڑنا تھا۔ سو اب میں ممتاز اور اشفاق کے ساتھ ممتاز کے فلیٹ پر تھا۔ ہم نے ڈنر لیا تو ممتاز ہمیں دوسرے کمرے میں لے آیا۔

"Lets have a little chat about business"

''آؤ تھوڑی دیر بزنس کے متعلق بات ہو جائے''۔

اُس نے کہا ''جی سر''، میں مستعد ہو گیا، میں فضا میں **Tension** کو سونگھ چکا تھا۔ اِس لیے اُسے سر کہہ کر جواب دیا تھا وہ کہنے لگا۔

''میں نے پمپ بک کروا دیے تھے جو ایک دو دن میں پاکستان پہنچ جائیں گے۔ وہاں اشفاق رسیور (Reciever) ہوگا۔ تمام پیپر اس کو دے دیے ہیں اور کل تم جا رہے ہو۔ اب فیصلہ ہو جائے کہ پرافٹ میں کس کا کتنا حصہ ہوگا''

''ہو جائے''۔ میں نے مختصراً کہا تو بولا

''کہو کیا ہونا چاہیے''

''تم نے بات چھیڑی ہے تو کچھ سوچا ہی ہوگا''

''نہیں تم بتاؤ، تم نے کیا سوچ رکھا ہے''۔

''میں نے تو اُس وقت بھی نہیں سوچا تھا جب تم ہمارے کہنے پر پہلی لاٹ لے کر پاکستان پہنچے تھے۔ ہم کو تو اُنہیں صرف فروخت کرنے کی دُھن تھی جو ہم نے کر دیے، اسی لیے اب دوسری لاٹ کے لیے آئے ہیں۔ کیا خیال ہے پہلے اُس پہلی لاٹ کا حساب نہ ہو جائے؟''

''کیسا حساب؟ وہ لاٹ تو میں اپنے پیسوں سے خرید کر خود لے کر پہنچا تھا۔ وہ تم لوگوں نے ایک ایجنٹ کے ذریعے بیچ دی۔ اُس میں تمہارا کیا لگا۔؟ رہا اشفاق تو یہ ہم دونوں بھائیوں کا معاملہ ہے''

''لیکن یہ سارا ہوم ورک اور آئیڈیا (Home work & Idea) تو میرا تھا اور ایجنٹ بھی میں نے ہی متعارف کروایا تھا''

''تو کیا ہوا۔ دوستی میں اتنا بھی حق نہیں ہے ہمارا؟''

میں نے اشفاق کی طرف دیکھا، وہ مسلسل چپ اور ایک طرح سے لاتعلق سا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں بھائی اس موضوع پر پہلے ہی بات کر کے متفق ہو چکے ہیں کہ اب میں اس بزنس میں فالتو خرچہ ہوں۔ مجھے اپنے والدِ محترم کی بھولی بسری نصیحت یاد آ گئی جو انہوں نے میری عملی زندگی کی ابتدا میں کہی تھی کہ ''بیٹا! کسی بھی شخص سے، خواہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو، بہت

زیادہ توقعات وابستہ مت کرنا۔ ایسا کرنے سے اگر تمہارا کام حسبِ منشا ہو جاتا ہے تو تمہیں خوشی ہوگی اور اگر خدانخواستہ نہیں ہو پاتا تو مایوسی نہیں ہوگی‘‘

اب تک میں ایسا ہی کرتا آیا تھا اس لیے رویوں پر حیرت یا مایوسی کے لمحے بھی مُجھ سے دور رہے تھے، لیکن اس کام میں، جس میں ہم ایک مرحلہ کامیابی سے مکمل کر چکے تھے اور دوسرے مرحلے میں بزنس کو آگے بڑھانے کے لیے انگلینڈ کے دورہ پر تھے، یہ رویہ میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا۔ میرے حساب سے تمام امور ممتاز اور اشفاق میں طے ہو چکے تھے جس کا اشفاق مجھے بارہا یقین دلا چکا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے مشترکہ طور پر ممتاز کے شادی بیاہ کے معاملہ میں کافی دردسری اور خطرہ مول لیا تھا۔ اِس سب کے بعد یہ رویہ؟ صرف ممتاز کا نہیں بلکہ دونوں کا۔ وہ یقیناً مجھے حیران کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور میں اُس نصیحت سے ذرا ساہٹ کر نارسائی اور شرمندگی کا عذاب جھیل رہا تھا۔ میں ہنس دیا۔ یہ میرے ساتھ پہلی دفعہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جب بھی کوئی منصوبہ بنایا، رقم کی کمی نے میرے پاؤں روکے اور جب بھی کسی پر بھروسہ کیا، میرے ساتھ ایسا ہی ہوا، لیکن میں نے پھر وہ بزنس زیادہ دیر چلتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ میرا تجربہ تھا۔ برسبیل تذکرہ ذرا پہلے ہی سہی، مگر عرض کر دوں کہ یہ بزنس بھی نہیں چلا۔ اب بھی اشفاق کے گھر کے کسی کونے کھدرے میں ایک آدھ پمپ کہیں پڑا ہوگا۔ یعنی اُس لاٹ سے اور اگلی لاٹ پھر کبھی نہیں آ سکی۔ سو میں نے ہنستے ہوئے کہا

’’یار بات تو ختم ہوگئی۔ وہ لاٹ بھی تمہارے پیسے سے تھی اور یہ بھی۔ اُسے بھی اشفاق نے بیچ لیا تھا اسے بھی یہی ڈسپوز(Dispose) کر لے گا۔ اس میں مَیں کہاں سے آ گیا۔ مجھے بھول جاؤ، میں پیچھے ہٹ رہا ہوں، شکریہ‘‘

"Forget me, I am gona withdraw man. Thank you"

"I want fair dealing" میں چاہتا ہوں میری رقم پونڈز میں مجھے واپس

ملے، پونڈ کا اُس وقت کیا ریٹ ہوگا یہ تمہارے نصیب۔ میں تمہیں منافع میں سے 10% آفر (Offer) کرتا ہوں۔

''یہ مہربانی کیوں بابا۔ میں Withdraw کر چکا ہوں''

''اس میں غصے والی تو کوئی بات نہیں یار! یہ بزنس ہے، بہرحال میں تمہیں زیادہ سے زیادہ 15% آفر کرسکتا ہوں، اس سے زیادہ بالکل نہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ ایک بہت اچھی آفر ہے''

"Sorry, I am still there" یعنی کہ سوری، میرا اب بھی وہی مؤقف ہے۔

''اچھا پھر تو تم اشفاق کی مدد بھی نہیں کرو گے۔ یہ بتا رہا تھا کہ تمھارے پاس اِس لاٹ کے ڈسپوزل کے لیے کوئی پلان ہے۔ یعنی تمھارے پنجاب بھر میں پھیلے ہوئے ڈیلر وغیرہ''

میرا موڈ مکمل آف تھا۔ بات منافع کے ساتھ ساتھ روپے اور مفاد پرستی کی بھی تھی جس نے مجھے ہرٹ (Hurt) کیا تھا۔

''سوری اگین (Sorry again) میں منافق نہیں ہوں، میں اس بزنس سے مکمل لاتعلق ہو رہا ہوں۔''

میرے جواب پر اُس نے گوروں کی طرح کندھے جھٹک دیے۔ اس دوران اشفاق بالکل نہیں بولا، حالانکہ ہم دونوں (میرے اور اشفاق) میں یہ طے تھا کہ پہلی لاٹ کے بھی اور دوسری سے بھی اصل زر واپس کر کے بقایا کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔ آدھا منافع انویسٹر کا اور آدھا یعنی کل کا 25% ہم دونوں میں سے ہر ایک کا۔ لیکن اب پہلی لاٹ کے منافع سے تو وہ دونوں بالکل مُکر گئے تھے۔ خیر میں بھاری دل مگر بشاش چہرے کے ساتھ کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔ سچ بیانی کے طور پر یہ بھی عرض ہے کہ یہ تناؤ کئی سالوں پر محیط رہا۔ مجھے غصہ یہ تھا کہ اصل میں میرا دوست بھی ممتاز ہی تھا۔ اشفاق تو اُس کا بھائی ہونے کے ناطے میرے ساتھ جڑا تھا۔ ممتاز کے

لندن میں ہونے اور اشفاق کے پاکستان میں میرے ساتھ موجود ہونے کی وجہ سے اشفاق سے بھی بہت گہرا تعلق ہوگیا تھا۔کبھی میں سوچتا کہ شاید ممتاز بھی اُن دنوں Struggling Stage پر تھا شاید اس لئے اُس کا یہ رویہ تھا یا پھر یہ اشفاق کی کوئی چال تھی۔بہر حال جو بھی تھا اس نے مجھے بہت Hurt کیا۔بعد کے انگلینڈ کے دوروں میں ممتاز سے میرے تعلقات آہستہ آہستہ بحال ہوگئے ۔اُس وقت کا رویہ پتہ نہیں اُس کے ذہن میں رہا یا نہیں کیونکہ اُس پر آج تک اُس سے دوبارہ بات نہیں ہوئی۔مگر مجھے اعتراف ہے کہ بعد میں بہت سے مواقع پر اُس نے میری مالی (ادھار سہی) اخلاقی اور اپنے تعلقات کے ذریعے بہت مدد کی جو کہ دوستانہ تھی اور Mutual Interest کے کِسی معاہدہ کے بغیر اب بھی جاری ہے ۔جیسے دوست ایک دوسرے کی مختلف امور میں امداد کرتے ہیں ایسے ہی ہم ایک دوسرے سے متعاون ہیں۔اس ضمن میں بلا شبہ اب اُس کا پلہ بھاری ہے۔خیر بات ہو رہی تھی اُس وقت کی ،آخر جب خاموشی لمبی ہوگئی تو اشفاق بولا

''آؤ خان!باہر چلیں۔''

اُس نے بھائی سے گاڑی کی چابی مانگی تو وہ ہمیں نیچے گاڑی تک چھوڑنے آیا اور بزرگوں کی طرح تاکید کرتا رہا کہ تم دونوں کے پاس لائسنس نہیں ہے اس لیے احتیاط سے، وغیرہ وغیرہ۔

جب ہم روڈ پر نکلے تو اشفاق کہنے لگا۔''ہونہہ،%15 دوں گا۔''

میں نے اُسے اُس کا اپنا کردار جتانے کی بجائے کہا۔

"No more talking on this topic please"

یعنی اس موضوع پر کوئی مزید بات نہیں ہوگی۔''

اُس نے غور سے میرا موڈ دیکھا اور بولا،''اوکے،کدھر کو؟''

''کسی بھی طرف، اس گھوڑے کو دوڑنے دو''

ہم نے گاڑی کی چھت کھول لی اور وہ گنگنانے لگا۔ پہلے بھی کہیں ذکر ہو چکا ہے کہ وہ گاتا بہت اچھا ہے۔ وہ اچانک بولا

''خان! سامنے دیکھو، فٹ پاتھ پر وہ لڑکی پیشہ ور ہے۔''

گو اس معاملے میں مَیں اُس کی آنکھ کی پرکھ کا قائل تھا مگر اس جاری بوریت کی وجہ سے ایسے ہی اختلافی انداز میں بولا

''نہیں بھئی، خواہ مخواہ تکے نہ لگاؤ''

اتنے میں ہم اُس لڑکی کو کراس کر رہے تھے۔ اشفاق نے اچانک بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی لڑکی سے تھوڑا آگے جا کر رُکی مگر وہ فوراً بھاگتی ہوئی آ گئی۔ میری طرف کی کھڑکی اُس کی طرف تھی سو وہ پاس آ کر بولی:

Hay سویٹ ہارٹس، یو وانٹ بزنس

"Hay sweet hearts, you want business"

وہ بہت ڈرنک **(Drunk)** لگ رہی تھی اور نزدیک آنے پر پتہ چلا کہ اتنی لڑکی بھی نہیں ہے۔ اشفاق نے کہا

"come inside lady" تو وہ جلدی سے پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اشفاق نے گاڑی چلا دی۔ پھر کہنے لگا، ''یار اب اسے کہاں لے کر جائیں، تم بھی ٹھکانہ چھوڑ چکے ہو اور فلیٹ پر تو لے جانے سے رہے۔''

مجھے کیا پتہ تم نے بٹھایا ہے تم جانو، میں نے لاتعلقی سے کہا۔

وہ کہنے لگا پھر بھی یار......

میں کافی بوریت محسوس کر رہا تھا مگر اب یہ مصیبت گاڑی میں سوار تھی تو اس سے احسن

طریقے سے جان تو چھڑانا ہی تھی اس لئے میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا ''ایسے ہی تھوڑی دیر ڈرائیو کرواور اس کی باتوں سے دل بہلا کر اسے اُتار دو، تمہیں پتہ ہے پولیس ایسی سٹریٹ گرلز پر کتنا دھیان رکھتی ہے۔ اس لیے گاڑی بھی غیر محفوظ ہے۔ ذہن میں رکھنا کہ کل رات کو ہماری فلائٹ بھی ہے۔ کوئی پھڈا پڑ گیا تو بدنامی کے ساتھ ساتھ سارا پروگرام بھی ڈسٹرب ہو جائے گا۔''

ہمیں باتیں کرتے دیکھ کر وہ اُچک کر میرے گال پر چٹکی لیتے ہوئے بولی

Hay, I am ______ (نام یاد نہیں), And you guys?

ابھی میں جواب دینے ہی لگا تھا کہ خود ہی بولی، ویسے کہاں سے ہو؟

میں نے کہا خود ہی اندازہ لگاؤ، تو بولی انڈین؟ میں نے کہا

''ارے واہ تمہارا تو بہت تجربہ ہے''۔

تو عجیب سا اشارہ کر کے بولی، **"very good - uncircumcised"**

میں نے اگلی سیٹ سے جمپ لیا اور پیچھے پہنچ گیا۔ تو بولی،

میں ایک آدمی کے پچاس پونڈ لیتی ہوں، مگر تم سے کم لے لوں گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے پی رکھی ہے تو پورا مزا نہیں دوں گی۔

پھر اچانک کہنے لگی۔

''تمہارے پاس غبارے تو ہیں ناں۔''

میں اُس سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ جس سے اشفاق کافی چڑ رہا تھا۔ کہنے لگا،

''میں گاڑی روک رہا ہوں، تم آگے آ کر ڈرائیو کرو۔''

''دھیان سے ڈرائیو کرو یار، وہ دیکھو سامنے دور لائٹ سی گھومتی لگتی ہے۔ لگتا ہے پولیس کی گاڑی ہے۔ پھنسا نہ دینا۔ میں بھی تو اس کی صرف باتیں انجوائے کر رہا ہوں تم بھی کرو''

وہ بھنا کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس دوران وہ بکے جا رہی تھی کہ اُسے انڈین بہت پسند

ہیں۔اس کے علاوہ اُس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اُس کے پہلے گاہک نے اسے پی پلا کر ہی فارغ کر دیا ہے۔اُس کی باتوں میں کوئی ردھم نہیں تھا۔مجھے کہنے لگی

’’تمہارے پاس کنگھا ہے؟‘‘

میں نے کنگھا نکال کر اُس کے حوالے کر دیا۔یہ میری جیب میں رہتا تھا کیونکہ میرے بال بہت گھنے اور گھنگریالے تھے۔اُس نے پرس سے جو اُس نے گود میں سنبھال رکھا تھا شیشہ اور لپ اسٹک نکالی اور خود کو سنوارنے لگی اور پرس ہمارے درمیان سیٹ پر رکھ دیا۔

میں نے اُسے بتایا کی غبارے تو نہیں ہیں۔تو کہنے لگی یہ تو پرابلم ہو گئی۔کسی پمپ وغیرہ سے خریدے تو وہاں "Ass hole" پولیس والے ہوتے ہیں۔پھر کہنے لگی تم بھی کیا یاد کرو گے۔بغیر غباروں کے چلے گا،مگر مجھے Pregnent نہ کر دینا۔پھر آنکھ مار کر اپنے منہ اور پچھلے حصے کی طرف اشارہ کر کے بولی،

’’اینڈ سے پہلے ادھر............‘‘

‘‘I have a lovely mouth and.........."

’’میرے پاس ایک بہت پیارا منہ ہے اور............‘‘

اُس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔دراصل اشفاق نے اچانک جھٹکے سے گاڑی روک دی تھی۔شاید اُس کے لیے مزید یہ بک بک سننا دشوار ہو گیا تھا۔وہ ایک اندھیری گلی تھی اور فلیٹ بھی اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔پتہ نہیں کونسا علاقہ تھا۔اشفاق کہنے لگا،

’’یار کچھ نہیں کرنا تو اس سے پیچھا چھڑاؤ۔‘‘ میں نے کہا،’’اوکے تم گاڑی سٹارٹ رکھو میں ابھی اسے جھٹک کر آیا۔‘‘

میں نے اُسے کہا،’’کم آن سویٹی،ہمارا فلیٹ آ گیا،یہ جنٹلمین بھی گاڑی پارک کر کے آتا ہے۔‘‘ وہ نیچے اتر آئی تو میں اُسے لے کر سڑک سے فلیٹس کی طرف بڑھا۔تھوڑا آگے جا کر میں نے

کہا، ”بس ایک منٹ، میں کچھ چیزیں گاڑی میں بھول آیا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔“ میں پلٹ پڑا۔ لیکن پھر مجھے اچانک یاد آیا تو میں نے واپس مڑ کر کہا، ”ڈیئر وہ کنگا کہاں ہے۔“

”میرے پاس ہے“

اُس نے جلدی سے پرس سے کنگا نکالا۔ میں نے کنگا لیا اور اُسے کھڑا رہنے کا کہہ کر کنگا سر میں پھیرتا تیز چال سے گاڑی کے پاس پہنچا۔ پسنجر سائیڈ کا دروازہ کھول کے ابھی بیٹھا بھی نہیں تھا کہ اشفاق نے بغیر لائٹ کے گاڑی بھگا دی۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ بیک لائٹ کی روشنی میں گاڑی کا نمبر نہ دیکھ لے اُس نے بغیر بریک لگائے گلی کی نکڑ پر ٹریفک اشارہ توڑا اور گاڑی موڑ لی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو وہ ہکا بکا کھڑی رہی پھر کچھ کہتی ہوئی، شاید بلڈی انڈین کو گالیاں دیتی سڑک کی طرف دوڑی۔

بعد میں اشفاق نے ایک مدت تک میری کنگھے والی حرکت کا مذاق بنائے رکھا۔ حالانکہ بات اتنی تھی کہ میں اُس کے پاس اپنی کوئی چیز نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ شاید یہ کمپلیکس تھا کہ یہاں کی پولیس شکایت کی صورت میں معمولی چیز سے بھی سراغ لگا لیتی ہے اور میں اب اس بلڈی ٹور کو ہر حال میں کل ختم کرنا چاہتا تھا۔ محفوظ طریقے سے۔ ویسے بھی یہ ٹور (Tour) میرے لیے سراسر گھاٹے کا سودا رہا تھا۔

☞ ☞ ☞

فضائی شرارتیں

میں نے اور اشفاق نے کافی سفر اکٹھے کیے ہیں۔ان سفروں میں ہماری دوستانہ چونچ بازی جاری رہتی تھی۔ یہ ایسے ہی ایک سفر کا احوال ہے۔

اشفاق اور میں جہاز میں محوِ پرواز تھے۔ ایئر کریو "Air Crew" مسافروں کو ڈرنکس، کافی اور چائے وغیرہ دینے کے لیے حرکت میں آ چکا تھا۔اشفاق سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے ایک سابقہ سفر کی روداد یاد آ گئی۔ اُس میں بھی اشفاق میرے ساتھ تھا۔ اُس یاد نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔اشفاق نے چونک کر پوچھا

''کیا بات ہے خان! کوئی نیا آئیڈیا؟''

''نہیں یار، وہ مجھے شلوار قمیض والا سفر یاد آ رہا تھا''۔ یہ سن کر وہ بھی ہنس دیا۔

ہوا یہ تھا کہ کچھ ماہ قبل بھی ہم ایسے ہی واپسی سفر کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ اشفاق دوسرے کمرے میں تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا شلوار قمیض پہنوں، مگر میرے پاس جو ایک دو جوڑے تھے وہ عرصہ دراز سے زیرِ استعمال نہ رہنے کی وجہ سے بیگ میں ہی میلے سے اور ''وٹو وٹ'' ہو گئے تھے۔ مجھے کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور استری کرنے سے ہمیشہ چڑ رہی ہے۔ خدا ہر جگہ، ہر سفر میں کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ یا بندی مجھے دے دیا کرتا تھا جو میرے یہ کام کر دے۔ میں نے بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی شلوار کی ہاتھ سے شکنیں درست کیں اور پہن کے دیکھا۔ مجھے خود ہی اچھے نہ لگے۔ میں

اُنہیں اتارنے لو ہی تھا کہ اشفاق آ گیا۔ مجھے اِس حلیے میں دیکھا تو ڈانٹنے کے انداز میں بولا

''خان! کوئی چج دے کپڑے پا یار، ایہہ کوئی سوٹ اے؟ جیویں گھڑے چوں کڈیا ہووے، نہ استمال ہون نال پران دی باس وی آ رہی اے''۔

یعنی ''خان! کوئی اچھے کپڑے پہنو، یہ تو ایسے ہیں جیسے گھڑے سے نکالے ہوں، ویسے بھی استعمال نہ ہونے کی وجہ سے اِن میں سے پُرانے پن کی بُوسی آ رہی ہے''۔

بس اُس کا ایسا کہنا تھا کہ اپنی کوئی گُل ڈھیلی ہوگئی۔ میں نے کہا۔

''مجھے تو یہی پہننا ہیں''۔

وہ خود بہترین پینٹ شرٹ میں چمک رہا تھا۔ دراصل میرے ناپسندیدہ کام یعنی کھانا بنانا اور کپڑے دھو کر بہترین طریقے سے استری کرنا اُسے مرغوب تھا۔ وہ ویسے بھی ٹپ ٹاپ قائم رکھتا تھا جبکہ میں اس معاملہ میں مکمل بے پرواہ تھا۔ وہ بولا

''یار خدا کا خوف کرو، ایئرپورٹ پر اور جہاز میں اس حُلیے میں تمہیں دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟''

میں نے کہا ''لوگ مامے لگتے ہیں، خود تو دس جگہ سے پھٹی پتلونیں پہنتے ہیں، میری مرضی میں جو پہنوں۔ تمھیں توہین محسوس ہو رہی ہے تو مجھ سے علیحدہ رہنا''۔

اُس نے غور سے مجھے دیکھا اور سمجھ گیا کہ خان صاحبی عروج پر ہے اور اب واپسی ناممکن۔ وہ مجھے ''کھسماں نوں کھاؤ'' جیسے انداز میں گھورتے ہوئے باہر نکل گیا۔

میں کپڑوں کے اس جوڑے کے ساتھ کُھسہ بھی لے کر آیا ہوا تھا۔ اُسے نکالا تو وہ بھی کپڑوں کے دباؤ سے چُر مر ہو رہا تھا اور ویسے بھی استعمال نہ ہونے کی وجہ سے سوکھ سا گیا تھا۔ میں نے اُسے سیدھا کر کے پہنا تو تنگ سا آیا۔ شاید اس لیے بھی کہ یہاں لندن میں قیام سے میں نے کچھ وزن گین (Gain) کیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ جہاز کے سفر میں میرے پاؤں کچھ سُوج سے

جاتے ہیں، اس لیے کراچی پہنچتے پر تو یہ شاید میرے پاؤں میں اڑے بھی نہیں۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ مجھے اِسی کو پہننا تھا۔ سو میں نے پہن لیا اور یوں ہم اس شان سے ایئرپورٹ روانہ ہوئے۔ اشفاق تمام سفر کے دوران بکتا جھکتا رہا۔ ابوظہبی پہنچے تو میں نے بڑی مشکل سے کُھسے میں پاؤں گُھسائے۔ کنیکٹڈ (Connected) فلائٹ سے کراچی پہنچے تو میں نے کُھسے کی ایڑھی بٹھا کر اُس میں پاؤں ڈالے۔ امیگریشن سے فارغ ہو کر لوکل فلائٹ کی سائیڈ پر پہنچے تو فلائٹ میں صرف گھنٹہ بھر رہتا تھا اور مسافروں سے پسنجر لاؤنج میں جانے کی درخواست ہو رہی تھی۔ راستے میں ایک بنچ آیا تو اشفاق نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس پر قبضہ کر لیا، اپنے بیگ کو سر کے نیچے رکھا اور اطمینان سے لیٹ گیا۔

''جلدی اٹھو بھئی فلائٹ تیار ہے'' میں نے اُسے ٹہوکا دیا۔

''جانے دو فلائٹ، اب یا تو تم یہ گھڑے سے نکلا ہوا سوٹ بدلو گے، یا ہم یہیں رہیں گے''۔

''ٹکٹ میرے پاس ہیں، میں جا رہا ہوں''

اتنا کہہ کر میں نے اپنے بیگ اُٹھا لیے، مگر اُس نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں سمجھ گیا کہ اب اُس کے دماغ پر چھپکلی سوار ہو چکی ہے اور یہ باتوں سے نہیں اترے گی۔

میں لندن سے کراچی تک اپنی بے تکی ضد پوری کر چکا تھا۔ ویسے بھی اب مجھے یہ سوٹ اور خصوصاً کُھسہ بہت تنگ کر رہے تھے، مگر ضد میں بُھگت رہا تھا۔ میں واپس مڑا، بنچ کے پاس بیگ رکھے۔ بیگ سے اچھا سا پینٹ شرٹ سوٹ اور شیونگ کا سامان نکالا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اشفاق نے بالکل حرکت نہیں کی تھی اور سویا بنا پڑا رہا تھا۔ میں شیو کر کے اور تازہ دم ہو کے نئے سوٹ کے ساتھ واپس آیا، بیگ سے نکال کر جرابیں اور جوتے پہنے تو کچھ سکون محسوس ہوا۔ اشفاق ایکدم اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا:

''خان یار حد کرتے ہو تم بھی۔ فلائٹ نکل جاتی تو؟ تم نے مجھے اُٹھایا کیوں نہیں

پھر ہم نے جلدی جلدی سامان سمیٹا اور بورڈنگ کاؤنٹر کی طرف بھاگے۔

''بھئی ہم تو اِس فلائیٹ سے نہیں جا رہے'' میں نے چھیڑا۔

ارے کیوں؟ کیا ہوا؟ وہ بھولپن سے بولا۔

جب ہم فلائیٹ میں بیٹھ گئے تو اُس نے مجھے زِچ کرنے کی کوشش کی، مگر میں بھی ڈھیٹ تھا۔ بعد میں اُس نے یہ بات دوستوں کے حلقے میں بھی کئی دفعہ مزے لے لے کر سنائی۔

سو اب ہم پھر فلائٹ میں بیٹھے اُس واقعہ کو یاد کر کے ہنس رہے تھے۔ اتنے میں ایئر ہوسٹس ڈرنک کی ٹرالی لے کر ہمارے پاس آ گئی تو میں نے فرانسیسی ریڈ وائن کی دو شیشیاں، دو چھوٹی چھوٹی شیشیاں بلیک لیبل کی، دو کوک اور ساتھ نمکین چھوٹے چھوٹے بسکٹوں کے دو پیکٹ لے لیے۔

''خان! یہ کس لیے بھئی۔ تم کوئی ریگولر ڈرنکر تو ہو نہیں''۔ اشفاق نے کہا تو مجھے اچانک شرارت سوجھ گئی۔ اس سے قبل میں نے یہ چیزیں صرف اپنا دل پشوری کرنے کے لیے لیں تھیں اور اشفاق کے لیے کوک، کیونکہ اُسے شراب سونگھ کر بھی نشہ ہو جاتا تھا، مگر مجھے اُس کی عادت کا پتہ تھا کہ وہ کھانے پینے کا خصوصاً جہاز میں خوب سیر ہو کر کھانے کا شوقین تھا۔ سو میں نے کہا

''بھائی یہ شراب تھوڑی ہے۔ یہ تو ریڈ وائن ہے۔ فرانس کی بنی ہوئی بہترین وائن۔ یہ تو صرف بھوک بڑھانے کے کام آتی ہے''۔

''اچھا'' اُسے ایکدم دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ''ذائقہ کیسا ہے''۔

''نمکین اور بہترین اور خصوصاً ان بسکٹوں کے ساتھ''

میں نے بتایا تو اُس نے ریڈ وائن کی شیشی کھول کر سونگھی، اُسے شراب کی بو بھی بُری لگتی تھی، لیکن میرے ساتھ کبھی کبھار امریکن ساؤتھن کمفرٹ (Southern Comfort)

انجوائے کرتا۔ جس کا ذائقہ اور بو سونف کا تھا مگر ایک دو جرعے ہی اسے آسمان کی سیر کروا دیتے۔ اُس نے جب ریڈ وائن کو بُری سمیل (Bad Smell) سے پاک پایا تو چسکی لینے لگا۔ چھوٹی سی شیشی تھی، منٹوں میں صاف ہوگئی۔ مزے سے بسکٹ کھاتے ہوئے بولا۔ ''یار اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا''

میں نے کہا ''چھوٹی سی تو شیشی ہے، کم از کم ایک اور لینا پڑے گی''

کہنے لگا ''تو منگوالو''

اتنے میں ٹرالی پچھلے پاؤں واپس آ رہی تھی۔ میں نے اُس میں خالی شیشیاں پھینکیں اور ہوسٹس سے دو اور ریڈ وائن، دو بلیک لیبل اور ایک اور قسم کی ہارڈ ڈرنک مانگ لی۔ جو اُس نے خندہ پیشانی سے پیش کر دیں۔

میں نے اشفاق کے ہاتھ میں ایک ریڈ وائن تھمائی اور خود گلاس میں ایک عام سا کاک ٹیل بنانے لگا۔ کاک ٹیل کئی مختلف قسم کی شرابوں کو مکس (Mix) کر کے بنایا جاتا ہے اور اگر آدمی کو اجزائے ترکیبی اور نسبت تناسب کا پتہ ہو تو انتہائی زود اثر ڈرنک تیار ہو جاتا ہے۔ اشفاق نے وائن ختم کی تو میں نے بسکٹ کے لفافہ کے ساتھ آدھ گلاس کاک ٹیل اُس کی طرف بڑھا دیا، جس کا ذائقہ ریڈ وائن کے مکسچر کی وجہ سے نارمل سا تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے طبیعت میں جولانی سی محسوس ہوئی تو میں نے بے ساختہ کہا

"What the pure drinks were those"

یعنی ''کیا خالص چیزیں تھیں''۔

اشفاق جو اونگھ سا گیا تھا ایکدم چونک پڑا اور پھر یوں ہوا کہ میرا یہ ایک انگریزی کا جملہ مہمیز کا کام کر گیا۔ ہم جو انگلش میں شروع ہوئے تو کوئی اور زبان اور ارد گرد کا ماحول، سب کچھ بھول گئے۔ کوئی پون گھنٹہ بعد اشفاق کو ہچکی سی آئی تو وہ اُٹھ کر باتھ روم کو بھاگا۔ کافی دیر بعد واپس آ کر بولا

"سب کچھ نکل گیا، مگر اب افاقہ ہے"

پھر کہنے لگا، "یار! یہ لوگ ہمیں گھور رہے ہیں لگتا ہے ہم ذرا اونچی آواز میں بول رہے تھے" پھر کیا تھا۔ پھر ہم نے چپ پکڑی تو نیند میں چلے گئے۔ بعد میں ہمیں ائرہوسٹس نے کھانے کے لیے اُٹھایا جو کہ ہم نے واقعی ڈٹ کر کھایا۔

☞ ☞ ☞

کالا چور

"تم لوگوں نے مجھے خراب بیلٹ بیچ دی ہے۔تمہیں شرم آنی چاہیے، میں تمہاری ریگولر کسٹمر ہوں"۔

یہ ایک ادھیڑ عمر نیگرو خاتون کے الفاظ تھے، جس نے بیلٹ سمیت ایک پینٹ میرے سامنے کاؤنٹر پر پھینکتے ہوئے ادا کیے۔یہ ایک بھاری بھرکم خاتون تھی اور بہت غصے میں تھی۔

میں نے ٹھنڈے سبھاؤ کہا"میڈم! کیا خرابی ہے اس میں"

"خرابی؟۔اس نے مجھے میری پینٹ میں قید کر دیا تھا۔ مجھے بہت زور کی پی (Pee) لگ رہی تھی۔ میں نے بیلٹ کھول کر پیشاب کرنا چاہا تو یہ نہ کھلی۔ میں نے تھک ہار کر پینٹ کھینچ کر اتارنا چاہی تو اس کے ٹائٹ ہونے کی وجہ سے نہ اتری"۔

"اوہ، پھر کیا ہوا؟"

میں نے شرارتاً پوچھا۔اُس نے غصے میں میری بات کو محسوس نہ کیا اور اُسی روانی سے بولی۔

"تھک ہار کر میں نے پڑوس سے ینگ لیڈی کو بلایا، کیونکہ میرا پی بہہ جانے کو تھا۔اُس نے کوشش کی، مگر کچھ نہ ہوا۔ بالآخر اُس نے اپنے خاوند کو بلایا۔وہ ایک جوان آدمی تھا۔دونوں نے مل کر میری پینٹ کھینچ کر اُتاری۔ساتھ ہی میرا انڈر ویئر بھی کھنچ گیا۔اوہ گاڈ! تم لوگوں نے مجھے پڑوسیوں کے سامنے ننگا کر دیا"۔

وہ روہانسی ہورہی تھی۔اس کی تیز باتوں سے دوسرے کسٹمر بھی دلچسپی لینے لگے تھے اور سٹور بوائے بھی پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا جسے دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گئی۔

''یہ! یہ ہے، وہ لڑکا جو کل کہہ رہا تھا کہ ماما! یہ ایک بہترین اور نفیس بیلٹ ہے''۔وہ چلائی۔

میں نے اُسے کول ڈاؤن(Cool Down) ہونے کو کہا اور سٹور بوائے کی طرف پینٹ بڑھائی۔

''یار! بیلٹ چیک کرو۔کیا خرابی ہے اس میں''

شانی نے بیلٹ چیک کی اور بولا''جاوید بھائی! یہ تو بالکل ٹھیک ہے''۔

''تو پھر مسئلہ کیا ہے۔؟''

''کچھ نہیں ایسے کئی تماشے ہوتے ہیں یہاں پر، میں ابھی ٹھیک کر لیتا ہوں''

ہمیں آپس میں پنجابی میں بات کرتے ہوئے سن کر وہ بولی

''انگلش میں بات کرو تا کہ مجھے بھی سمجھ آ سکے''

شانی نے کہا۔''ماما! اپنی بیلٹ کھولو''۔تو وہ چلائی۔

''کیا کہا؟ کیا تم مجھے یہاں، اس سٹور میں سب کے سامنے پینٹ اتارنے کا کہہ رہے ہو؟''

شانی جلدی سے بولا۔''نو ماما! میں صرف بیلٹ کھولنے کا کہہ رہا ہوں۔ میں یہ بیلٹ آپ کی پینٹ میں ڈال کر آپ کو بیلٹ کھولنا سکھانا چاہتا ہوں، یہ بیلٹ بالکل ٹھیک ہے''۔

''ایں۔اچھا؟''

اُس نے جلدی سے اپنی پہنی ہوئی پینٹ کی بیلٹ کھول دی۔

شانی نے بٹن دبا کے بیلٹ کو لوز کیا اور اُس کی دی ہوئی پینٹ سے بیلٹ نکال لی۔ وہ جلدی سے بولی۔

''یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے بھی بتاؤ، یہ تو کھل ہی نہیں رہی تھی''۔

شانی نے کہا، ''ماما! ابھی تجربہ کرکے دکھاتا ہوں'' اور بیلٹ اُس کی طرف بڑھادی کہ اپنی پہنی ہوئی پینٹ میں ڈالے۔ اُس نے جب ڈال لی تو شانی نے اُسے ٹائٹ کرنے کو کہا جو صرف ایک طرف سے کھینچنے پر ٹائٹ ہوگئی۔ شانی آگے بڑھا اور کہا۔

''دیکھو ماما! تھوڑا سانس کھینچ کر پیٹ اندر کرو اور اس سائیڈ والے بٹن کو دبا کر سانس چھوڑ دو''۔

اُس نے جب ایسا کیا تو بیلٹ ایک دم ڈھیلی ہوگئی۔ شانی نے کہا۔

''اب ایک ہاتھ سے بٹن دبا کر دوسرے سے سٹرپ دوسری طرف پکڑ کر کھینچ لو''

اُس نے ایسا کیا تو بیلٹ آرام سے کھل گئی۔ شانی نے کہا:

''ماما! اب دو تین بار تسلی کرلو''۔

یہ بہت آسان طریقہ تھا اور بیلٹ بالکل ٹھیک تھی۔ وہ شرمندہ ہوکر بولی

''تم مجھے پہلے بتادیتے تو میرے ساتھ ایسا نہ ہوتا''

''ماما! مجھے کیا پتہ تھا کہ تمہیں اس کے استعمال کا پتہ نہیں ہے''

وہ مطمئن ہوکر چلی گئی تو شانی بتانے لگا

''جاوید بھائی! پتہ نہیں یہ لوگ کون کون سے ملکوں سے آکر یہاں آباد ہوگئے ہیں، انہیں کچھ پتہ نہیں ہے اور پھر دیکھو ناں، اپنا ذہن بھی استعمال نہیں کرتے''

پیچھے ایک باب ''گھاٹے کا سودا'' میں میں نے جو حالات بیان کئے ہیں اُن کو گزرے ایک مدت ہوچکی تھی۔ اُس کے بعد میرے انگلینڈ کے کئی ٹور لگے اور ممتاز سے تعلقات خود بخود ہی بہتر ہوتے گئے۔

مذکورہ سٹور میرے اسی دوست ممتاز کا تھا۔ میں یہاں ملازم نہیں تھا بلکہ چند دن کے لئے مہمان کے طور پر ممتاز سے ملنے آیا ہوا تھا اور آج کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا صرف دوستانہ مدد کے لئے

کسٹمرڈیل کررہا تھا کیونکہ ممتاز کسی کام کے سلسلہ میں تھوڑی دیر کو باہر گیا ہوا تھا۔ گوکہ سٹور میں دو لڑکے کام کر رہے تھے اور وہ باآسانی سب سنبھال سکتے تھے، مگر وہ احتراماً کیش مشین سے ہٹ کر دوسرے کام کرنے لگے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں اُن کے باس کا نہ صرف دوست ہوں بلکہ سٹور کی دنیا کا پرانا کارندہ ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ممتاز آ گیا اور کہنے لگا کہ مجھے چند ضروری فون کالیں کرنی ہیں۔ میں نے کہا

''ٹھیک ہے، ٹل(Till) بھی ساتھ ہی ڈیل کرو، میں ذرا ''سُوٹا'' لگالوں''

وہ اوئے اوئے کرتا رہا، مگر میں نے سٹور کے دروازے کے باہر فٹ پاتھ پر جا کر سگریٹ سلگالی۔ سگریٹ ختم کر کے میں اندر آیا تو وہ فون پر مصروف تھا اور اُس کا موبائل اُس کے پاس کاؤنٹر پر پڑا تھا۔ میں اپنی عادت کے مطابق سٹور میں ایک رو(Row) کی طرف بڑھ گیا تاکہ غیر محسوس انداز میں کسٹمرز پر نگرانی رکھ سکوں۔ یہ اگرچہ کاؤنٹر مین کی ڈیوٹی ہوتی ہے، مگر کاؤنٹر مین مصروف تھا۔

میں رو(Row) کے آخر میں جا کر مُڑا تو میں نے ناچتی آنکھوں، تڑپتے اعضاء اور بھدے خدوخال کے ایک گندے سے نیگرو کو سٹور میں داخل ہوتے دیکھا۔ میری judgment کے مطابق وہ پکا چور تھا اور اب وہ جب تک سٹور میں تھا اُس وقت تک مجھے اُس پر نگرانی رکھنا تھی اور اُسے چوری کے معاملہ میں عاجز کر دینا تھا، بغیر کسی لڑائی کے۔ سو میں تیز تیز قدموں سے اُس کی طرف بڑھا تاکہ اُسے پتہ چل جائے کہ میں اُس کی طرف متوجہ ہوں۔ اُس نے چند سیکنڈ اپنی آنکھیں گھمائیں اور مجھے اپنی طرف بڑھتے پا کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ میں نے کچھ لمحے کاؤنٹر کے پاس توقف کیا۔ اُس نیگرو کو دیکھ کر لینڈ فون پر مصروف ہونے کے باوجود ممتاز کا ہاتھ لاشعوری طور پر اپنے موبائل پر پہنچ چکا تھا۔ میں مطمئن ہو کر ٹہلنے کے انداز میں دوسری رو(Row) کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں آدھے راستے میں ہی تھا کہ میں نے آواز سنی۔

"How much is that"

میں نے ریش(Rash) لہجہ میں یہ الفاظ سنے تو دیکھا کہ یہ وہی نیگرو ہے اور ممتاز سے کسی چیز کا پوچھ رہا ہے کہ ''وہ کتنے کی ہے''۔ اُس کا اشارہ غالباً کاؤنٹر کے پیچھے رکھی اشیاء میں سے کسی چیز کے متعلق تھا۔ ممتاز نے پیچھے کی طرف سے مڑتے ہوئے پوچھا

"Which one" یعنی کون سی؟

ممتاز کا ہاتھ غالباً مڑتے ہوئے اپنے موبائل سے تھوڑا اُٹھ گیا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ ممتاز پوری طرح اُس کی طرف متوجہ ہے اس لیے ''نو پرابلم''۔

یہی سوچ کر میں نے کاؤنٹر کی طرف چہل قدمی کے انداز میں موومنٹ جاری رکھی، مگر اگلے چند سیکنڈ حیران کن تھے۔ اُس کالے نے جھپٹ کر ممتاز کا موبائل اُٹھایا اور بگولے کی طرح دروازے سے نکل گیا، لیکن صرف چند سیکنڈ کے وقفے سے ممتاز نے ''اوہ باسٹرڈ'' کہتے ہوئے کاؤنٹر کے پیچھے سے چھلانگ لگائی اور اُس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ پھر اگلے چند سیکنڈ میں دونوں ملازم لڑکے بھی باہر دوڑ لگا چکے تھے۔ میں بغیر کسی افراتفری کے کاؤنٹر کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سٹور میں چند کسٹمر تھے جن میں اُس کا کوئی ساتھی بھی ہو سکتا تھا جو افراتفری سے فائدہ اُٹھا کر کاروائی کر سکتا تھا یا پھر باہر سے اُس کی ساتھی دوسری پارٹی سٹور خالی دیکھ کر حملہ کر سکتی تھی، سو مجھے اس سیکنڈ اٹیک کو روکنا تھا، کیونکہ یہ کوئی پلانڈ(Planned) واردات بھی ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی اگر کچھ کاروائی اُس چور کو پکڑنے کے سلسلہ میں ہو سکتی ہوئی تو وہ تین آدمی اُس کے پیچھے پہلے ہی تھے۔ میرے چوتھے سے کیا فرق پڑ جاتا؟ میں اس دوران موجود کسٹمرز کو مطمئن اور ڈیل کرتا رہا۔

تقریباً دس منٹ بعد ممتاز اور اُس کے لڑکے واپس آ گئے، وہ چور اُن کو جُل دے گیا تھا۔ اس دوران میرے خدشات غلط ثابت ہوئے تھے۔ وہ کوئی اکیلا ہی وارداتیا تھا۔ ممتاز نے مجھے کاؤنٹر کے پیچھے کسٹمرز ڈیل کرتے دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔

’’ویل ڈن بوائے ویل ڈن‘‘

میں نے اُسے اپنے خدشات مختصراً بتائے تو وہ بولا

’’میں نے ویل ڈن اسی لیے تو بولا ہے۔ میں لڑکوں کو راستے میں ڈانٹ رہا تھا کہ انہوں نے بھی میری طرح جذباتی ہو کر چور کے پیچھے دوڑ لگا دی اور سٹور خالی چھوڑ دیا۔ تمہارے والے خدشات مجھے بھی تھے، کیونکہ پیچھے تم اکیلے تھے، مگر تم نے غیر جذباتی انداز میں بہترین فیصلہ کیا‘‘

پھر لڑکوں سے کہنے لگا۔

It is called experience یعنی ’’یہ ہوتا ہے تجربہ‘‘۔

☞ ☞ ☞

دل ہی جب درد ہو تو......

ہم اس وقت لندن میں ایک سکھ ٹریول ایجنٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس سے سستے ترین ائیر ٹکٹ مل جاتے ہیں۔ وہ تمام ائیر لائنز کی ٹریول آفر (Offer) پر نظر رکھتا ہے اور نہایت معمولی مارجن پر بلکہ اُس کی زبان میں بعض مرتبہ صرف سیل بڑھانے کے لیے ''لگدے بھاؤ'' بھی بیچ دیتا ہے۔ چھوٹا سا دفتر تھا، مگر رش اور فون کی مسلسل کھڑکتی گھنٹیاں بتا رہی تھیں کہ کاروبار اچھا ہے۔ اُس کے بقول بلک (Bulk) سیل سے اُسے کمپنیوں سے ''گرودی کرپانال'' بہت سے مفادات (Incentives) مل جاتے تھے۔ ہم نے اُس سے میرے لیے لندن سے نیویارک تک کا ریٹرن ٹکٹ لیا اور اُس کے بزنس کرنے کے طریقہ پر گفتگو کرتے ہوئے پیدل چل پڑے۔ میرے ساتھ مرزا ضیاء تھا جو کہ میرے بھائی اعجاز رؤف خان کا دوست تھا۔ تھوڑی دور ایک ''چکن کارنرز'' نامی ''Take away'' تھا جس میں اُس کا کوئی دوست کام کرتا تھا۔ وہاں اُس سے ملے تو اُس نے خاصی آؤ بھگت کی اور جاتے سمے ''French fries'' "Chiken Nuggets" اور ڈرنکس ساتھ بھی کر دیے۔

اب ہم ایک ڈبل ڈیکر بس کے اوپری حصّے میں بیٹھے منظر بینی کر رہے تھے۔ گو چمکتی دھوپ تھی، مگر موسم میں خنکی تھی۔ تین دن بعد میری نیویارک کے لیے فلائٹ تھی۔ اچانک میں نے

جسم میں اور خصوصاً چھاتی بازو اور گردن کے پیچھے شدید درد محسوس کیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی جسم کے ریشوں کو کھینچ کر توڑ رہا ہو۔ میں نے یہ بات مرزا کو بتائی تو وہ بولا۔

''بھائی! آپ بھی تو حد کرتے ہیں، ہاف بازو کی شرٹ کے ساتھ نکل آتے ہیں۔ جسم پر کوئی گرم کپڑا نہیں۔ ٹھنڈ لگ گئی ہو گی۔ آپ کے ڈولے شولے بھی تو نظر لگانے کے لیے کافی ہیں''

شام تک درد کی شدت میں کافی اضافہ ہو چکا تھا اور بات حلقۂ احباب اور عزیز و اقارب میں پھیل چکی تھی۔ سب اپنے اپنے مشوروں سے نواز رہے تھے۔ سبھی کی تشخیص یہی تھی کہ لندن کی مشہور عالم ٹھنڈ لگ گئی ہے اور مجھے کوئی زود اثر اور طاقتور ''Pain Killer'' کافی کے ساتھ لینا چاہیے۔ میں ایسا کر چکا تھا اور اب بالکل خاموش رہ کر درد کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا، مگر ایک کال ختم نہیں ہوتی تھی اور دوسری ویٹنگ میں ہوتی تھی۔ یوں رات ہو گئی اور چھوٹے بھائی اعجاز نے مشورہ دیا کہ ہمیں ہسپتال ایمرجنسی میں جانا چاہیے، مگر میں ٹال گیا اور رات بھر درد سے لڑتا ہوا جاگنے اور اونگھنے کی کیفیت میں رہا۔

صبح دم بھائی نے کام پر جانا تھا، مگر اُس نے میری حالت کے پیشِ نظر کام سے چُھٹی کا پروگرام بنا لیا۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے اُسے تسلی دے کر زبردستی کام پر بھیج دیا۔ مرزا اور جاوید نامی لڑکے نے شام کو کام پر جانا تھا سو وہ دونوں میرے پاس تھے۔ 9 بجے کے قریب میں نے باتھ روم میں ضروریات سے فارغ ہو کر حسبِ عادت نہانے کے لیے جسم پر پانی ڈالنے کا ارادہ کیا تو محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔ جب میں نہائے بغیر بمشکل منہ دھو کر باہر نکلا تو مرزا نے پوچھا۔

''بھائی کیا بات ہے''

وہ سب میری عادت سے واقف تھے کہ کسی بھی موسم میں صبح دم نہانا میرا معمول ہے۔

''لگتا ہے یار ڈاکٹر سے رابطہ کرنا ہی پڑے گا''

''ایمبولینس کال کروں'' وہ ایکدم پریشان ہو گیا۔

''نہیں بھئی، ناشتہ وغیرہ کرو، پھر خود ہی چلتے ہیں۔ ویسے ہسپتال کتنی دور ہے''؟

''تقریباً آدھا میل''

میں نے انہیں زبردستی ناشتہ کروایا۔ ٹیکسی منگوانے کو بھی منع کر دیا اور پیدل ہی ہسپتال پہنچ گئے۔ ایمرجنسی میں تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد باری آئی۔ ایک نرس مریضوں کا بخار، نبض کی رفتار اور بلڈ پریشر وغیرہ چیک کر کے انہیں متعلقہ ڈیپارٹمنٹ میں بھیج رہی تھی۔ مجھے چیک کیا، میری کیفیت پوچھی اور بولی،

"B.P, Pulse,Temprature ,every thing is normal Man."

''یعنی بلڈ پریشر، نبض کی رفتار اور بخار، سب نارمل ہے جناب''

"But I am feeling killing pain in my whole body particularly in chest area, neck and arms."

''لیکن مجھے مار دینے والا درد جسم میں محسوس ہو رہا ہے، خصوصاً سینہ، گردن اور بازوؤں میں''

''ٹھیک ہے۔ آؤ تمہاری E.C.G دیکھتے ہیں''

''OK , Let we see your ECG.''

یہ کہہ کر وہ مجھے لیکر کارڈیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں موجود سینئر نرس کے حوالے کر آئی۔ اُس نرس نے میرا اوپری جسم ننگا کروایا، بہت سی ٹوٹیاں اور وائرز جسم پر فٹ کیں۔ بلڈ پریشر کا آلہ بازو پر فٹ کیا اور سب کو کمپیوٹر سے منسلک کر کے بٹن آن کر دیا۔ مشینوں نے کام شروع کیا تو وہ اُس کے جائزے کے ساتھ ساتھ مجھ سے سوالات بھی کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد بولی

''Please stay motionless, I am just comming''

ہلنا نہیں، میں ابھی آرہی ہوں"

وہ کمپیوٹر کی سائیڈ سے نکلنے والا کاغذ لے کر چلی گئی۔ ابھی صرف دو منٹ کے قریب ہی ہوئے تھے کہ مردانہ اور زنانہ جوتوں کی ٹک ٹک سے بھاگتے قدموں کا اندازہ ہوا۔ ایک ڈاکٹر مع اُس نرس کے اندر داخل ہوا اور تیز تیز احکامات صادر کرنے لگا۔ اگلے دو منٹ میں مَیں اُسی بیڈ سمیت انتہائی نگہداشت کے کمرے میں تھا۔ میرے منہ پر آکسیجن ماسک فٹ ہو چکا تھا اور کئی سرنج خون مختلف ٹیسٹوں کے لیے حاصل کر لیا گیا تھا۔ آکسیجن ماسک لگنے کے دس منٹ بعد ہی میرا باڈی پین(Body Pain) کم ہونا شروع ہو گیا۔ وہی نرس مستقل میرے پاس تھی۔ میرے تمام اپر (Upper) پر ٹوٹیاں فکس تھیں۔ سرہانے لگی مشینیں مسلسل ریڈنگ دے رہی تھیں، ہر پانچ منٹ بعد مشین آٹو میٹک میرا B.P لے رہی تھی اور میں حیران سا یہ تماشہ دیکھتے ہوئے صرف یہ سوچ رہا تھا کہ معاملہ کچھ سیریس لگتا ہے۔ مجھے کارل مارکس کا قول یاد آرہا تھا کہ "صحت کو عزیز رکھو نہ کہ زندگی کو" لیکن میں نے گزشتہ کچھ عرصہ سے ہنگامۂ روزگار میں اس طرف سے شدید لاپرواہی برتی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر آیا۔ نرس سے کچھ بات کی تو وہ فوراً باہر نکل گئی۔ پھر مجھ سے بولا

"کیا اب تم کچھ بہتر محسوس کر رہے ہو؟"

"Are you feeling some relief now?"

"ہاں اب بہتر محسوس ہو رہا ہے۔ تمہارا شکریہ"

"Yes, feeling better now, thank you."

"کیا تمہارا کوئی ساتھی ریسیپشن میں ہے؟"

"Its ok, is there anybody with you in the reception.?"

"ہاں، دو بچے ہیں۔" " Yah , Two Kids."

"تمہارا مطلب ہے تمہارے بیٹے"؟ "You Mean, your sons?"

No, they are the friends of my younger brother But they are just like my sons.''

''نہیں، وہ میرے چھوٹے بھائی کے دوست ہیں، لیکن میرے لیے بیٹوں کی طرح ہیں''

اتنے میں نرس ایک فائل لیے آن پہنچی جس پر میرا نام وغیرہ لکھا تھا۔ڈاکٹر نے اُس میں لگے کاغذات کا جائزہ لیا جو زیادہ تر مختلف رپورٹس (Reports) پر مشتمل تھے۔بالآخر اُس نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔

"Mr Khan! To whom, I can talk about you?"

''مسٹر خان! میں تمہارے متعلق کِس سے بات کروں؟''

کِس چیز کے متعلق؟ **About what ?**

تمہاری بیماری اور علاج کے متعلق؟

About your Disease and about Treatment.

تم میرے ساتھ بات کر سکتے ہو

''You can talk directly with me.''

لیکن کئی مرتبہ یہ مسئلہ بن جاتا ہے۔

But in some cases, it causes problems

''بے فکر رہو، میرے پاس بہت ہمت ہے''

Dont worry, I have enough courage.

میں سمجھ گیا تھا کہ معاملہ کچھ گھمبیر ہے، اِسی لیے وہ محتاط ہے، مگر اس پردیس میں اپنے متعلق فیصلہ میرے علاوہ کون بہتر کر سکتا تھا۔اُس نے غور سے میری طرف دیکھا، نرس سے آنکھوں آنکھوں میں کوئی بات کی۔شاید اُسے گواہ بنا رہا تھا۔پھر بولا

Mr Khan, listen carefully, You have got a heart attack.?

مسٹر خان! احتیاط سے سنو، تمہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔

یہ بات میرے لیے حقیقتاً کافی صدمے کا باعث تھی، مگر اس کے آثار تقریباً چھ ماہ پہلے سے میرے خون میں کولسٹرول کی زیادتی سے مل رہے تھے، مگر میں نے خاص توجہ نہیں دی تھی، کیونکہ یہ زیادتی صرف چند پوائنٹ تھی اور کچھ میرے ڈاکٹر سعید صاحب کو مناسب دوا نہیں مل سکی تھی، کیونکہ وہ ایک **Physician** تھا۔ ہارٹ سپیشلسٹ نہیں، اُس نے مجھے واک وغیرہ کی تلقین کی تھی۔ مجھے یہاں تک اُمید نہیں تھی، مگر پچھلے چوبیس گھنٹے کے عذاب نے بتا دیا تھا کہ دال میں کافی کالا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر کی تمہید سے میں کسی بھی بُری خبر کے لیے چوکس ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے سپاٹ چہرہ کے ساتھ کہا۔

''یہ حقیقتاً صدمے کا باعث ہے، مگر اگلا مرحلہ کیا ہے؟''

"It is really shocking, But what is the next now?"

وہ غور سے میرا ردِ عمل دیکھ رہا تھا، پھر بولا

You really have a lot of courage. I want to talk with you about an injection. I think it is very essential in this condition but ....

بلاشبہ تم میں بہت ہمت ہے۔ میں تم سے ایک انجکشن کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے وہ ان حالات میں ضروری ہے مگر۔۔۔۔۔

''مگر کیا۔۔۔؟'' **What But ?**''

You have got the attack of ''angina.'' This injection usually disolve the clot in the heart veins but only in one case by 100, if it is not effective , it makes the case more serious. very clearly, it can be

the cause of death too. Can you allow me for this injection?

تمہیں انجائنا کا اٹیک ہوا ہے۔ یہ انجکشن عموماً دل کی نالیوں میں آئی رکاوٹ کو دور کر دیتا ہے، لیکن 100 میں سے ایک کیس میں اگر یہ کام نہ کرے تو یہ کیس کو اور سنجیدہ کر دیتا ہے۔ صاف لفظوں میں موت کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔ کیا تم مجھے اس انجکشن کی اجازت دیتے ہو۔؟

I can not be so unlucky like those one percent,s. In heart attacks,as I know, people have not found the relaxation of 24 hours like me . So take it easy and go ahead.

''میں اُن ایک فیصد لوگوں کی طرح بدقسمت نہیں ہوسکتا۔ دل کے دورے میں، جیسا کہ مجھے معلوم ہے، میری طرح 24 گھنٹے کی مہلت نہیں ملا کرتی۔ بے فکر ہو کر اپنا کام کرو''

اُس نے غور سے مجھے دیکھا، کچھ کاغذوں پر میرے دستخط لیے۔ نرس سے کچھ کہا، جس نے میرے ہاتھ پر فکس قینولہ میں سرنج کے ذریعے دوائیاں انجیکٹ (Inject) کرنا شروع کر دیں۔ مجھے یوں لگا کہ ایک آگ سی رگوں میں تیرتی ہوئی جا رہی ہے۔ ضبط نے آنکھوں کی سرخی اور ماتھے پر پسینے میں ہی اضافہ کیا ہوگا اور بَس۔ اگلے چند منٹ اس لیے سنسنی خیز تھے کہ مجھے ڈاکٹر کے ماتھے پر معمولی سی سلوٹ اور آنکھوں کا انہماک کہہ رہا تھا کہ ابھی سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اُس کی نظریں مسلسل میرے چہرے اور مشینوں کی سکرین پر چکرا رہی تھیں۔ بالآخر تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایک طویل سانس لیکر بولا۔

"It looks all ok now. Brave you man, I do not see any fear even in your eyes."

''میرا خیال ہے اب سب ٹھیک ہے۔ تم بہادر آدمی ہو، میں نے تمہاری آنکھوں تک میں بھی خوف نہیں دیکھا''

''No body can live more than he is permitted''

''کوئی آدمی اُس سے زیادہ نہیں جی سکتا جتنی اُسے مہلت دی گئی ہے'' میں نے جواب دیا۔

Yes, Yes, I agree. It is easy to say But not easy to bear yourself.

''ہاں۔ہاں۔میں اتفاق کرتا ہوں۔یہ کہنا آسان ہے،مگر خود برداشت کرنا نہیں''

اُس نے میرا کندھا تھپکا اور نرس کو کچھ ہدایات دیکر نکل گیا۔اگلے آدھے گھنٹے بعد میرا بیڈ I.T.U (**Intensive Theorapy Unit**) میں شفٹ کر دیا گیا۔نرس نے میرے ہاتھ کے نیچے **call bell** کا بٹن رکھا اور بولی

"Please do not move your body. Even if you need to change the side,Please press this button.I am gona call your friends now."

''مہربانی کر کے بالکل ہلنا نہیں ہے۔اگر تمہیں کروٹ بھی لینا ہو تو یہ بٹن دبا دینا۔میں تمہارے دوستوں کو بلانے جا رہی ہوں''

اگلے چندمنٹ بعد دونوں لڑکے مرزا اور جاوید میرے پاس تھے۔نرس انہیں خاصا بریف کر چکی تھی۔اس لیے وہ مجھے حوصلہ اور تسلی دے رہے تھے۔میرے جسم کا درد بہت حد تک غائب ہو چکا تھا،مگر ایک نقاہت کی کیفیت تھی۔تھوڑی دیر بعد نرس نے انہیں جانے اور مجھے آرام کرنے کے لیے کہا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کِسی نے مجھ سے فوٹو آئی ڈی مانگی نہ اڈریس آئی ڈی۔مجھ سے میڈیکل کارڈ کا بھی نہیں پوچھا گیا۔نہ کِسی نے میرے **Status** کے متعلق سوال کیا نہ میرے ساتھیوں کو لاکھوں روپے جمع کروانے کا کہا۔نہ ہی میڈیکل انشورنس کا سوال ہوا،بَس اُن کے سامنے ایک انسانی زندگی کا مسئلہ تھا۔جِسے وہ بچانے کے لیے ہمہ تن جُت گئے۔انہوں نے ایمرجنسی کو ایمرجنسی (**EMERGENCY**) ہی کی طرح ٹریٹ (**Treat**) کیا اور بَس۔باقی باتیں

بعد ہی ہیں۔ اُن کا ہر رویہ یہ کہہ رہا تھا کہ جیسے میں کوئی VIP ہوں اور اُن کے لیے ایمرجنسی میں آنے والا ہر مریض VIP ہی ہوتا تھا۔ یہ اُن کی تربیت کا حصّہ تھا۔ ذرا سی غفلت پر مریض انہیں عدالتوں میں گھسیٹ لیتے تھے اور اس ساری سروس کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ اُن کی عدالتیں بھی حکومتی مؤقف کی حمایت کی بجائے صرف انصاف کرتی تھیں۔

انگلینڈ میں بڑے بڑے ہسپتال بھی صرف گورنمنٹ کے خرچ پر نہیں چلتے بلکہ اُن کو بھی بڑی بڑی چیرٹی ''Charity'' تنظیموں کی امداد حاصل ہوتی ہے۔ گورے عموماً چیرٹی کے لحاظ سے فراخ دل ہوتے ہیں اور وہ اپنی امداد اس سلسلہ میں قائم تنظیموں کے ذریعے ہی استعمال کرنا پسند کرتے ہیں، کیونکہ انہیں پتا ہوتا ہے کہ یہ امداد انتہائی شفاف طریقے سے اور ضرورت کی جگہ پر ہی استعمال ہوگی۔ یقیناً برطانیہ ایک کامیاب فلاحی ریاست ہے۔ انہی سوچوں میں گم مَیں نیند میں چلا گیا۔

شام کو بھائی اور اُس کے احباب میرے سرہانے تھے۔ شاید نقاہت تھی یا اُس انجکشن کے آفٹر ایفکٹ (After effect) کہ طبعیت بوجھل تھی۔ جسے دیکھ کر اعجاز بھائی جو کہ یقیناً مجھ سے خاصی محبت رکھتا تھا آنسو نہ روک پایا۔ میں نے اُسے تسلی دی اور گھر (پاکستان میں) کچھ نہ بتانے کی تاکید کی (جسے وہ نبھا نہ پایا)۔

میں ہفتہ بھر ہسپتال میں رہا۔ دل کے متعلقہ کوئی چیرٹی تنظیم تھی اُس کی نمائیدہ روزانہ دوپہر کو میرے پاس آتی۔ خوشگوار انداز میں گپ شپ کرتی۔ مجھے دل کے فنکشن (Function) کے متعلق لیکچر دیتی۔ دل کے اس دورے کے بعد اگلی زندگی میں احتیاط اور کام کے سٹائل میں تبدیلی اور خوراک کے متعلق بتاتی۔ غرضیکہ اس عرصہ میں اُس نے مجھے اس دورہ زدہ دل کے ساتھ جینے کے گُر بتائے۔ یہ سب اُس چیرٹی تنظیم کی طرف سے بلا رنگ و نسل مفت امداد تھی۔ پانچ دن بعد ہسپتال والوں نے میرا E.T.T ٹیسٹ لیا تو میں 8 منٹ تک مشین پر بلا سانس

پھولے یا تکلیف محسوس لیے دوڑتا رہا۔ اس دوران مشین میرا BP، پلس (Pulse) اور E.C.G گراف نکالتی رہی۔جنہیں چیک کر کے اگلے دن مجھے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ نرس نے الوداعی لیکچر دیتے ہوئے کہا۔

''مسٹر! مجھے حیرت ہے اس مصروف دور میں تمہارے بے شمار احباب نے تمہیں وزٹ کیا ہے۔گھر جا کر تمہیں کم از کم 6 ہفتے سیڑھیاں چڑھنے اور سفر کرنے سے گریز کرنا ہے اور زیادہ آرام کرنا ہے۔اپنے دوستوں کو بہت زیادہ وقت نہ دینا۔ہمارا کوئی نہ کوئی نمائندہ تمہاری رہنمائی کے لیے رابطے میں رہے گا۔اپنے G.P کے ذریعے اینجیوگرافی کا وقت لے لینا۔ابھی تم مکمل ٹھیک نہیں ہو۔میں تم سے احتیاط کی درخواست کروں گی'' اس کے ساتھ ہی اُس نے میرے حوالے ایک فائل کی جس میں میری کیس ہسٹری، ہسپتال سے ڈسچارج سرٹیفکیٹ، آئندہ استعمال کے لیے نسخہ اور دل کی بیماری کے متعلق اور احتیاطوں کے متعلق اردو اور انگریزی میں بہت سا لٹریچر تھا۔

گھر پہنچ کر پاکستان فون کیا تو بیگم دھاڑیں مارنے لگی۔ بچے الگ پریشان تھے اور میرے فالج زدہ والد صاحب بھی انتہائی پریشانی میں تھے۔شام تک بلیک برن سے چچا بھی تشریف لے آئے۔رات کو ذرا تنہائی ملی تو مجھ سے آئندہ زندگی گزارنے سے متعلق پوچھا۔گفتگو کا لُبِ لباب یہ تھا کہ اب مجھے سابقہ ہنگامی زندگی سے باہر نکلنا چاہیے، کیونکہ اب میں اس قابل نہیں رہوں گا۔پھر فرمانے لگے کہ اب مجھے پاکستان میں بیٹھ کر کوئی ایزی کام کرنا چاہیے۔وہ میری امداد کے لیے بہت سے پونڈ بریف کیس میں بھر کر لائے ہیں۔اس کے علاوہ مزید بھی وہ حاضر ہیں۔ میں نے نرمی سے دعاؤں کی درخواست کے ساتھ پیشکش مسترد کر دی۔

اگلے دن چیرٹی تنظیم کی نمائندہ گھر پر میرے پاس آئی۔ مجھے حاصل سہولیات کا جائزہ لیا۔کچھ مزید پمفلٹ دیے۔کچھ تلقین کی اور اب آئندہ ہفتہ وار وزٹ کا کہہ کر چلی گئی۔یہ بھی اُن لوگوں کی انسانی ہمدردی کی بہترین مثال تھی۔اُس کے جاتے ہی میں نے اُس کی نصیحت کے

برعکس فون اُٹھایا اور آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد تیسرے دن کے لیے پاکستان کی واپسی فلائٹ بُک کروالی۔ نصیحتیں اپنی جگہ، مگر مجھے اپنے خاندان اور حالات کے مطابق فیصلے کرنے تھے۔ چچا اور بھائی نے بھی روکنے کی کوشش کی، مگر میں اٹل رہا۔ اعجاز مجھ سے بہت چھوٹا تھا اور مؤدب بھی بہت تھا۔ اُس نے بالآخر مجھ سے کُھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور مستقل ماہانہ بنیادوں پر کچن منی (Kitchen Money) مہیا کرنے کا عندیہ دیا۔

مجھے یہ سب پیشکشیں سن کر اب لگا کہ میں شاید واقعتاً ناکارہ ہوگیا ہوں۔ وہ تو اپنے پیار اور ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے، مگر میرا سرکش دماغ اس صورتِ حال کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ جب اعجاز بھائی کا اصرار بہت بڑھا تو میں نے کہا۔ ''دیکھو یار! میری ساری زندگی بحرانوں سے نمٹتے گزری ہے۔ امداد وصول کرنا میرا مزاج ہی نہیں ہے۔

"This is a bloodly incident. Let me face it with my courage."

''یہ بھی ایک بُرا حادثہ ہے۔ مجھے اس کا مقابلہ اپنے حوصلے سے کرنے دو۔ تبھی میں زندہ رہ سکوں گا ورنہ خود کو ناکارہ محسوس کرتے ہوئے جلدی مر جاؤں گا۔''

تیسرے دن میں پاکستان میں تھا جہاں میرے بوڑھے اور بیمار والد نے اپنی پنشن کی رقم سے خدا کے حضور میری باسلامت واپسی پر نیاز کی دیگ چڑھا رکھی تھی۔ بھائی انجم تمام عمر کے لیے دوائی کی پیشکش کے ساتھ موجود تھا اور اُس نے زبردستی اپنے خرچے پر میری انجیوگرافی بھی کروائی، مگر دوائیاں میں نے قبول نہ کیں۔ میرے بھائی حاجی صاحب نے تمام تر کدورت کے ساتھ انوکھا تبصرہ کیا یعنی

''لوگ تو معمولی ہارٹ اٹیک میں مر جاتے ہیں، مگر اس کی مٹی زیادہ ہی ڈھیٹ لگتی ہے''

یوں یہ محبتوں اور نفرتوں کا سفر اب بھی جاری ہے۔

غم کہاں اہلِ محبت سے جدا ہوتے ہیں

میں لندن کے **Gatwick** ائیر پورٹ سے باہر نکلا تو اس دفعہ مجھے وہ طویل سانس کھینچنے کا ہوش بھی نہیں تھا جس کو میں لندن کی ہواؤں سے کشید کیا کرتا تھا۔ حاجی صاحب مجھے رسیو کرنے ائیر پورٹ کے باہر موجود تھے۔ اُن کے ساتھ پچھلے تقریباً پندرہ سال پر محیط اختلافی دور وقتی طور پر دب گیا تھا۔ اس کی وجہ ہمارا بھائی اعجاز رؤف خان تھا جو کہ پچھلے ایک ماہ سے لندن کے ایک نیورو ہسپتال میں قومہ کی حالت میں پڑا تھا۔

ایک ماہ قبل پاکستان میں گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔ شادی کے کارڈ تقسیم ہو رہے تھے۔ چند دن بعد بھائی اعجاز کی لندن سے پاکستان کے لیے فلائٹ تھی اور مزید چند دن بعد ہم نے اُس کی بیگم کو رُخصت کروا کر گھر لانا تھا جس کا نکاح پہلے ہی ٹیلیفون پر اعجاز سے پڑھایا جا چکا تھا۔ شادی ہال بک ہو چکا تھا۔ اُس کی بیگم کا ویزہ اپلائی کیا جا چکا تھا، کیونکہ اعجاز نے صرف ایک ماہ قیام کر کے بیگم کو ساتھ لے کر لندن جانا تھا۔ اچانک خبر آئی کہ اعجاز کا لندن میں کار ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ کار میں اعجاز اور اُس کا دوست مرزا تھے۔ وہ دونوں زخمی ہو گئے۔ بھائی کی ٹانگ میں فریکچر ہوا تھا اور ایکسیڈنٹ کے بعد وہ ہوش میں تھا۔ دوسرے دن خبر ملی کہ اُس کی ٹانگ کا اپریشن ہوا ہے اور اُس کے بعد وہ ہوش میں نہیں آ رہا۔

اُن دنوں میرے بھائی حاجی صاحب پاکستان میں کسی سلسلہ میں آئے ہوئے تھے۔اُن کے بیوی بچے انگلینڈ میں ہی تھے۔تمام تر اختلافات کے باوجود ہم نے اُن سے استدعا کی کہ چونکہ وہ انگلینڈ کے نیشنل ہیں اور وہاں کے معاملات کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں اس لیے وہ فوراً وہاں پہنچیں۔اُنھوں نے مہربانی کی کہ مان گئے اور اگلے دن ایمرجنسی فلائٹ پکڑ کر بھائی کے سر پر پہنچ گئے۔اُنھوں نے جو رپورٹ دی اُس کے مطابق اُس ہسپتال کا آرتھوپیڈک سرجن ایک انڈین ڈاکٹر تھا۔جس نے ہماری فیملی ہسٹری جانے بغیر بھائی کی ٹانگ کا اپریشن کر دیا۔جو کہ ایک خلافِ قانون بات تھی۔اُسے اپریشن سے قبل اعجاز بھائی سے جو کہ اُس وقت ہوش میں تھا یا کہ ہمارے چچا سے جو کہ 24 گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچ گئے تھے، ہماری فیملی ہسٹری معلوم کرنا چاہیے تھی۔ ہمارے والد کو اور مجھے (بڑے بھائی) کو ہارٹ پرابلم رہی ہے۔اگر وہ ایسا کر لیتا تو آپریشن کے وقت ہارٹ بیٹ (Heart Beat) میں آنے والی کسی بھی ''Abnormality'' کو کنٹرول کرنے کے لیے اپریشن تھیٹر میں انتظام کے بعد ہی اپریشن کرتا، مگر اُس نے غفلت کی اور ایسا نہ کیا۔اسی وجہ سے جب اپریشن کے دوران بھائی کے دل نے اچانک کام کرنا چھوڑ دیا تو اُس کا دل دوبارہ چالو کرنے میں ہسپتال کے عملہ کو کئی منٹ لگے جس کے دوران تمام جسم اور دماغ کو خون کی سپلائی بند رہی۔ایکسیڈنٹ میں شاید دماغ کو بھی کوئی جھٹکا لگا تھا۔اس کے بعد اُسے خون کی سپلائی اور ساتھ میں آکسیجن کی سپلائی بند رہی تو دماغ قومہ میں چلا گیا اور یوں وہ ایک ماہ سے قومہ میں تھا۔مصنوعی خوراک کے ذریعے اور آکسیجن کے ذریعے ڈاکٹروں نے اُسے زندہ اور جسمانی طور پر صحت مند رکھا ہوا تھا۔

حاجی صاحب کی رہائش مانچسٹر کے قریب ایک چھوٹے سے ٹاؤن ایکرنگٹن (Accrington) میں تھی اور وہ مہینہ بھر سے لندن کے رائیل انفرمری ہسپتال میں بھائی کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔اُنھوں نے ہمیں ٹیلی فون کیا کہ فوراً فیملی سے کوئی آدمی پہنچے، کیونکہ اُن

کی بیگم کے ڈیلیوری ہونے والی تھی اور اُنہیں واپس ایڈنگٹن جانا تھا۔ اعجاز کے متعلق ڈاکٹر حاجی صاحب سے میٹنگ کر کے دبے لفظوں میں یہ کہہ چکے تھے کہ اب اگر یہ ہوش میں آ بھی گیا تو شاید کبھی بھی نارمل زندگی نہ گزار سکے۔ اشارے کنائے میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر فیملی اجازت دے تو جو اُس کو مصنوعی لائف سیونگ مشینیں لگائی ہوئی ہیں وہ اتار دی جائیں، کیونکہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ جس میں تمام زندگی معذوری یا پاگل پن میں گزرے، کیونکہ اس (اعجاز) کے دماغ کے بہت سے حصّے اُس دل کے بند ہونے کے وقفے میں تباہ ہو چکے ہیں، لیکن حاجی صاحب نے یکسر انکار کر دیا اور ہسپتال کے خلاف کورٹ میں جانے کی دھمکی دی جس سے انہوں نے غالباً یہ ارادہ تبدیل کر دیا۔

حاجی صاحب نے مجھے ان تمام حالات کے متعلق بریف(Brief) کیا۔ ہسپتال انتظامیہ اور حاجی صاحب کے درمیان ایک بہت زبردست ٹینشن کی فضا تھی۔ ہسپتال کی طرف سے حاجی صاحب کو رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کمرہ ملا ہوا تھا۔ اعجاز I T U (Intensive Theoropy Unit) میں تھا۔ میں نے اُسے دیکھا تو ایسا لگا کہ یہ بالکل صحت مند ہے۔ ابھی اُٹھ کر بیٹھ جائے گا۔ وہ پونے چھ فٹ کا انتہائی صحت مند جسم کا مالک جوان تھا۔ مشینیں اُس کے جسم پر فِٹ(Fit) تھیں جن میں اہم ترین Ventilator تھی جو کہ مسلسل آکسیجن کی سپلائی دے رہی تھی۔ سرہانے لگی سکرین پر مسلسل اُس کے دل کی دھڑکن (Heart Beat) نبض (Pulse) کی رفتار، بی۔پی(Blood Pressure) کی فگرز (Figures) آ رہی تھیں، مگر دیکھنے میں وہ بالکل صحت مند لگ رہا تھا۔

میں آتے ہی اعجاز کے ہاؤس میٹس(House Mates) کے ساتھ رابطے میں آ گیا تھا۔ اُن لوگوں نے حاجی صاحب کے سخت اور انتہائی Straight forward انداز کی وجہ سے تعاون چھوڑا ہوا تھا، مگر روز کوئی نہ کوئی اُسے دیکھنے ضرور آتا۔ حاجی صاحب اپنی جگہ درست

تھے کہ انہیں اعجاز کے مالی معاملات، انشورنس پیپرز اور بنک اکاؤنٹس وغیرہ کے متعلق مکمل معلومات اور کاغذات درکار تھے، مگر چونکہ تمام لڑکے جانتے تھے کہ اِن کے پوری فیملی کے ساتھ اعجاز سمیت تعلقات مناسب نہیں ہیں اس لیے ممکن ہے انہوں نے مناسب تعاون نہ کیا ہو۔ بہرحال حاجی صاحب کو سختی کرنا پڑی اور کشیدگی پیدا ہوگئی، لیکن میرا مزاج تھوڑا مختلف تھا اور سب لڑکے مجھے جانتے بھی تھے کہ میں کئی دفعہ اعجاز کے پاس آ چکا تھا۔ سو میں نے اعجاز کے گھر میں ہی رہائش کو ترجیح دی۔

جس وقت انسان پر اس طرح کا کوئی ناگہانی عذاب نازل ہوتا ہے تو وہ سیلاب میں بھی تنکوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اِسی طرح کی صورتِ حال ہمارے گھر میں بھی تھی اور اعجاز کے سسرالیوں کے گھر میں بھی۔ بہت سے پیر فقیر اور بہروپیے دونوں گھروں سے مال بٹور رہے تھے۔ سو جس وقت میں پاکستان سے چلنے لگا تو پڑھنے کو بہت سے وظیفے ڈائری میں لکھے تھے۔ جنہیں پڑھ کر مجھے اعجاز پر پھونکنا تھا اور عامل کے دعویٰ کے مطابق اِس عمل کے بعد اعجاز نے زیادہ سے زیادہ تیسرے دن آنکھیں کھول دینا تھیں۔ اِسی طرح چھینٹے مارنے کے لیے پڑھے ہوئے پانی کی بوتل تھی۔ ایک اور چھوٹی سی بوتل تھی۔ اُس میں موجود دم شدہ عرق کو کسی نہ کسی طرح اعجاز کے منہ میں انڈیلنا تھا۔ کچھ تعویز وارنے کے لیے تھے۔ غرضیکہ اِسی طرح کے بہت سے گُند اور بے فیض اوزار میرے پاس تھے جس سے مجھے اُس کا روحانی علاج کرنا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ بے یقینی کے باوجود اس لیے رکھنا پڑا تھا کہ ان کو دینے والا ہر شخص ہزاروں لوگوں کے علاج کا دعویدار تھا اور جن کے ذریعے یہ مجھے لیجانے کو ملے تھے وہ میرے اور اعجاز کے سگے تھے اور انہوں نے ان چیزوں کے حصول کے لیے بہت پیسا خرچ کیا تھا۔ سو یہ اُن کا خلوص تھا جس کو ٹھکرا کر میں راندۂ خاندان نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس سے قبل بھی ایک پیر صاحب کے دعوی پر میں نے اُس کے لکھے تعویز فیکس کے ذریعے اپنے دوست ممتاز کو بھیجے تھے اور اُس بیچارے نے اُس کے چھینٹے تمام لوگوں کی نظر بچا کر اعجاز پر مارے تھے، مگر لاحاصل۔

حاجی صاحب میرا تعارف ہسپتال کے متعلقہ لوگوں سے کرا کر جا چکے تھے۔ میں روز صبح جاتا اور درج بالا ٹوٹکے آزمانے کی کوشش کرتا۔ سب سے مشکل مرحلہ اُس کے منہ میں دم شدہ پانی ڈالنے کا تھا، کیونکہ اُس کی تمام Oral Diet بند تھی۔ ہسپتال میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ڈاکٹر، نرسوں اور وزٹرز، سب پر لازم تھا کہ مریض کے پاس جانے سے پہلے جراثیم کش لوشن ہاتھوں پر مَل کر جائیں۔ کمرے سے کسی ضرورت کے لیے باہر جا کر واپس آنے پر پھر یہ عمل دہرانا پڑتا تھا، مگر میں نے ڈراپر والی پلاسٹک کی بوتل میں پانی ڈالا ہوا تھا اور روز کیمروں اور ITU کے عملے کو دھوکہ دے کر یہ ٹوٹکے آزمانے کی کوشش کرتا رہا۔

اُدھر حاجی صاحب ہسپتال انتظامیہ کے ساتھ اور ڈاکٹرز کے ساتھ مسلسل رابطے میں، بلکہ حالتِ جنگ میں تھے۔ وہ اُن کے لیے ایک ناپسندیدہ شخصیت بن چکے تھے، کیونکہ وہ اپنی تمام تر مالی طاقت، عقل اور برٹش حقوق کو بھائی کے پلڑے میں ڈال چکے تھے اور اُس کی زندگی کے لیے اُن سے لمبی قانونی جنگ کے لیے تیار تھے، جبکہ ڈاکٹرز کی متفقہ رائے تھی کہ اول تو اعجاز بچے گا نہیں اور اگر بچے گا تو یہ ایک ابنارمل لائف ہوگی۔ یہ ایک اعصابی جنگ تھی جس نے حاجی صاحب کو بہت چڑچڑا کر دیا تھا، مگر وہ اپنے مؤقف سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے کہ یہ سب ہسپتال کے عملے کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ اب اگر مریض پر ہزاروں پونڈ روز خرچہ آ رہا ہے تو یہ سب اُنہی کا کیا دھرا ہے۔ اب اگر ہسپتال والوں نے کوئی مزید حرکت کرنے کی کوشش کی (جس کا امکان نظر آ رہا تھا) تو وہ سب کو کورٹ میں دیکھ لیں گے۔

یہ Tussel چل رہی تھی کہ میڈیا پر امریکہ میں ایک عورت کے اسی طرح کے کیس میں قومے میں جانے اور تین سال بعد ہوش میں آنے کی خبر نے ہمارے ڈوبتے حوصلوں کو ہی سہارا نہیں دیا بلکہ حاجی صاحب کو ایک مزید فائیٹنگ پوائنٹ بھی مہیا کر دیا۔ اُس عورت نے ہوش میں آ کر اپنے خاوند اور بچوں کو پہچان لیا تھا اور تیزی سے Recover کر رہی تھی۔ حاجی صاحب

نے فوری طور پر نیٹ کے ذریعے اس عورت کو ٹریٹ(Treat) کرنے والے ڈاکٹروں سے رابطہ کی کوششیں شروع کر دیں تا کہ پرائیوٹ طور پر اُن کو ہائر(Hire) کر کے انگلینڈ بلوایا جا سکے۔اسی طرح اُنہوں نے جرمنی،فرانس اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے نیوروسرجنز کے ساتھ رابطے شروع کر دیے اور انہیں بھائی کی کیس ہسٹری بھیج کر ڈسکس کرنے لگے۔ساتھ ساتھ اُنہوں نے ملک کے (یو کے کے) بڑے بڑے وکلاء جو NHS (National Health Services) سے متعلقہ کیس ڈیل کرتے تھے سے رابطے شروع کر دیے۔انہیں بھائی کی کیس ہسٹری بھیجی،اپنے شبہ اور خدشات کی سٹیٹ منٹ بھیجی،ڈاکٹرز کی Negligency کا بتایا اور اُن سے ہسپتال انتظامیہ کے خلاف کیس کی صورت میں امکانات پر رائے مانگی اور کیس کے طریقہ کار پر Conversation شروع کر دی۔

تیسری طرف اُنہوں نے بھائی کو اپنے علاقے کے کسی بڑے ہسپتال میں شفٹ کرنے کے لیے کوششوں کی ابتداء کر دی۔اس کے لیے اُنہیں موجودہ ہسپتال کی انتظامیہ کو بھی آمادہ کرنا تھا جو کہہ رہی تھی کہ لندن سے لنکا شائر تک سفر بھائی کے لیے غیر محفوظ ہے بلکہ موت کا باعث بن سکتا ہے،لیکن حاجی صاحب اس بہانے کی آڑ میں انہیں بھائی کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔دوسری طرف ایک انتہائی سریس اور مہنگے مریض کو لینے کے لیے لنکا شائر میں جو چند ہسپتال سہولیات اور کوالٹی رکھتے تھے،انہیں آمادہ کرنا تھا۔موت اعجاز کے سر پر ناچ رہی تھی،مگر حاجی صاحب اُس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے دیوانہ وار چومکھی لڑائی لڑ رہے تھے۔وہ ناقابلِ یقین ذہنی دباؤ کے باوجود درست فیصلے کر رہے تھے۔

بالآخر وہ لندن ہسپتال کی ناراض بلکہ بقول اُن کے قاتل انتظامیہ سے بھائی کو شفٹ کروا کر بلیک برن کے رائل انفرمری ہسپتال میں لیجانے میں کامیاب ہوگئے۔اِس کے لیے ہسپتال انتظامیہ کو ایک چھوٹا سپیشل جیٹ طیارہ ہائر کرنا پڑا۔جس میں اعجاز کی میڈیکل کنڈیشن کے

مطابق عارضی طور پر ضروری مشینری فِکس کی گئی اور طیارے نے اعجاز بھائی کو محفوظ، لندن سے مانچسٹر ائیر پورٹ پہنچایا۔ وہاں نئے ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے مریض کی کنڈیشن کے مطابق آلات سے لیس ایمبولینس اور عملہ موجود تھا۔ جس نے بھائی کو محفوظ طریقے سے بلیک برن کے ہسپتال میں شفٹ کر دیا۔ میں بھی ٹرین کے ذریعے اُسی دن بلیک برن پہنچ گیا۔ میں اور حاجی صاحب سپیشلسٹ ڈاکٹرز کے ساتھ میٹنگز (Meetings) کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اعجاز بھائی کو قومہ سے باہر آنے اور Recover کرنے میں شاید ایک لمبا عرصہ لگے۔ سو حاجی صاحب ہسپتال کی انتظامیہ کے ساتھ بھائی کے لیے ITU میں پرائیوٹ روم اور بہترین انتظامات کے لیے سرگرم ہو گئے اور حاصل کر کے رہے۔

ان چند دنوں میں میرا قیام اُن کی فیملی کے ساتھ اُن کے گھر میں رہا۔ وہ مطمئن تھے، چونکہ نئے ہسپتال کی انتظامیہ ذہنی طور پر تیار تھی کہ اُسے یہ مریض کچھ مہینے رکھنا ہے اس لیے حاجی صاحب اپنے روزمرہ کے معمولات پر بھی توجہ دے سکتے تھے اور دوپہر دو سے چار یا شام 7 سے 9 بجے کے وزیٹرز آورز Visitor Hours میں وہ بھائی کی دیکھ بھال بھی کر سکتے تھے۔ اس دوران وہ مجھے مختلف بیڈ اینڈ بریک فاسٹ (Bed and Breakfast) ہوٹلز بھی وزٹ کرواتے رہے جن میں سستے مہنگے سب تھے۔ ساتھ ساتھ یہ ڈسکس بھی ہوتی رہی کہ وہ سب کر رہے ہیں، مگر پاکستان سے فیملی میں سے کوئی اگر یہاں رہے تو انہیں سہولت رہے گی۔ جس کے جواب میں مَیں نے بتایا کہ میں موجود تو ہوں جس پر وہ چُپ ہو گئے۔

اِسی شہر میں میرے سگے چچا رہائش پذیر تھے جن کی بیگم میری سگی خالہ بھی ہیں۔ میں اُن سے رابطہ اس لیے نہیں کر رہا تھا، کیونکہ وہ حاجی صاحب کے ساس اور سسر ہیں اور حاجی صاحب کی اُن سے 7/51 ہے۔ میں اس نازک موقع پر حاجی صاحب کی ناراضگی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ سو میں نے اُس طرف رابطہ نہ کیا۔ چند دن بعد حاجی صاحب نے کہا۔

''بھائی! اب اعجاز بلیک برن آ گیا ہے اور مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔اس لیے آپ پاکستان جائیں اور فیملی کو تسلی دیں۔آپ کو پتہ تو چل ہی گیا ہے کہ یہ کوئی چند دن یا چند ہفتے کا کیس نہیں ہے۔میں نے انٹرنیٹ کے ذریعے آپ کی سیٹ بک کروادی ہے۔دو دن بعد آپ کی واپسی فلائٹ ہے''

میں حاجی صاحب کے موجودہ رویے سے کافی مطمئن تھا۔گو پچھلے کئی سال سے مختلف خاندانی امور کی وجہ سے وہ بقیہ 11 بہن بھائیوں بشمول بیمار اعجاز سے دور تھے بلکہ لڑائی کی حالت میں تھے،مگر اب وہ مخلصانہ کوشش کر رہے تھے اِس لیے میں اُن کی نیت پر شک کرنا غلط سمجھتا تھا۔سو میں نے واپسی کے لیے ہاں کر دی،لیکن مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ اس موقع کو فیملی کو ذلیل کرنے کا ذریعہ بنائیں گے۔میرا طیارہ فضا میں تھا اور میں ابھی پاکستان نہیں پہنچا تھا کہ اُن کا ہتک سے بھرپور فون پاکستان پہنچ چکا تھا۔

''فوراً فیملی میں سے کوئی تیاری کر کے انگلینڈ پہنچے اور اعجاز کو سنبھالے۔سُکھی وقت میں تم اُس کی کمائی کھاتے رہے ہو اور اب جبکہ وہ زخمی پڑا ہے تو یہ مصیبت میرے گلے ڈال دی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ

میں پاکستان پہنچا تو تمام کیے کرائے پر پانی پھر چکا تھا اور ساری فیملی مجھ سے ناراض تھی کہ ایسی کونسی جلدی تھی جو آ گئے۔وہاں رہتے تو ہمیں یہ سب تو نہ سننا پڑتا۔نوکری کے لیے بھی تو کئی کئی ماہ گھر سے دور رہے ہو۔میری تمام وضاحتیں اپنی جگہ،مگر اُدھر سے توہین آمیز فون کالز کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ تھا۔ستم ظریفی یہ کہ اعجاز کی کنڈیشن کے متعلق کوئی بات نہ بتائی جاتی۔حاجی صاحب کا یہ قول صادق تھا:

''میرے مخالف جس دن میری طرف سے کال موصول نہ ہو اُس دن خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔''

ایک دن چھوٹا بھائی انجم روتے ہوئے کہنے لگا

’’بھائی! ہمارا قصور کیا ہے؟ یہی کہ مَیں نے ماں کی وفات کے بعد اور باپ کی معذوری میں اعجاز کی اعلیٰ تعلیم کا تمام خرچہ برداشت کیا، اُسے لندن بھیجا، آپ کو تو پتا ہے ابھی ہم نے اُس کی کمائی کا ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ حتیٰ کہ آپ جو لندن گئے ہیں اُس میں ٹکٹ اور خرچہ میں معاونت کی، تو پھر یہ گالیاں کس لیے؟‘‘

’’مقدر، پیارے! صبر کرو کہ یہی صبر کا وقت ہے۔ ہر حال میں شُکر ہم پر واجب ہے۔ دل شکر سے روشن ہوتا ہے تو شِکوہ سے بُجھ جاتا ہے اور ناشُکری سے پتھر ہو جاتا ہے۔ کڑے امتحانوں میں ثابت قدمی ہی راہِ نجات ہوتی ہے۔‘‘

پہلے چند سال چھوڑ کر، جس میں حاجی صاحب نے ابھی پاکستانیت نہیں چھوڑی تھی حاجی صاحب اور چچا کا یہ سٹائل رہا تھا کہ فیملی کے لوگوں کو مالی امداد تو دی جا سکتی، مگر انگلینڈ اُن کے لیے ممنوع ہے۔ اِسی لیے اعجاز کی پہلی دفعہ انگلینڈ آمد پر بھی حاجی صاحب نے اُس کو ائیر پورٹ سے ریسیو کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ تو شاید ہماری منت تھی یا وقتی جذبہ کہ اُنہوں نے اعجاز کے زخمی ہونے پر "Look After" کی حامی بھر لی تھی، مگر اب پرانا رنج عود آیا تھا۔ مجبوراً ہمیں اعجاز کی خیر خبر کے لیے چچا سے رابطہ کرنا پڑا جس نے انسانیت کے ناطے یا حاجی صاحب کی مخالف سیاست کی وجہ سے حامی بھر لی۔ میں نے ساتھ ساتھ انجم کے لیے ویزہ اپلائی کر دیا جو کہ اگلے دو ماہ میں لگ گیا۔ اب انجم کو جانا تھا، مگر وہ انگلینڈ پہلی بار جا رہا تھا۔ سو فیملی کے اِصرار پر میں بھی ساتھ ہی گیا۔ اس دفعہ ہمارا استقبال حاجی صاحب کے مخالف کیمپ یعنی چچا نے کیا۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں نے حاجی صاحب سے کہا کہ اگر وہ اعجاز کی دیکھ بھال سے فارغ ہونا چاہتے ہیں تو اتھارٹی مجھے لکھ کر دے دیں۔ اِس کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ ہسپتال

انتظامیہ میں اور تمام قانونی معاملات میں اعجاز کے وارث ڈکلیئر تھے۔ اُن کا اصرار تھا کہ وہ تمام کاغذی معاملات دیکھیں گے، مگر اعجاز کے سر پر کوئی فیملی کا آدمی ضرور موجود ہو۔ یہ انتہائی فضول بات تھی، کیونکہ سوائے وزیٹر آور کے کسی آدمی کو وہاں رہنے کی اجازت نہ تھی۔ تمام دیکھ بھال ہسپتال کے ذمہ تھی۔ اُن کا دوسرا اصرار تھا کہ فیملی میں سے جو آئے وہ کوئی علیحدہ مکان لے کر رہے۔ اُنہوں نے صاف کہا کہ اُنہوں نے اس لیے مجھے واپس بھیجا تھا کہ وہ مجھے ساتھ رکھنے کو تیار نہ تھے۔ اُنہیں ہمارا چچا کے ساتھ رہنا بھی گوارہ نہ تھا۔ یہ صریحاً بلیک میلنگ تھی۔ انجم چند دن رہ کر واپس چلا گیا۔ حاجی صاحب بھی تھوڑے دن رہ کر پاکستان چلے گئے۔ میں نے چچا سے علیحدہ رہائش رکھنے کی کوشش کی، مگر انہوں نے منع کر دیا۔

ہم نے حاجی صاحب سے مدد کی درخواست اس لیے کی تھی کہ وہ برٹش نیشنل ہیں۔ مضبوط اعصاب رکھتے ہیں اور ذہن کے انتہائی تیز ہیں۔ اُنہوں نے یہ سب استعمال کیا تھا، مگر اس مصیبت میں ہمارے لیے بھی دوسرا خُدائی عذاب بنے رہے تھے۔ کئی ماہ بیت گئے۔ میں روز ہسپتال جاتا۔ عملہ کی اجازت سے اعجاز کے منہ، ہاتھ اور پاؤں کی اجازت شدہ لوشن سے مالش کرتا۔ اُس کے ساتھ یک طرفہ باتیں کرتا (ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق وہ سب سن اور دیکھ رہا تھا)۔ کبھی کبھی اُس کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو نکلتے، مگر نرسز کے مطابق یہ Response کے طور پر نہیں ہوتے تھے بس ایسے ہی آنکھوں میں پانی آ جاتا تھا۔ اِس دوران میں نے پلاننگ (Planning) کر لی تھی کہ حاجی صاحب کی واپسی پر پاکستان جاؤں گا اور سارے بچوں اور بیوی کا ویزہ اپلائی کروں گا۔ سب کو لے کر انگلینڈ آ جاؤں گا۔ بڑے دونوں بیٹے جوان ہیں، وہ کام کریں گے۔ چھوٹے دو بچے، بیگم اور مَیں بھائی کی دیکھ بھال کریں گے۔ یوں حاجی صاحب کی بلیک میلنگ سے اور گالیوں سے بچ جائیں گے۔ بغیر کام کیے انگلینڈ میں مہینوں کے حساب سے رہنا ہم میں سے کوئی بھی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

بالآخر حاجی صاحب واپس انگلینڈ پہنچ گئے۔ چند دن اچھے گزرے۔ ایک دن ہم اُن کی گاڑی میں ہسپتال جا رہے تھے کہ میں نے کہا۔

''حاجی صاحب! آپ اب آسانی سے وزٹنگ آور(Visiting Hours) میں بھائی کی کیفیت دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے واپسی کا پروگرام بنایا ہے اور............''

میں بتانا چاہتا تھا کہ میں واپس جا کر بیوی، بچوں کا ویزہ اپلائی کرنا چاہتا ہوں اور پھر فیملی سمیت واپس آ کر بھائی کی ریکوری تک یہیں رہوں گا کہ حاجی صاحب نے میری ادھوری بات سن کر ہی بڑی بُری طرح گاڑی کا سٹیرنگ گھما دیا۔ گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی اور الیکٹرک پول سے ٹکراتے بچی۔ پھر وہ بولے۔

''خدا کے لیے اس بہن............کو پاکستان لے جاؤ اپنے ساتھ ہی۔ میرے ذمے یہ مصیبت کیوں ڈالی ہوئی ہے۔ کمائیاں تم کھاتے رہے اور اب یہ ماں......بسترِ مرگ پر پڑا ہے تو میرے حوالے کر دیا ہے۔''

اس کے بعد مجھے پتا چلا کہ میں آج تک جن الفاظ کو بے عزتی کی انتہا سمجھتا رہا ہوں وہ تو انتہائی بچگانہ سے تھے۔ حاجی صاحب کے الفاظ توہین کے ضمرے میں میری ڈکشنری میں ایک گراں قدر اضافہ تھے ولندیزی کہاوت ہے۔ ''جب انسان دوست کھو دے تو کچھ نہیں کھوتا۔ حوصلہ کھو دے تو بہت کچھ کھوتا ہے، آبرو کھو دے تو تقریباً سب کچھ کھو دیتا ہے۔ روح مر جائے تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔'' میں آبرو کھو دینے کے مرحلے تک پہنچ چکا تھا۔ اب مجھے خود کو اس روح کے مر جانے والے مرحلے سے بچانے کی جدوجُہد کرنا تھی۔ کسی جگہ پڑھا تھا کہ ''بہت سے لوگ خسارے کا سودا خوب سوچ سمجھ کر اور ٹھوک بجا کر کرتے ہیں'' میں بھی شاید انہی میں سے تھا۔

سو اِس بیش قیمت تجربہ نے میرا یہ عزم اور پختہ کر دیا کہ گھر میں بڑا ہونے کی حیثیت سے یہ گراں بار، تن من دھن، اپنا اور اولاد کا مستقبل داؤ پر لگا کر بھی، مجھے اُٹھانا ہے۔ میں اپنے

سمیت سب بہن بھائیوں کے لیے حاجی صاحب کے شاندار الفاظ کے اس طوفانِ بلاخیز میں واپس آ گیا تا کہ اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے جدوجہد کی ابتدا کر سکوں۔

یہاں میں نے مُدتوں کی بچتوں سے جن دو تین بزنسوں میں حصہ ڈال رکھا تھا، پتا چلا کہ میرے ان اچانک دوروں سے وہ سب بزنس بیٹھ گئے ہیں۔ کچھ کا پیسہ باہر مارکیٹ میں ڈیڈ ہو گیا ہے، کچھ پیسہ ہمارے ایجنٹ لے کر بھاگ گئے ہیں اور باقی مال (سامان) کی صورت میں ڈیڈ پڑا ہے اور اب میں کنگلا ہوں۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ فیملی ممبران کو تسلی دی اور بیوی بچوں کا ویزہ اپلائی کر دیا۔ ایمبیسی نے میری بیوی کے ساتھ مجھے بھی انٹرویو کے لیے بُلا لیا۔ وہاں جب گورے ویزہ آفیسر نے مجھ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا تو میں بھڑک گیا۔ ہماری تُو تُو مَیں مَیں کی آوازیں اتنی اونچی تھیں کہ انگریزی نہ سمجھنے کے باوجود میری بیگم نے گھبرا کر مجھے کھینچا۔ میرے جاتے جاتے ویزہ آفیسر نے دھمکی دی کہ وہ میرا بھی ویزہ کینسل کر سکتا ہے تو میں پھر پلٹ پڑا۔ المختصر یہ کہ اُس نے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے میرے بیوی بچوں کا ویزہ ریفیوز (Refuse) کر دیا، لیکن میرے ویزے کو نہ چھیڑا۔ کارل مارکس نے کہا تھا ''جُستجو سے منزل حاصل کرو نا کہ آرزو سے'' سو میری جدجہد جاری رہی میں نے اُن کے لیے اپیل انگلینڈ میں کورٹ میں بھیج دی۔ ساتھ ساتھ چھوٹے بھائی، چھوٹی بہن اور ایک بہنوئی کے لیے یکے بعد دیگرے ویزے اپلائی کر دیے۔ اس سے پہلے صرف سنا تھا کہ ''مصیبت جب آتی ہے تو چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر آتی ہے اور فرار کی تمام راہیں مسدود کر دیتی ہے''۔ سو سب کے ویزے ریفیوز ہوتے گئے اور میں انگلینڈ کے کورٹ میں اپیل کرتا گیا۔

کہیں پڑھا تھا ''بہادر آدمی اکثر تنہا ہوتے ہیں، مگر دشمن انہیں کبھی حقیر نہیں پاتے'' یہاں میرا اپنا وقت کے ساتھ تھا جس نے اپنا چرخہ الٹا چلا دیا تھا اور میں اس جدوجہد میں تنہا تھا۔ مردم شماری میں میرے 11 بہن بھائی ہیں، مگر مردم شناسی میں ہم بہت مختصر ہیں، اُنہیں کوئی

احساس نہیں تھا کہ میں اس جدوجہد میں مالی، ذہنی اور اخلاقی طور پر کیا **Suffer** کر رہا ہوں۔ وہ صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ میں جسمانی طور پر کہاں ہوں۔ یہ مدنظر نہیں تھا کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ ہم میں دیوانے زیادہ اور فرزانے کم کم ہیں۔ ہمارے پاس اتحاد کی صورت میں نسخہ کیمیا تو موجود ہے، لیکن منتشر اجزاء اکٹھے ہوں تب ناں۔ سو وقت کے مقابل اس لڑائی میں میری پشت اور جیب دونوں خالی تھیں اور میں ہر طرف سے نقصان میں تھا، لیکن میں کم ہمت تھا نہ غافل، کیونکہ غفلت نہ تو تاریخ معاف کرتی ہے اور نہ شریعت۔ بعد کے پچھتاوے ساری عمر کی نیندیں چھین لیتے ہیں۔ سو جو کچھ وقت پر کر لیا جائے وہی تسکینِ دل کا باعث ہوتا ہے کہ "مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا"۔

ادھر حاجی صاحب کی طرف سے بمباری میں انتہائی شدت آ گئی۔ ستم ظریفی یہ کہ ہمیں اعجاز کی کیفیت سے بے خبر رکھا جانے لگا۔ ہسپتال کے عملے کو کسی بہانے سے منع کر دیا گیا کہ معلومات لیک نہ کی جائیں۔

ظاہر ہے میری اس جدوجہد میں مہینے بیتنے لگے۔ صرف چچا اور اُن کی فیملی تھی جو حاجی صاحب کی آنکھ بچا کر اعجاز کو دیکھنے جاتی اور ہمیں آنکھوں دیکھا حال بتاتی، لیکن اُس کی میڈیکل کنڈیشن **(Medical Condition)** یا پراگرس **(Progress)** کے متعلق انہیں کوئی نہ بتاتا، کیونکہ مریض کے سرپرست نے منع کیا ہوا تھا۔ اس دوران حاجی صاحب پاکستان کا چکر لگا کر اور ہمیں انتہائی رذیل ترین القابات سے نواز کر واپس جا چکے تھے۔ اُن سے اتنا ضرور پتا چلا کہ کئی ماہ بعد نئے ہسپتال کی انتظامیہ بھی مایوس ہو چکی ہے اور اب ہسپتال والے خود کورٹ میں جا کر یہ مطالبہ کرنے والے ہیں کہ انہیں مریض کی لائف سیونگ مشینیں **(Life Saving Machines)** اُتار کر اُسے موت کے حوالے کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ بھی پتا چلا کہ یہ کوئی پہلا کیس نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی عدالتیں سپیشلسٹ ڈاکٹرز کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس

طرح کے قانونی قتل کی اجازت دے چکی ہیں۔حاجی صاحب لندن والے ہسپتال کی انتظامیہ کے خلاف کیس فائل کر چکے ہیں اور رائے عامہ کے دباؤ کے لیے یہ کیس اخبارات میں بھی لے آئے ہیں۔اِسی وجہ سے بھائی کے سال بھر سے قومہ میں ہونے کے باوجود ڈاکٹرز اور نئے ہسپتال کی انتظامیہ کوئی بڑا فیصلہ نہیں کر پا رہے اور اب کورٹ میں جانے کی پلاننگ کر رہے ہیں۔حاجی صاحب بے شک ہم سے اپنی رنجش نکال رہے تھے، مگر اعجاز کے لیے کوششوں میں اب بھی "Perfect" تھے۔

بالآخر اعجاز نے آنکھیں کھول دیں۔وہ کسی کو پہچان نہیں رہا تھا، مگر ایک اُمید بندھ گئی تھی۔مکمل معائنے کے بعد ڈاکٹروں کی اب بھی یہی رائے تھی کہ ایک لمبا عرصہ مزید چاہیے اور پھر بھی معذور زندگی ہوگی۔معذوری بھی پتا نہیں کِس لیول کی ہوگی۔مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ہم نے اِس قانونی قتل سے جان بچانے کے لیے، اُسے پاکستان لانے کے انتظامات کرنا شروع کر دیے۔حاجی صاحب نے اُسے یہاں لانے کے لیے مختلف کمپنیوں سے چارٹر جہاز کی معلومات لیں، یو کے ہسپتال والوں سے پاکستان تک اُسے محفوظ پہنچانے کے لیے عملہ اور مشینوں کی بات کی۔ساتھ ساتھ ہماری تذلیل جاری تھی، جہاز کا کرایہ تقریباً بیس لاکھ تھا اور حاجی صاحب کے پیغام کے بقول ہمیں اپنا مکان، کار، بچے، جو بھی فروخت کرنا پڑے، یہ بھرنا تھا۔معلومات کے مطابق عبداللہ ہسپتال اوکاڑا نے 10 ہزار روپے روزانہ پر مریض کو کمرہ اور آکسیجن مہیا کرنے کا عندیہ دیا۔ادویات وغیرہ کا خرچہ الگ تھا۔یہ سب کچھ ابھی "Premature" تھا کہ ایک دن حاجی صاحب کی بیگم جو کہ پاکستان آئی ہوئی تھیں ہمارے گھر تشریف لائیں۔اعجاز کو قومہ میں گئے 15 مہینے ہو گئے تھے۔انہوں نے صرف چند لفظ کہے

''اللہ دا حکم''

گھر میں چیخ و پکار جاری تھی کہ اتفاق دیکھئے اُسی دن برٹش ایمبیسی کی طرف سے لیٹر

موصول ہوا۔جس میں انہوں نے مجھے اور میری بیوی کو لکھا تھا کہ اس لیٹر کے ہمراہ جو فارم ہے اس پر دستخط کر کے آپ اپیل ودڈرا(With Draw) کرلیں اور ہمیں اپنی تمام فیملی کے پاسپورٹ بھیج دیں ہم ویزہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ایسا ہی لیٹر میری بہن کے لیے بھی آیا اور چھوٹے بھائی کی اپیل بھی ایمبیسی ہار گئی،لیکن اُس وقت تک ہمارا بھائی اعجاز، حاجی صاحب کی تمام کوششوں کے باوجود زندگی ہار گیا تھا اور ہماری تذلیل کا ایک لمبا کورس ابھی جاری تھا جس کا اختتام ابھی تک نہیں ہوا، جاری وساری ہے۔

حاجی صاحب کو یقین تھا کہ کوئی چارہ نہ دیکھتے ہوئے ،ڈاکٹرز اور انتظامیہ نے کوئی خفیہ فیصلہ کیا تھا۔رات تک اعجاز بالکل ٹھیک تھا،مگر الصبح حاجی صاحب کو اطلاع دی گئی کہ اُس کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔اُن کے مطابق ضرور اس میں کوئی حرامزدگی ہے۔اُنہوں نے کیس وغیرہ کیے رکھا،مگر چونکہ اُن سے رابطے جو پہلے ہی کم تھے وہ اور کم ہوگئے تھے اس لیے اُس کیس کے انجام کا پتا نہ چل سکا۔

قارئین خود فیصلہ کریں کہ اُس روشن معاشرہ کے منہ پر یہ کالے دھبے کیا ہیں۔ جب بھائی اعجاز لندن میں تھا تو اُسی ہسپتال کے ایک سکھ ڈاکٹر نے بڑی رازداری کے ساتھ حاجی صاحب سے ملاقات کی اور کہا۔

''تُسی چنگا کیتا اے اپنے بھرا دی زندگی لئی بھڑ گئے او''

''یعنی آپ نے اچھا کیا جو اپنے بھائی کی زندگی کے لیے کھڑے رہے''

اُس نے جو تفصیل بتائی اُس کے مطابق اُس کے باپ کے ساتھ ایسے ہی ہوا تھا اور وہ قومے میں چلا گیا تھا۔اِسی طرح ڈاکٹروں کی رائے کے بعد اُس نے اُس کی مشینری آف کرنے کی اجازت دے دی تھی اور اُس کا باپ اُس کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا۔جس کا پچھتاوا اُسے بعض مرتبہ سونے نہیں دیتا تھا۔

یہ کیا ہے............؟ آپ بھی سوچیں، ہم تو اب تک سوچ میں ہیں۔

☞ ☞ ☞

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

یاد کا آزار لے کر گھومنا
اِک دلِ بیزار لے کر گھومنا
ظرف ہے اپنا ہی تیرے شہر میں
درد کا انبار لے کر گھومنا

جوں جوں لندن قریب آ رہا تھا میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ میں نے بڑے حوصلے سے اِس سِتم ظریف شہر کے لیے کمر ہمت باندھی تھی، لیکن شاید اپنے پہلے سے شل ہوئے اعصاب پر شدید ستم ڈھایا تھا۔ میں نے بیزاری کی حالت میں بچوں سے ان کی تاریخ پیدائش اور دوسرے کوائف پوچھ کر Embarkment Card پُر کیے، حالانکہ یہ چھوٹا سا کام ہمیشہ بہت احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے جسے پاسپورٹ سامنے رکھ کر ہی کرنا چاہیے۔

تقریباً 15 سالہ سارہ اور 10 سالہ اسد کی آنکھیں ہی نہیں چہرے بھی چمک رہے تھے اور وہ اپنی آنٹی طاہرہ (میری سب سے چھوٹی بہن) اور ماں کے ساتھ پٹر پٹر باتیں کیے جا رہے تھے۔ لاہور ائیر پورٹ پر پیش آنے والے واقعات، ابوظہبی ائیر پورٹ پر کئی گھنٹے کے سٹاپ میں وہاں کی بھرپور سیر، جہاز کی فضا، اس میں پیش کیے گئے کھانے اور بہت سے دوسرے موضوعات تھے۔ وہ خاص طور پر میری بیگم کو چھیڑ رہے تھے جسے ہمیشہ بند جگہوں پر شدید گھٹن محسوس ہوتی ہے۔

اسی لیے وہ کسی بلڈنگ کی لفٹ استعمال کرنے سے بھی گھبراتی تھی۔ اِسی طرح اُسے جہاز میں سفر کرنے سے خوف محسوس ہوتا تھا کہ ''وہ مویا بند ڈبہ سا ہی تو ہوتا ہے جس میں ہوا کے لیے کوئی کھڑکی بھی کھلی نہیں ہوتی''۔

اُس کے اِسی خوف نے اُس کا اور بچوں کا چھ ماہ کا برطانیہ کا ویزہ داؤ پر لگا دیا تھا جو میں نے بڑی محنت کر کے اور کافی خرچہ بھر کے لگوایا تھا۔ اعجاز بھائی کی وفات نے مجھے بہت بری طرح توڑا تھا، مگر ذمہ داریوں کا بوجھ مجھے کبھی کبھی سوچنے پر مجبور کرتا تو میں بیگم اور بچوں کو اُن کے بہتر مستقبل کے لیے انگلینڈ گھوم آنے کے لیے کہتا، مگر میرا خود جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ بیگم کچھ تو اپنے خوف کی وجہ سے اور کچھ میری ہمراہی نہ ہونے کی وجہ سے آمادہ نہ تھی۔ کئی دفعہ میں تلخ ہو جاتا تو وہ بے بسی سے رو دیتی اور میں اپنی کنپٹیوں کو دباتا چپ ہو رہتا۔

بالآخر جب ویزوں کی مُدت میں دو ماہ رہ گئے تو میں نے بیگم کے رونے کے باوجود اُسے اس بات پر قائل کر لیا کہ کم از کم وہ بڑے دونوں بیٹوں احمد اور احد کو سفر کی اجازت دے دے۔ ''دونوں ماشاءاللہ 20 سال سے اوپر کے ہیں اور اُن کے مستقبل کے لیے اُن کا ٹریول کرنا ضروری ہے۔ تبھی دوبارہ ویزے مل سکیں گے ورنہ جوان آدمی کو ویزہ کہاں ملتا ہے''۔

بیگم کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ انہوں نے وہاں کھانا کھانے میں لاپرواہی برتنا ہے۔ یہاں بھی وہ اس معاملہ میں لاپرواہ ہیں اور وہ انہیں کہہ کہہ کر بمشکل کھلاتی پلاتی ہے اور وہ سو سو نخرے کر کے مرضی کی چیزیں کھاتے ہیں۔ یہی حال اُن کے پہناوے کا ہے۔ اس کے علاوہ وہ گھر سے دور بھی کبھی نہیں رہے اور پھر وہاں تو سب کچھ اجنبی ہو گا۔ اجنبی لوگ، اجنبی ماحول، اجنبی بولی، اجنبی کھانے، انہیں پکا کر کون دے گا۔ یہ سب کہتے ہوئے وہ سُبکنے لگتی۔ یہ اُس کی مامتا تھی جو اُسے رلا دیتی تھی۔

اُس کی ساری باتیں اور ممتا بجا، مگر میرا موقف اور تھا۔ پدرانہ شفقت اپنی جگہ، مگر مجھے اُن کو تیرنا سکھانے کے لیے زمانے کے سمندر میں دھکیلنا تو تھا ناں۔ وہ ایک مزدور کے بیٹے تھے اور یہ وصف اُن کی جینز (Genetic) میں موجود تھا۔ پرندوں کے بچوں کو پر کھولنے کے لیے بس ہوا میں چھوڑنا ہوتا ہے۔ باقی وہ خود بخود سیکھ جاتے ہیں۔ وہ میرے بیٹے تھے جس نے کارزارِ حیات میں صرف اور صرف اپنی سرکشی اور آتش مزاجی سے راستہ بنایا تھا۔ جس کے لیے صرف اندر کی روشنی مشعل راہ تھی ورنہ کوئی راہنما یا نگران میسر نہ تھا، جبکہ میرے بچوں کے لیے تو میرا 20 سالہ تجربہ، اس دوران کمائے ہوئے دوستوں کی امداد اور بہت سے دوسرے وسائل میسر تھے۔

ماں نے دونوں بیٹوں کو یوں وداع کیا تھا جیسے بیٹیوں کو بیاہ کر بھیجا جاتا ہے۔ بچوں کو ہدایت تھی کہ انہوں نے ہر روز لازمی فون کرنا ہے۔ وہ روز فون کرتے تو ماں کے سوالات اُن کی صحت اور کھانے پینے کے متعلق ہی ہوتے۔ بچے اُسے بہت مطمئن کرنے کی کوشش کرتے، مگر وہ یقین نہ کرتی اور سسکتی رہتی۔ ایک دن اچانک کہنے لگی۔

''ہن اسی کدوں لندن جانا اے؟'' یعنی ''اب ہم نے لندن کب جانا ہے؟''

''بھئی وہاں تو بہت پرابلم ہیں۔ کچن اور باتھ روم بہت چھوٹے ہوتے ہیں، کمرے بالکل بند ہوتے ہیں، وہاں گھروں میں صحن بھی نہیں ہوتے''۔ میں نے اُس کے اعتراضات اُسی کو لوٹا دیے۔ یہ تکرار کئی ہفتے چلی، لیکن بالاخر مجھے بادلِ نخواستہ خود بھی تیار ہونا پڑا، کیونکہ بیگم اور چھوٹے بچوں کے ویزے صرف دو ہفتے کے رہ گئے تھے۔

راستے میں ابوظہبی میں چند گھنٹے کا قیام تھا جسے بیگم، بچوں اور سسٹر نے خوب گھوم پھر کر انجوائے کیا۔ میں خاموشی سے ایئرپورٹ کے ڈرنک شاپ میں جا بیٹھا جہاں بیلجئم کے امتیاز اور کویت کے زاہد بھٹی صاحب سے بیئر کے ساتھ دوستی ہوئی جو آج تک قائم ہے۔

ہیتھرو ائیرپورٹ پر لینڈ کے بعد تقریباً ایک کلومیٹر مختلف کاریڈورز میں چل کر امیگریشن ہال میں پہنچے۔ یہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ بھی بچوں نے انجوائے کرتے ہوئے طے کیا۔ متحرک بیلٹ (Moving Belts) اُن کے لیے دلچسپی کا باعث تھے۔ یہ بیلٹس کاریڈور کے بالکل درمیان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے ہوئے تھے۔ مسافر چلتے چلتے تھک جاتے تو اپنے ہینڈ بیگ سمیت اس بیلٹ پر کھڑے ہوجاتے جو انہیں اُٹھائے آگے کو چلتا رہتا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد بیلٹ ختم ہوجاتا تو مسافر پھر پیدل چلنے لگتے۔ اِسی طرح کے کئی بیلٹ اس راستے پر ایستادہ تھے۔ زیادہ بھاری بھرکم اور معذور لوگوں کے لیے رکشہ نما خوبصورت گاڑیاں بھی مدد کر رہی تھیں۔ یوں میرے بیوی بچوں سمیت بہت سے لوگ کبھی متحرک بیلٹ پر اور کبھی پیدل چل کر مختلف راہداریوں میں گھومتے ہوئے امیگریشن ہال میں پہنچتے جا رہے تھے۔ یہاں پائپوں کی مدد سے گھومتی ہوئی لائنیں بنائی گئی تھیں۔ لوگوں کی لمبی لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ سو ہم بھی ایک لائن میں لگ گئے۔ لائنوں کے سامنے بہت سے امیگریشن کاؤنٹر بنے ہوئے تھے جہاں بیٹھے ہوئے آفیسر باری آنے پر مسافروں کے کاغذات کی چیکنگ کے بعد اُن سے چند سوالات کرتے اور مطمئن ہونے کے بعد انٹری ٹھپا اُن کے پاسپورٹ پر لگا کر اپنی ٹیبل کے ساتھ لگی رکاوٹ ہٹا دیتے اور وہ مسافر اُن کے پیچھے راہداری سے ہوتا ہوا نیچے سامان وصول کرنے والے ہال میں چلا جاتا جہاں مختلف ائیر لائینوں سے اَن لوڈ (Unload) ہونے والا سامان مختلف کنوئیر بیلٹ پر گھوم رہا ہوتا۔ وہ اردگرد بکھری ہوئی یا پھر ایک طرف سلیقے سے لائن میں لگی ہوئی ہینڈ ٹرالیوں میں سے ایک لے کر اپنی ائیر لائن کے سامان والی کنوئیر بیلٹ کے نزدیک رُک کر انتظار کرتا۔ اُس گھومتی ہوئی بیلٹ پر جونہی اُس کا سامان آتا، وہ لپک کر اُسے اُٹھاتا اور گرین چینل یا ریڈ چینل سے ہوتا ہوا باہری سمت کا رُخ کرتا۔ جہاں اُس کے اپنے اُس کا انتظار کر رہے ہوتے۔ باری آنے پر ہم بھی جب گورے امیگریشن آفیسر کے سامنے پیش ہوئے تو اُس نے مجھ سے پوچھا:

"How you relates to each other" "تمہارے آپس میں کیا رشتے ہیں"۔

میں نے اُسے اپنے آپس کے رشتوں سے آگاہ کیا۔

اِسی طرح کے چند ایک مزید سوال و جواب کے بعد اُس نے غور سے ہمارے پاسپورٹ اور Embarkment Card دیکھنے شروع کیے اور بالاخر بولا:

"What are your date of births"۔ "تم لوگوں کی تاریخ پیدائش کیا کیا ہے"۔

میرے دماغ میں جھما کا سا ہوا۔ خدا تعالیٰ نے مجھے یہ صلاحیت ودیعت کر رکھی ہے کہ مشکل مواقع پر بہت زیادہ ڈپریشن کے باوجود میرا دماغ انتہائی تیزی سے مشاہدہ کرنا شروع کر دیتا ہے اور فگرز اینڈ فیکٹس کو کولیکٹ کر کے مجھے گائیڈ کرنے لگتا ہے۔ میں نے کہا۔

I think there is a mistake by me in my daughter's card

"میرا خیال ہے میں نے اپنی بیٹی کے کارڈ میں غلطی کر ڈالی ہے"۔

I think, it is not a mistake, it seems any other matter

"میرا خیال ہے یہ غلطی نہیں ہے بلکہ کوئی اور معاملہ ہے"۔

یہ کہہ کر وہ ہمارے پاسپورٹ لے کر اندر چلا گیا۔

دراصل میرے بیرونی دوروں کی وجہ سے سارہ کی سکولنگ کے وقت چھوٹے بھائی نے اسے داخل کروایا تھا اور اس کی پیدائش کا سال غلط لکھوا دیا تھا، جبکہ پاسپورٹ پر اصلی تاریخ پیدائش درج تھی، چونکہ میں نے کارڈ سارہ سے پوچھ کر پُر کیا تھا اس لیے اُس نے حسبِ عادت سکول والی

تاریخ پیدائش لکھوادی تھی، لیکن میں اب سنبھل چکا تھا اور اُس کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ بلکہ اس دوران سارہ کو اور باقی فیملی کو بھی بریف کر چکا تھا۔

واپس آ کر گورے نے سوال و جواب کا نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ مثلاً تمہارے اس Visit کا مقصد کیا ہے؟، کتنی دیر ٹھہرو گے؟، کس کے پاس ٹھہرو گے؟، ویزہ لگوانے کے بعد اتنی دیر سے ٹریول کیوں کیا ہے؟، ویزہ لگواتے وقت کیا ڈکلیئر کیا تھا کہ کب ٹریول کرنا ہے؟ تم کرتے کیا ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ بالاخر کچھ مطمئن ہوا تو بولا:

''تمہیں اپنے بچوں کی تاریخ پیدائش بھی یاد نہیں ہے؟''

''کمپیوٹر اور موبائل کے اس دور میں ان باتوں کو یاد رکھنے کی نہیں فیڈ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ذہن دوسری اہم باتوں کے لیے خالی اور حاضر رہے''۔ میں نے لائٹ لہجے میں کہا تاکہ ماحول کچھ ریلیکس(Relax) ہو۔

''مثلاً کن ضروری اور اہم باتوں کے لیے؟'' وہ طنزیہ بولا۔

''مثلاً تمہارے جیسے امیگریشن آفیسر کے اہم سوالوں کے جواب کے لیے''۔ میں نے مزاحیہ انداز میں کہا تو اُس کے چہرے پر نرماہٹ آ گئی اور آئندہ مجھے محتاط رہنے کا کہہ کر انٹری دے دی۔

باہر ریسیپشن پر میرا بیٹا احمد اور میرا دوست ممتاز موجود تھے۔ سب انہیں دیکھ کر کِھل گئے۔ ممتاز اپنی بڑی پجارو لے کر آیا تھا۔ اُس میں ہم ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو لندن کی فضاؤں نے سب کو مسحور کر دیا، مگر میرے اندر اُداسی کی تہہ اور دبیز کر دی۔ بچے احمد کو سفر کی رپورٹ دے رہے تھے۔ ممتاز نے میری خاموشی کو محسوس کر لیا اور مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایئرپورٹ سے وہ سیدھا ہمیں ساؤتھ ہال(South Hall) کے علاقہ کے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ جہاں اُس نے ہمیں ایک پرتکلف ڈنر دیا۔ یہ وہی ساؤتھ ہال تھا جہاں کبھی میں نے

اور اشفاق نے دو امریکن مذہبی ورکرز (Religious Workers) صوفی اینڈ لو کے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ اس علاقہ میں پاکستانی اور انڈین کھانوں کے ریستوران وافر تعداد میں ہیں۔ مین مارکیٹ میں زیادہ تر دکانیں بھی انہی دو ملکوں کے لوگوں کی ہیں۔ سڑکوں پر بھی مسلمان، سکھ اور ہندو بہت بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ یہاں آ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم پاکستان یا انڈیا کے کسی صاف ستھرے علاقے میں گھوم رہے ہوں۔

یہاں آپ کو اپنے کلچر کی تقریباً ہر آئٹم دستیاب ہو سکتی ہے۔ پاکستانی مٹھائیاں، تازہ جلیبیاں، گرم گرم پکوڑے اور سموسے حتیٰ کہ آپ چاہیں تو یہاں بیڑی اور پان بھی دستیاب ہیں۔ بچے یہ سب دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ کیا واقعتاً ہم لندن میں ہیں؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں دیکھ رہا تھا کہ آتے ہی اِس ملک سے اُن کی اجنبیت بھی دور ہوتی جا رہی تھی۔

ڈنر کے بعد ممتاز ہمیں سنٹرل لندن کے علاقے میں اپنے جنرل سٹور پر لے گیا جہاں میرا دوسرا بیٹا احد کام پر تھا۔ سبھی ایک دوسرے کو مل کر خوش ہوئے۔ سٹور کا کلوزنگ ٹائم تھا۔ اس لیے ممتاز ہمیں سٹور سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ایک فلیٹ پر لے گیا جس کی دوسری منزل پر دو کمروں کا پورشن اُس نے ہمارے لیے ہائر کیا تھا۔ یہ مکان سنٹرل لندن میں واقع تھا اس لیے یہاں کرائے بھی بہت زیادہ تھے۔ اس مکان کا کرایہ بھی ایک ماہ کے لیے 830 پونڈ ادا کیا گیا تھا جو کہ پاکستانی تقریباً سوا لاکھ روپے بنتا تھا۔

ممتاز نے چابیاں ہمارے حوالے کیں اور بتایا کہ اُس نے کچن میں ناشتے کے لیے سب سامان رکھ دیا ہے۔ باقی کل دیکھا جائے گا۔ پھر اُس نے اجازت لی اور چلا گیا۔ بعد میں ہم نے جائزہ لیا تو دیکھا کہ اُس نے کچن میں تقریباً ہر ضرورت کا برتن مہیا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ بریڈ، انڈے، جام، ڈرنکس، گھی، مصالحے وغیرہ سب موجود تھا۔ بیڈ پر بیڈ شیٹس (Bed Sheets)، سرہانے (Pillows) اور کمبل (Blankets) موجود تھے اور سب چیزیں نئی اور اپنی پیکنگ

(Packing) میں تھیں۔ شگفتہ (میری بیوی) کافی متاثر تھی کہ اُس نے اتنا خرچ کر ڈالا۔ رات کو احد بھی آ گیا اور رات گئے تک گپ شپ رہی۔

رات کو بستر پر کمر ٹکائی تو اندرونی اور بیرونی تھکن سے بدن چُور تھا۔ میں نے بکھرے اعصاب کو سمیٹنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور سیلف سُجیشن (Self Suggestion) کا عمل شروع کر دیا۔ میرے تنے ہوئے اعصاب تھوڑے ڈھیلے ہونا شروع ہوئے تھے کہ میری بیگم نے میرا یہ ارتکاز توڑ دیا۔ وہ مجھے خاموشی سے کمرے سے اُٹھ کر آتے اور اب بت کی طرح ساکت سیدھے لیٹے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی اور مجھے ہلا کر پوچھ رہی تھی:

''کیا ہوا؟ طبیعت زیادہ تو خراب نہیں ہو گئی؟ کہیں تو دبا دوں آپ کو؟ آپ کی دوائی لا دوں آپ کو؟''

میں نے بڑی مشکل سے اُسے مطمئن کر کے دوسرے کمرے میں بچوں کے پاس بھیجا اور خود کو دوبارہ سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن اس جھٹکے نے مجھے اور منتشر کر دیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو لگا کہ میرا بیڈ (Bed) ہوا میں بلند ہو رہا ہے اور چھت سے ٹکرایا ہی چاہتا ہے۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ دوبارہ کوشش کرنے پر یوں لگا کہ میں زمین میں دھنس رہا ہوں اور نیچے ہی نیچے ڈوبتا جا رہا ہوں۔ میں طویل سانس لے کر اُٹھ بیٹھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر بچوں کو سونے کی تلقین کی اور بیگم کو لے کر آ گیا۔ اُس سے دوا لے کر کھائی۔ وہ مجھے دباتی رہی اور میں بے سُدھ ہو گیا۔

اگلے دن احد ناشتے کے بعد چلا گیا کہ اُس نے جا کر ممتاز کا سٹور کھولنا تھا۔ احمد بھی اُسکے ساتھ ہی چلا گیا۔ میں بقیہ پارٹی کو لے کر باہر نکلا تا کہ انہیں گھر کے اردگرد سے روشناس کرواؤں اور کچھ دوپہر کو کھانے پکانے کے لیے خریداری کروں۔ ابھی سبزی وغیرہ ہی خریدی تھی کہ میرے موبائل پر ممتاز کا فون آ گیا۔ اس سم (Sim) کا انتظام مَیں نے کل آتے ہی کر لیا تھا۔ جب ممتاز نے پوچھا

کہ اُٹھ گئے یا نہیں تو میں نے بتایا کہ ہم تو مارکیٹ میں خریداری کر رہے ہیں۔ جس پر وہ ناراض ہو گیا اور بولا کہ یہ جو ہم صبح سے خجل ہو رہے ہیں، یہ کس لیے ہے۔ پھر جب وہ آدھے گھنٹے بعد احمد کے ساتھ آیا تو اُس کی بڑی پچارو گوشت، سبزیوں، آٹے، چاول اور دوسری ضروری اشیاء سے بھری ہوئی تھی۔ جس کی بدولت ہمیں اگلے بارہ دن بازار سے صرف تازہ سبزیوں کی ضرورت پڑی۔

اُس دن میری وائف نے بہت سے کھانے پکائے۔ ہم نے اپنی رہائشی آبادی کے قریب موجود ایک بہت بڑے پارک کی سیر کی اور شام کو ہم نے ممتاز کے سٹور کا دورہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے لندن کی سیر کے لیے مختلف نقشے خریدے۔ مختلف جگہوں کی سیر کے لیے ٹکٹوں کی قیمت دریافت کی۔ انڈر گراؤنڈ اور بسوں کے روٹوں کے نقشے حاصل کیے اور گھر واپس آ گئے۔

اگلے دن ہائیڈ پارک اور بکنگھم پیلس گھومنے کا پروگرام بنا۔ ہائیڈ پارک (Hyde Park) 350 ایکٹر رقبے پر مشتمل لندن کے دل بکنگھم پیلس کے قریب واقع ہے۔ اسے 1536ء میں پارک کے طور پر استعمال کیا گیا اور 1637ء سے یہ عام پبلک کے لئے کُھلا ہے۔ یہاں بہت سی کانفرنسیں اور جلسے وغیرہ ہوتے رہے۔ 1872ء میں یہاں ایک گوشہ مخصوص کر دیا گیا جس کے تھڑا نما سٹیج پر کھڑے ہو کر آپ چاہے جس کے خلاف بات یا تقریر کریں وہ نا قابلِ گرفت یا نا قابلِ دست اندازی پولیس ہو گی۔ دریائے Serpentine جو کہ بکنگھم پیلس کے نیچے بہتا ہے اس پارک سے گزرتا ہے۔

یہاں ایک بہت بڑا فوارہ بنایا گیا ہے جو دیدنی ہے۔ یہ فوارہ لیڈی ڈیانا کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ اسے Diana Memorial Fountain کہتے ہیں۔ اسے 6 جولائی 2004ء کو چالو کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس پارک میں ایک بہت بڑی اور خوبصورت جھیل بھی ہے۔ اس پارک میں جنگلی حیات کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے پرندوں کے گیت، تتلیوں کے رنگ، حشرات الارض اور مختلف قسم کے Reptile (رینگنے والے چھوٹے جانور) گلہری، کرلا وغیرہ نظر آتے ہیں۔ پھولوں کی بہتات کا اپنا ہی رنگ ہے۔

پارک میں داخل ہوئے تو مجھ پر یادوں نے یلغار کردی۔ یہی وہ پارک تھا جس کی سیر میں نے اعجاز اور اُس کے ہونے والے سسر ظہور اور اُن کی فیملی کے ساتھ کی تھی۔

جب ہم کچھ آگے گئے تو پارک میں سے گزرتی سڑکوں میں سے ایک پر جوان لڑکیاں لڑکے پہیوں والے جوتے پہن کر سکیٹنگ کر رہے تھے۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر چھاؤں میں بنچ لگے تھے۔ میں نے فیملی کے افراد کو کچھ گائیڈ کیا اور بتایا کہ چونکہ میں نے یہ پارک پہلے ہی گھوما ہوا ہے اس لیے تم لوگ گھومو پھرو۔ میں بنچ پر کمر ٹکا کر ذرا اپنے کمر درد کو بہلانے لگا، مگر اصل مقصد یادوں کے بھنور سے نکلنے کی سعی کرنا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں نے اعجاز کی منگنی بلا پوچھے امریکہ میں موجود اپنے دوست ظہور کی بیٹی سے کردی تھی تو اُس نے بلا اعتراض سر جھکا دیا تھا، حالانکہ وہ امریکہ جا کر رہنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا، کیونکہ اس نے بڑی محنت سے لندن میں اپنا سیٹ اپ بنایا تھا اور یہیں رہنا چاہتا تھا۔ پھر جب اُس کا ہونے والا سسر اپنی بیگم اور چھوٹی بیٹی کے ساتھ اُسے انگوٹھی پہنانے کے لیے لندن آیا تو میں اُس کی انتظامی صلاحیت اور واقفیت سے بہت خوش ہوا۔ منگنی ایک بڑے ریستوران کا ہال بک کر کے کی گئی۔ وہ شخصی طور پر حقیقتاً سب سے نمایاں تھا۔ منگنی کے بعد لندن کی سیر کا آغاز ہم نے اِسی پارک سے کیا تھا۔

وہ ایک جینوئن لیڈر تھا۔ کالج یونین کا صدر، یونیورسٹی یونین کا صدر ہونے کے باوجود ٹاپ پوزیشن ٹیکر اور اب لندن میں ایک بڑے مکان میں کئی لڑکوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اُن میں سے زیادہ تر لڑکے اُس کے پاکستان میں گروپ کے تھے اور اُس نے جیسے تیسے کر کے لندن بلائے تھے۔ یہاں بھی وہ اُن کا لیڈر تھا۔ ایک دفعہ میں اور اشفاق چند دن کے لیے لندن اُس کے ہاں ٹھہرے۔ ہمیں ایک کمرہ خالی کر دیا گیا۔ اعجاز کو صبح جلدی کام پر جانا تھا۔ اشفاق صبح صبح چائے کا شوقین ہے۔ بائی چانس اُس کی صبح آنکھ کھل گئی۔ وہ چائے کی طلب میں باورچی خانے کی طرف گیا تو اُس نے سنا۔ اعجاز اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا:

''سنو! بھائی جان میرے بڑے بھائی ہی نہیں، باپ کی جگہ ہیں۔ان کو اور اُن کے دوست کو اگر غیریت محسوس ہوئی یا کوئی اور شکایت ہوئی تو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا''

اشفاق نے مجھے یہ بات بتائی اور اُس کے کمنٹس تھے

''ہاں وہ یہ سب کہنے کا حق اور طاقت رکھتا ہے''

لیکن اس سب کے پیچھے، اُس کا میرے ساتھ جو بے پایاں پیار تھا اُس نے مجھے نہال کر دیا۔ میں نے خود سے کہا

''ڈرامے کرتا ہے ڈرامہ گیر! تو تنہا کب ہے ۔ایک شیر جوان تمہارے ساتھ کندھا جوڑے کھڑا ہے۔اب کیا غم ہے جو سارا زمانہ دوسری طرف ہے؟''

مگر آہ............''اللہ دا حکم''

میں نے ایک طویل سانس لے کر یادوں کے اس گرداب سے نکلنے کی سعی کی ۔اس کوشش میں مَیں نے ذرا سرکشی کے ساتھ سورج کی آنکھوں میں جھانکا تو اُس نے میری آنکھوں میں تارے بھر دیے جو نیلے پیلے رنگوں میں میری نظروں کے سامنے گھومنے لگے اور میں آہستگی سے دوبارہ بنچ پر بیٹھ گیا۔

پچھلے کئی ماہ سے ایسا ہو رہا تھا کہ میں بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا اور کِسی بنئے کی طرح کیا کھویا اور کیا پایا کا حساب کرنے لگتا۔دراصل پچھلے دو سالوں میں مَیں نے ایک جنگِ عظیم کا سامنا کیا تھا۔ اس جنگ میں مَیں نے اپنی صحت کی خرابی(Angina) کے باوجود،خود سے ،اپنے بچوں کے مستقبل سے ،اپنے کاروبار سے ،سب سے کھلواڑ کیا تھا۔کِسی نہ کِسی حوالے سے سب کو داؤ پر لگا دیا تھا اور پھر شاندار طریقے سے ہار گیا تھا۔ بیوی اور بچوں نے بے شک نہ کبھی مجھ سے حساب طلب کیا تھا اور نہ اِس کا آئندہ کوئی امکان تھا،مگر میری خود سے تکرار جاری تھی کہ تو نے کیا کیا؟

تونے یہ کیا کہ جو اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے لیے خدا سے یہ کہہ کر مانگنے سے انکار کرتا تھا کہ ''جس نے پیدا کیا ہے وہ خود ہی ضروریات سے آگاہ ہوگا، مَیں کیوں مانگوں'' اور اب تو نے رات دن ایک کر دیے، سجدے، دُعائیں، وظائف، جانے کیا کیا کرتا رہا، مگر............

اور تُو نے جس نے ماضی، بلکہ ماضی قریب میں بھی امداد کی بڑی بڑی پیشکشیں ٹُھکرا دی تھیں، اب کے سر پہ پڑی تو دوستوں، مخالفوں، عزیز و اقارب بلکہ معمولی واقف کاروں سے بھی امداد کی بھیک مانگتا رہا۔ صرف پیسے کا مانگنا ہی تو مانگنا نہیں ہوتا۔ دوسری ضروریات کی امداد لینا بھی تو بھیک ہی ہوتی ہے۔ تُف ہے تجھ پر، روا اپنی اس بے بسی اور بے توقیری کو۔ پاگل اب بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا۔

اب تو روئے گا بھی تو کِس مُنہ سے۔ تُو جس نے ماں کے اپریشن کے وقت ضبطِ غم سے بالوں میں چاندی اُتار لی، مگر رویا نہیں، تو جو ماں، وہ ماں جسکے بارے تیرا دعویٰ ہے کہ تجھے سب سے پیاری تھی، کی موت پر بھی نہیں رویا اور باپ کی موت کو بھی بے حسوں کی طرح جھیل گیا۔ اب کیسے روئے گا۔ رونا تھا تو وقت پر روتا۔ دعاؤں کے ساتھ آنسوؤں کی برسات بھی شامل کرتا تو شاید تیری سُنی جاتی۔ اب رونا تو اپنا مذاق بنانا ہے ناں۔

پہلے تھوڑا تمہارا مذاق بن چکا ہے؟ عزیز و اقارب میں سے نہ کسی کو تیرے غم کا اندازہ ہے اور نہ نقصان کا۔ سب کا اپنا اپنا فائدہ ہے اور اپنا اپنا نقصان اور پھر اُن کے پاس رو کر غم ہلکا کرنے کا اکسیر نسخہ بھی تو ہے۔ تو کیا ہے؟ بے توقیر، بے عزت اور بے مایہ بھی۔ اب تو وہ بھائی بھی قبر میں جا سویا ہے جس نے اپنے ہونے والے سسر ظہور صاحب کی میرے متعلق کسی سازشی گفتگو کے بعد برملا کہا تھا۔ کہ ''ہاں، وہ جو بھی کرے، میرا بڑا ہے، میرے باپ کی جگہ ہے بلکہ سمجھو میرا باپ ہے ۔ اپنی ترغیبات اپنے پاس رکھو''۔ یہ تمغہ تو نصیب والوں کو ملتا ہے اور بڑے لوگ دیا کرتے ہیں۔ وہی بڑے لوگ جن کی زندگی اس دورِ خرابی میں کم ہوا کرتی ہے اور ایسے لوگوں کی

موت پر بین کرنا تو واجب ہو جاتا ہے، مگر تو نہیں رویا۔ تو نہیں رو سکتا کہ تو انسان کہاں ہے..........؟

میں کیا بتاتا، کیا کرتا، مجھ پر اُس شخص کے پیار کے بہت سے قرض تھے۔ میرے اندر بہت ٹوٹ پھوٹ تھی۔ میں یہاں ایک فرض نبھانے آیا تھا۔ میرے سر پر میرے بیوی بچوں کا بھی بہت سا قرض واجب تھا۔ میں بہت سے محبت کرنے والوں کی محبتوں کا مقروض تھا۔ میں نے ابتک صرف اُن کی عام ضروریاتِ زندگی کا خیال رکھا تھا۔ جبکہ دوسروں (اپنوں اور غیروں) کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ اب بچے جوان تھے اور مجھے اُن کے مستقبل کے لیے چارہ جوئی کرنا تھی۔ اسی سلسلے میں مَیں اُن سب کے ساتھ اب لندن میں تھا، مگر میرے پہلے سے شکستہ دل و دماغ پر لندن کی فضاؤں نے بھرپور انداز میں حملہ کر دیا تھا، کیونکہ یہی تو وہ شہرِ بے درد تھا جس نے میرا فخر، میرا مان، میرا بھائی زخمی کیا تھا جو بالآخر ایک دوسرے شہر بلیک برن میں زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ اُس کی موت کے بعد یہ میرا پہلا دورۂ لندن تھا۔ سو یادوں کی یلغار یہاں کے موسم کی طرح شدید تھی۔ میرے دل اور دماغ خستہ حال ہونے کے باوجود حسبِ تربیت اور حسبِ عادت ڈپریشن کے اس شدید اٹیک کی شدید مزاحمت کر رہے تھے۔ اس لیے شاید میں کچھ بڑبڑایا تو میری بیوی جو سیر سے تھک کر میرے پاس بینچ پر بیٹھ گئی اور اونگھ گئی تھی ہڑبڑا اُٹھی اور مجھے جھنجھوڑ کر پوچھا:

''کیا ہوا..........؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آپ کا تو رنگ ہلدی ہو رہا ہے؟''

میں پہلے تو چند لمحے خالی نظروں سے اُسے دیکھا کیا۔ پھر یاد آیا کہ مَیں کہاں ہوں۔ مَیں اِس وقت لندن کے مشہورِ زمانہ ہائیڈ پارک میں تھا۔ میرے ساتھ میری بیوی، چاروں بچے اور سب سے چھوٹی بہن بھی تھی۔ کچھ دیر پہلے......یا پتہ نہیں کتنی دیر پہلے...... میں نے اُن سب کو پارک میں گھومنے پھرنے کو کہا تھا اور خود ایک بینچ پر بیٹھ گیا تھا، کیونکہ زندگی کے بہت سے حادثوں میں سے ایک شدید روڈ ایکسیڈنٹ نے جو نیو یارک میں ہوا تھا۔ میری کمر کے مہرے ہلا دیئے تھے جو ٹھنڈ میں اکثر درد جگا کر میرا حوصلہ اور صبر آزماتے اور میں اُنہیں ٹھینگا دکھا کر معمولاتِ زندگی میں

مصروف رہتا۔ اب پھر یہ میرے ساتھ شرارت پر آمادہ تھے۔ میں نے ہائیڈ پارک پہلے کئی مرتبہ گھوما ہوا تھا اس لیے بیوی بچوں کو گھومنے کا کہہ کر خود اُن مہروں کی تشفی کے لیے بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ چونکہ ابھی مجھے کچھ دن بچوں کو کئی جگہوں پر گھمانا تھا اور ان مہروں پر جواباً عذاب نازل کرنا تھا۔

''کیا کمر میں تکلیف بہت بڑھ گئی ہے؟ ایسا ہے تو واپس گھر چلتے ہیں''

میری بیوی نے مجھ سے جواب نہ پا کر دوبارہ فکرمندی سے پوچھا۔ میں اِن چند لمحوں میں سنبھل چکا تھا اور ایک ذمہ دار خاوند، باپ اور بھائی کی ایکٹنگ کے لیے تیار تھا۔ سو میں نے کہا:

''ارے سب ٹھیک ہے۔ سورج کی براہِ راست روشنی کی وجہ سے مجھے تمہارا رنگ بھی پیلا محسوس ہو رہا ہے اور پھر یہ ٹریولنگ پاس ضائع کرنے ہیں کیا............؟''

مجھے پتہ تھا کہ میری بیوی اس معاملہ میں بہت حساس ہے۔ آج صبح گھر سے نکلتے ہی جب میں نے 7½ پاؤنڈ فی فرد کے حساب سے ٹریولنگ کارڈ خریدے تو اس نے میری بہن اور بیٹی سے ٹکٹوں کی رقم پاکستانی کرنسی میں پوچھی۔ جب اُسے بتایا گیا کہ سات ٹکٹوں کی رقم تقریباً 7½ ہزار روپے بنی ہے تو اُس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

میں نے اُس کی اِس دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ غصے سے بولی۔

''کھسماں نوں کھان ٹکٹاں۔ ویکھوناں تہاڈا حال کی ہویا اے''

''یعنی دفع کریں ٹکٹیں۔ دیکھیں ناں آپ کیسے بے حال ہو گئے ہیں''

بعد میں جب بچے کہتے:

''امی واپس چلتے ہیں، شام ہونے کو ہے، بہت گھوم لیا آج''، تو وہ کہتی

''اتنے پیسے خرچ ہیں اِن موئی ٹکٹوں پر۔ ایک آدھ جگہ اور گھوم لو''

میں نے ٹالنے کے لیے بچوں کا پوچھا تو اُس نے جھیل کنارے پھولوں کے پودوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ سب جھیل میں تیرتی بطخوں اور پھولوں کو بیک گراؤنڈ میں لے کر دھڑا دھڑ تصویریں بنا رہے تھے۔

میں نے بمشکل خود کو یادوں کے اِس چنگل سے چھڑایا اور بچوں کو لے کر بکنگھم پیلس (Buckingham Palace) کا قصد کیا جو کہ ہمارے اُس دن کے شیڈول میں دوسری منزل تھی۔

یہ محل جو 1837ء سے صاحبِ اقتدار (Sovereigns) لوگوں کی رہائش گاہ چلا آ رہا ہے، مجھے کبھی بھی اتنا متاثر نہ کر سکا کہ میں اِسے اندر سے دیکھنے کی خواہش کرتا، حالانکہ میرے کئی ٹور اگست اور ستمبر کے تھے جب ملکہ اپنے سالانہ دورہ پر سکاٹ لینڈ جاتی ہے اور اِس دوران یہ محل عوام کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ اس وزٹ کی باقاعدہ فیس وصول کی جاتی ہے جس سے محل کی سالانہ دیکھ بھال کے لیے رقم حاصل کی جاتی ہے۔ برطانوی حکومت اس مَد میں 15 لاکھ پونڈ سالانہ خرچ کرتی ہے۔

اس سیر کے دوران محل کے صرف 19 سٹیٹ روم عوام کے لیے کھولے جاتے ہیں، جبکہ 52 بڑے بیڈروم، 188 سٹاف بیڈروم اور 92 آفیسرز روم اسکے علاوہ ہیں۔ اس محل میں 78 باتھ رومز ہیں۔ ایک بڑا سومنگ پول بھی ہے۔ 1828ء میں اس محل میں ایک مصنوعی جھیل بھی بنائی گئی جِسے دریائے Serpentine سے پانی دیا جاتا ہے۔ یہ دریا ہائیڈ پارک سے بھی گزرتا ہے۔ سنا ہے کہ سیر کرنے والوں کو 1962ء میں قائم شدہ Queen Gallary بھی دکھائی جاتی ہے جہاں دنیا بھر سے لوٹے ہوئے فن پارے جمع ہیں۔ اس کے علاوہ ملکہ کا جمع شدہ ہیرے جواہرات (Gems) کا ذخیرہ بھی ہے۔ لوگوں کو اچھا پروٹوکول دیا جاتا ہے اور ½4 بجے انہیں آفٹرنون ٹی (Afternoon Tea) بھی پیش کی جاتی ہے۔ دریائے Tyburn بھی محل کے جنوبی حصے اور صحن کے نیچے سے گزرتا ہے اور محل کا باغ برطانیہ کا سب سے بڑا پرائیویٹ باغ ہے جو ملکہ کی ملکیت ہے۔ اسی محل کی مشرقی بالکونی سے ملکہ مخصوص موقعوں پر عوام (محکوموں) کو درشن دیتی ہے اور پھر 828818 Sqft کے اس محل میں کسی ساحرہ کی طرح گم ہو جاتی ہے۔

یہ وہی محل ہے جس کا ایک بڑا حصہ سر چارلس شیفیلڈ نے 1761ء میں جارج تھرڈ کے ہاتھ 21000 پونڈ میں فروخت کر دیا تھا۔ یہ وہی محل ہے جسے ایک عاشق نے جرأتِ رندانہ کرتے ہوئے تاج و تخت سمیت اپنے عشق کی خاطر پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ ایک یہ ملکہ ہے جو اپنے بے تحاشا اختیارات سے محروم ہو کر بھی صدی بھر سے اس محل میں ایک قیدی یا پھر ایک مورتی کی طرح استادہ ہے۔ ایک وہ لیڈی ڈیانا تھی جس کے لیے یہ محل قید خانہ تھا اور وہ یہاں سے آزادی حاصل کر کے رہی چاہے مر کر ہی سہی۔ ملکہ کے ہوتے ہوئے یہاں کسی کا عظیم کہلوانا کارِ ندارد تھا، مگر وہ جان دے کر ہی سہی، اپنا نام تاریخ میں امر کر گئی۔ اب جب بھی تاریخ لکھی جائے گی، ملکہ کے ساتھ اُس کا (لیڈی ڈیانا کا) نام ضرور آئے گا۔

1826ء میں آرکیٹکٹ جان نیش John Nash اور پھر 1830ء میں Edward Blore کے ذہن رسا کا کمال یہ محل 15 ستمبر 1940 میں جرمن طیاروں کی شدید بمباری کا نشانہ بنا، مگر مجال ہے کہ ملکہ یا شاہی خاندان کے کسی فرد کو خراش بھی آئی ہو۔ جانے کیوں جنگوں کی تاریخ میں جب بھی مرتے ہیں عوام اور سپاہی ہی مرتے ہیں۔ جرنیلوں یا بادشاہوں کو کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ ایسی مثالیں اگر ہیں بھی تو کم کم ہی ہونگی۔

ہم محل کی طرف رواں تھے اور میں بچوں کو اِس ضمن میں بریف کر رہا تھا۔ کمر درد کی وجہ سے میں چل کم اور گھسیٹ زیادہ رہا تھا۔ آخر جب کمر درد نے میری ٹانگیں بھی اکڑا دیں تو میں سڑک کے کنارے لگے لوہے کے جنگلے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور جنگلے کے درمیانی راڈ کے ساتھ کمر دبانے لگا۔ سبھی فکر مند ہو گئے اور اپنے اپنے رشتے کے حساب سے مجھے مخاطب کر کے پوچھنے لگے اور میں:

''کوئی خاص بات نہیں بھئی، ذرا تھک گیا ہوں، شکر ہے اللہ کا سب ٹھیک ہے'' کی گردان کرنے لگا۔''

یہ شکر کے کلمے کا تواتر کے ساتھ استعمال بھی میں نے کچھ عرصہ قبل ہی سیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں کہا کرتا تھا کہ ''محنت کرنا میرا کام ہے اور وہ میں زبردست طریقے سے کر رہا ہوں، روٹی روزی دینا اور دوسری ضروریات کا خیال رکھنا اوپر والے کا کام ہے، یہ اُسے کرنا چاہیے۔ پھر یہ شکر یا شکریہ کہاں سے آگیا''

مگر جب قومہ میں گئے ہوئے بھائی کے سرہانے مہینوں کے حساب سے بیٹھا تو اگر اُس کی ٹانگ معمولی سا حرکت کرتی تو میرے منہ سے خوشامدانہ نکلتا:

''یااللہ تیرا شکر ہے''

اسکی آنکھ معمولی سا جھپکتی تو ''یااللہ تیرا شکر ہے''، اُسکے منہ سے کوئی لایعنی بات بڑبڑاہٹ کی صورت میں ادا ہوتی تو ''یااللہ تیرا شکر ہے''۔ سو اُس وقت سے یہ ''شکر ہے'' میری گفتگو کا حصہ بن گیا۔ انسان کتنی جلدی اپنی عادتیں اور قول بدل لیتا ہے............؟

میں پھر یادوں میں ڈوبتا جا رہا تھا مگر میرے اپنے مجھے ڈوبنے سے بچانے کے لیے طرح طرح کی آوازیں لگا رہے تھے۔ میں نے سر جھٹکا تو دیکھا کہ جیسے میں تماشہ گر ہوں اور سبھی مجھے دیکھ رہے ہیں کہ دیکھیں اب کیا تماشہ دکھاتا ہے۔ غور کیا تو محسوس ہوا کہ میں تماشہ گر نہیں خود تماشہ ہوں۔ خیر میں نے ہمت کی، خود کو سمیٹا اور **Its better now** کہتے ہوئے محل کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔

محل کے بڑے گیٹ کے بالکل سامنے ایک بہت بڑا قطعہ ہے جس میں ایک کافی اونچا اور بڑا چبوترہ ہے جس کے چاروں طرف پتھر کی سیڑھیاں ہیں۔ اُن سیڑھیوں پر بہت سے سیاح بیٹھے اس باجبروت بوڑھی ملکہ کے محل کو گیٹ سے اندر تک دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم بھی اُن میں شامل ہو گئے میں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور بچے فوٹو لینے لگے اور ایک دوسرے سے ہنسی کھیل میں مشغول ہو گئے۔

''ڈیڈی! آپ نے توکل کو اندر سے دیکھا ہوگا اور ملکہ کو بھی'' میری بیٹی نے اچانک پوچھا:

''نہیں بیٹے، میں نے نہیں دیکھا''

''کیوں ڈیڈی! آپ تو یہاں کئی بار آئے ہیں''؟

جب میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا تو وہ دوبارہ بھائیوں اور آنٹی کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ انہوں نے میری بیگم کو بھی ساتھ گھسیٹ لیا تھا اور تصویریں بنا رہے تھے۔ میں بھلا اُسے کیا بتاتا کہ اُن محلوں کو دیکھ کر مجھے کیا ہوتا ہے۔ مجھے وہ ظلم یاد آتے ہیں جوان لوگوں نے باقی دنیا اور خصوصاً عالمِ اسلام پر ڈھائے تھے اور یہ شاندار عمارات کھڑی کیں تھیں۔ مجھے تو ملکہ کا سرخ وسفید بوڑھا چہرہ ٹی وی پر دیکھ کر بھی یوں لگتا تھا جیسے اِن گالوں میں میرے اسلاف کا خون دوڑ رہا ہے جو کہ اس نے ضرور کسی وقت از راہِ نزاکت تھوڑا سا چکھا ہوگا۔ غلاموں کے خون کی اس سے زیادہ توقیر کیا ہوسکتی ہے کہ وہ آقاؤں کی صحت مندی میں معاون ہو۔

میں اُسے کیا بتاتا کہ میں تو مصر میں "Paramide" کے سامنے کھڑے ہو کر بھی اُن کی تاریخی عظمت یا صناعی سے متاثر نہیں ہوا تھا، مجھے تو اُس وقت بھی اپنے جیسے وہ ہزاروں، لاکھوں بے نام یاد آ رہے تھے جو اِن Paramide کی بنیادوں میں دفن ہو کر یہ شاہکار کھڑے کر گئے۔ جب بھی کوئی شاندار عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو اُس کی ابتدا، تکمیل بلکہ تکمیلی مراحل کے دوران بھی گاہے بگاہے، اُس کے نام پر زندہ خون اور گوشت کی قربانی دی جاتی ہے جسے شاید اُس کی کوئی ضرورت نہیں، مگر بکرے ہوں یا غلام، قربان کرنے کے لیے ہی تو ہوتے ہیں۔ اگر اُن کو قربان کر دینے سے معمولی سے فائدے کا امکان بھی ہو تو زرداروں اور طاقتوروں کے لیے بکروں یا غلاموں کا اس سے زیادہ سودمند مصرف کیا ہوسکتا ہے؟

بچے کھیلتے رہے اور میں سوچوں میں ڈوب گیا۔ میں یہاں پہلی مرتبہ اعجاز اور اُس کی سسرالی فیملی کے ساتھ آیا تھا۔ اعجاز کے سسر نے بھی مجھ سے ایسا ہی سوال کیا تھا اور میں نے آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیا تھا، کیونکہ ایسے جواب سب کی سمجھ میں کہاں آتے ہیں۔ وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ تصویریں بناتا رہا۔ ویڈیو فلم شوٹ کرتا رہا۔ آج میری فیملی بھی یہی کچھ کر رہی تھی۔ میں اُس وقت بھی تاریخ میں سفر کرتا رہا اور میں آج بھی اُسی سفر پر تھا۔ آخر دن ڈھلنے کو آیا تو ہم پردیسی پرندے اپنے عارضی گھونسلے کی طرف چل دیئے۔

☞ ☞ ☞

اگلے کچھ دن

فواروں کا پانی اُچھلتا ہوا چاروں طرف اپنی بوندیں بکھیر رہا تھا۔سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور اِس کی کرنیں بعض بوندوں پر مخصوص زاویے سے پڑنے کی وجہ سے وہ بوندیں ہیرے کی کنیاں محسوس ہو رہی تھیں۔اسد کی بے چین طبیعت اُسے ٹکنے نہیں دے رہی تھی۔ وہ کبوتروں کے جُھنڈ میں جا کر انہیں اُڑنے پر مجبور کرتا تو فضا میں اُن کی اُڑان سے ایک چھاتا سا تن جاتا اور اُن کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ دل میں ایک خوش کُن سا تاثر پیدا کرتی۔

یہ ٹریفالگر سکوائر(Trafalgar Square) تھا اور مجھے یہ جگہ اچھی لگتی تھی۔ یہاں کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ٹھنڈی دھوپ میں لطف اُٹھانا یا سوچوں میں گم ہو جانا مجھے ہمیشہ سے مرغوب تھا یا پھر فواروں کے گرد ہلکی سی چار دیواری پر بیٹھ کر بوندوں سے بھیگنا اور کبوتروں کی اٹکھیلیاں دیکھنا بھی طبیعت میں سکون سا بھر دیتا تھا۔

اس سکوائر کے سنٹر میں برطانیہ کے جنگی ہیرو نیلسن کا مجسمہ نصب ہے جِسے چار شیروں نے گھیر رکھا ہے۔یہ برطانیہ کا وہ کمانڈر تھا جس نے 1805ء میں نپولین کے ساتھ ٹریفالگر کی لڑائی میں کمانڈ کی تھی۔میں نے اُس مجسمے پر توجہ دینا چھوڑ دیا تھا، کیونکہ یہ مجسمہ مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا تھا۔یہ مجھ سے پوچھتا کہ بتاؤ! تمہاری زمین بھی مجھ ایسے سپوت پیدا کر رہی ہے یا اُس کے پاس اب یحییٰ اور نیازی جیسے جرنیل ہی رہ گئے ہیں یا پھر ٹکا خاں جیسے جنہیں صرف اپنی عوام کو روندنا

آتا ہے۔میں تاریخ سے بہت سی مثالیں پیش کرنے کی کوشش کرتا،مگر اُس کی طنزیہ ہنسی مجھے اپنے کانوں میں صاف سنائی دیتی۔سواب میں اُس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔

ڈیڈی یہ مجسمے کن لوگوں کے ہیں............؟میری بیٹی نے سوال کر کے مجھے چونکایا

''بیٹے اُن لوگوں کے نام اور تاریخ وغیرہ سب اُن کے پاؤں میں جڑی تختیوں پر لکھے ہیں ۔ یہ تمہارے سامنے نیلسن ہے،ان لوگوں کا جنگی کمانڈر اور وہ سامنے مشرقی طرف جارج واشنگٹن کا مجسمہ ہے۔وہ امریکہ کا صدر تھا۔باقی بھی مشہور لوگ ہی ہونگے''میں نے بیزاری سے کہا تو سب نے میرا موڈ محسوس کرتے ہوئے توجہ ہٹالی۔

چند منٹ بعد میں نے اُن کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے خود کو سنبھالا اور انہیں اِس جگہ کے بارے میں ہلکی پُھلکی باتیں بتانے لگا۔

اس سکوائر کا اصلی نام King William The fourth's Square تھا۔بعد میں جارج لیڈول ٹیلر کی تجویز پر نپولین وارز میں سے ایک جنگ Trafalgar War کے نام پر اسکا نام رکھ دیا گیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ جگہ سرکاری طور پر ملکہ کی ملکیت ہے۔اس جگہ کو سیاسی مظاہروں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے،مگر مجال ہے جو کوئی بھی اس کی کسی ایک اینٹ کو بھی نقصان پہنچائے۔ہمارے ہاں ہوتا تو یہ کب کا اپنے انجام کو پہنچ چکا ہوتا اور تمام کبوتر امراء کی خوش خوراکی کا شکار ہو چکے ہوتے۔اسی طرح یہ جگہ بعض مرتبہ کمیونٹی گیدرنگ کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔نیوائیر کی Celebration تو یہاں خصوصی طور پر برپا کی جاتی ہے۔

یہ جگہ سنٹرل لندن کے علاقہ میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ لندن کے عین درمیان میں ہے۔اس میں یہ خوبصورت فوارے 1845ء میں نصب کیے گئے تھے جو اب اس منظر کی جان ہیں۔ایک اندازے کے مطابق یہ دُنیا کی چوتھی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی جگہ ہے۔یہاں 1½ کروڑ لوگ ہر سال آتے ہیں۔

''کیا یہ کبوتر یہاں سرکاری طور پر چھوڑے گئے ہیں''؟یہ بیگم صاحبہ تھیں۔

”ابھی اس کا تو مجھے پتہ نہیں کہ یہ یہاں کیسے آئے، مگر ایک سروے کے مطابق 1996ء میں یہاں 35000 کبوتر تھے“

”دراصل یہ سارے کالے اور سفید کلغی والے ایک ہی نسل کے نظر آتے ہیں ناں۔ اسی لیے یہ سوال اُٹھا تھا۔ ویسے ان کے گھونسلے وغیرہ کہاں ہیں؟“

اِن کے گھونسلے یہ اردگرد کی عمارتیں ہیں۔ جہاں یہ رات کو قیام کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ان عمارتوں کے مالکان نے شکایت کی کہ اُن کی عمارتوں کے قیمتی پتھر ان کبوتروں کی بیٹوں سے خراب ہوتے ہیں اور گندگی بھی پھیلتی ہے۔ ایک مضمون سے پتہ چلا ہے کہ اس بات کی باقاعدہ تحقیق کی گئی اور شکایات درست پائی گئیں۔ 2000ء میں ان کی تعداد کم کرنے کے لیے انتظامیہ نے ٹرینڈ عقاب چھوڑے۔ اس کے علاوہ چوک کے اردگرد کبوتروں کی خوراک بیچنے پر پابندی عائد کر دی گئی، لیکن لوگ دوسرے علاقوں سے کبوتروں کے لیے خوراک لے آتے۔ وہ یہاں آ کر کبوتروں کو خوراک ڈالتے تو یہ کبوتر اُڑ کر اُن کے ہاتھوں اور کندھوں پر بیٹھ جاتے، جس سے اُنہیں خوشی محسوس ہوتی۔ اسی وجہ سے ان اقدامات کے باوجود کبوتروں کی تعداد میں مناسب کمی نہ ہو سکی۔

انتظامیہ یہاں سے کبوتر بالکل ختم بھی نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ یہ عوامی خوشی اور سکوائر کی خوبصورتی کا ایک حصہ تھے۔ بالآخر 2003ء میں اُس وقت کے لندن کے میئر Livinig Stone نے چوک کے اندر کبوتروں کو خوراک ڈالنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا۔ یوں ان کی تعداد اب کافی گھٹ گئی ہے“

بچوں کی تسلی ہو گئی اور وہ مجسموں، شیروں اور فواروں کی بیک گراؤنڈ کے ساتھ تصویریں لینے میں مشغول ہو گئے۔ بلاشبہ یہ ایک ایسی گیدرنگ پلیس (Gathering Place) ہے جہاں روزانہ درجنوں اقوام کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس کی سیڑھیاں، بینچ اور فواروں کے گرد کی دیوار پر ہر وقت کوئی نہ کوئی ایسا چہرہ ضرور موجود ہوتا ہے جو مرقع حسن ہو اور مجھ جیسے حُسن پرستوں کی روح کی غذا ہو۔

ایک نیا دن

ہم اس وقت بیکر سٹریٹ پر کھڑے احمد کا انتظار کر رہے تھے۔اُس نے اپنی جاب سے سیدھا مادام تساد میوزیم (Madame Tussaud Museum) کے باہر ہمیں جائن کرنا تھا۔احمد کام پر جانے کے لیے ہر ہفتے ہفتہ بھر کا بس پاس بنوا لیتا تھا۔اِس پر وہ تمام ہفتے بسوں میں جتنا چاہے سفر کرتا،کوئی پابندی نہیں تھی۔ یوں یہ پاس بہت سستا پڑتا تھا۔آج بھی اُس نے انڈر گراؤنڈ کی بجائے پیسے بچانے کے لیے اسی پاس کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ لیٹ ہو گیا تھا۔

میں نے کچھ فرنچ فرائز اور ڈرنکس خریدے اور بیوی بچوں کے ہاتھوں میں تھما دیے اور بیکر سٹریٹ کے کارنر پر کتابوں کی ایک دکان پر کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔سبھی لوگ آج کے اس ٹور کے لیے بہت Excited تھے، کیونکہ انہوں نے مادام تساد کے میوزم کا بہت نام سُن رکھا تھا۔لندن میں یہ میوزیم 1802ء میں شروع کیا گیا، جو 1835ء میں موجودہ جگہ یعنی بیکر سٹریٹ میں منتقل ہوا اور اب تک پوری شان وشوکت سے زمانے بھر کے سیاحوں کو مسحور کر رہا ہے۔

مادام میری (Marie) ایک بے بدل فنکارہ تھی اور اُس نے اپنے جیسے ایک فنکار سے ہی شادی کی۔اُس کے خاوند کا نام اُس کے ساتھ لگ کر امر ہو گیا۔اب میری کا تو شاید بہت سوں کو پتہ بھی نہ ہو، مگر مادام تساد میں تساد دراصل اس کے خاوند کا نام ہے۔دوسری طرف دیکھیں تو ملکہ

الزبتھ کے شوہر فلپس کا نام ملکہ کے ساتھ لگ کر مٹ گیا اور برطانیہ کے بہت سے لوگ ملکہ کے شوہر کا نام نہیں جانتے۔ فنکارہ، فنکارہ ہوتی ہے اور ملکہ، ملکہ

احمد کی آمد پر ہم میوزم کے ٹکٹ ہال میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ اگر آپ اس میوزم کے ساتھ ساتھ لندن آئی (London Eye) کا ٹکٹ بھی خریدیں تو Package سستا پڑے گا۔ صرف میوزم دیکھنے کے لیے ٹکٹ کی قیمت 32 پونڈ فی فرد تھی۔ جبکہ دونوں جگہ کے لیے ٹکٹ 38 پونڈ میں دستیاب تھے، جبکہ علیحدہ علیحدہ خریداری کی صورت میں ٹکٹ 50 پونڈ میں پڑتے۔ میں نے Package ٹکٹ لینے کا فیصلہ کیا۔ سات ٹکٹوں کی پے منٹ کریڈٹ کارڈ سے کر کے میں نے سلپ اور ٹکٹیں بیٹی کے ہاتھ میں دے دیں۔

پاکستانی کتنے روپے بنے؟'' میری بیگم نے حسبِ عادت پوچھا

''بھئی شام کو حساب کریں گے'' میں نے اُسے جلدی سے ٹالا

ہم میوزم کے اندر داخل ہوئے تو راہداری میں ہی ہٹلر سے ملاقات ہوگئی جو اپنی پوری وردی میں طمطراق سے کھڑا تھا۔ آگے بڑھے تو ہال میں صدام حسین اور فلسطینی لیڈر یاسر عرفات مِل گئے۔ پھر ہم گلیمر کی دنیا میں داخل ہوگئے۔ مائیکل جیکسن، سپائیڈر مین، امیتابھ بچن، ایشوریا رائے، میڈونا اور جانے کون کون۔ بچے تصویروں کے ڈھیر لگا رہے تھے۔ اس مشغلہ میں اُن کی ماں اور آنٹی بھی شامل ہوگئیں تھیں۔ مٹھو (اسد) کسی گٹار بجاتے فنکار کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ احمد، محمد علی کے ساتھ باکسنگ کے پوز میں تھا۔ کبھی وہ اکٹھے ہو کر سپائیڈر مین کے گرد ہو جاتے اور کبھی اُس جن کے گرد جو کسی یورپین فلم کا کردار تھا۔

مَیں غور سے سیٹنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ گوروں نے تعصب سے ہٹلر کو راہداری میں کھڑا کر دیا تھا۔ اُس کے گرد روشنیوں سے اس طرح ہالہ سا بنا دیا تھا کہ وہ ایک ناقابلِ بیان منفی سا تاثر دے رہا تھا۔ دوسری طرف ایک سٹیج پر دنیا بھر کے طاقتور لوگوں کا اجتماع تھا جو بڑے طمطراق سے

کھڑے تھے۔سب سے آگے جارج بش اور ٹونی بلیئر تھے۔ان کے درمیان روسٹرم موجود تھا۔ اُن کے پیچھے دائرہ کی صورت میں دُنیا کے طاقتور ترین ملکوں کے سربراہ تھے۔جن میں بدقسمتی سے کوئی مسلم سربراہِ مملکت موجود نہیں تھا۔اپنے لوگوں کے کرتوتوں سے واقف ہونے کی وجہ سے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ ہم ڈیڑھ ارب لوگوں میں کوئی بھی اس قابل نہ تھا،مگر اس بات نے مجھے افسردہ ضرور کر دیا۔ یہاں آپ چبوترے پر چڑھ کر روسٹرم کو استعمال کرتے ہوئے فوٹو کھنچائیں تو یہی تاثر ملتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے درمیان تقریر کر رہے ہیں۔مجھے اس لحاظ سے یہ مجسمے زندوں سے بہتر نظر آئے کہ یہاں اِن تک عام لوگوں کی بھی رسائی تھی۔ویسے بھی فنکارانہ لحاظ سے یہ مجسمے اپنے اصل سے زیادہ فریش نظر آتے ہیں۔یوں اصل نقل اور نقل اصل نظر آتا ہے۔

دوسری طرف ایک اور سٹیج ملکہ،اُس کے خاوند اور خاندان کے دوسرے افراد سے پُر ہے۔ ایک طرف علیحدہ لیڈی ڈیانا بھی تنہا سی نظر آ رہی ہے۔بیچاری زندہ بھی تنہا تھی اور مر کر بھی ایسی ہی ہے۔زندگی میں وہ تنہائی کا علاج کبھی پاکستانی ڈاکٹر سے اور کبھی ڈوڈی الفہد سے کرواتی رہی اور یوں شاہی محل کے قید خانے سے فرار کی سازش کی مرتکب جانی گئی۔اُس کا دوسرا جرم یہ تھا اُسے اُس کام کے ماہر صرف مسلمان ہی کیوں نظر آتے ہیں۔یوں پتہ نہیں کہاں سے،اُسے سزائے موت کا مُستحق قرار دیا گیا اور اب وہ ایک مجسمہ تھی۔ملکہ کی بوڑھی آنکھوں میں تفاخر تھا اور سر پر تاج اور اُس کا شوہر فلپس وردی پر بہت سے تمغے ہونے کے باوجود مسکین سا اُس کے پہلو میں کھڑا تھا۔روایات کی امین ملکہ زندہ باد،مگر یہاں بھی سب سے اچھی بات یہی تھی کہ ملکہ اور ڈیانا تک مجھ جیسے غریب الوطن سیاح کی رسائی تھی اور میں نے بھی زیادہ تر لوگوں کی طرح ڈیانا کا ساتھ ہی پسند کیا۔میں ملکہ کو نظر انداز کر کے تصویر کے لیے اُس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔میرا اُس کے ساتھ ہی کھڑا ہونا بنتا تھا۔

اس ہال کے گلیمر نے بچوں کا دل موہ لیا تھا۔درمیان میں فوارے چل رہے تھے اور اس کے گرداگرد دنیا کے نامور لوگوں کا اجتماع تھا۔جو کہ بالکل اصل کی مانند تھے۔اوپر سے روشنیوں کی

سیٹنگ نے اُنہیں باغ و بہار کردیا تھا۔ یمرہ ٹکاٹک چل رہا تھا۔ میں نے بمشکل بچوں کو منایا اور اگلے حیرت کدے کی طرف لے کر چلا۔ یہ چیمبر آف هارر (Chamber of Horrors) تھا۔ جس کے باہر ایک عورت مسلسل لوگوں کو بتا رہی تھی کہ اندر جا کر کوخوفزدہ نہ ہوں۔ وہاں کے جن بھوت اور چڑیلیں انسان ہی ہیں، نہ وہ آپ کو چھوئیں گے نہ آپ اُن پر حملہ کریں۔ اپنے موبائل اور زیورات خوفزدہ ہو کر ان راہداریوں میں نہ گنوا بیٹھیں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بیوی بچوں کو اس کی باتیں بتائیں تو بیگم کہنے لگی۔

''کیا ضروری ہے کہ ہم یہاں سے گزریں''

''بالکل ضروری نہیں ہے، ہم ادھر دروازے سے اگلے مرحلے میں جا سکتے ہیں، مگر مزا نہیں آئے گا اور ایک اہم آیٹم مِس ہو جائے گی''

آخر سب نے فیصلہ دیا کہ اس راہداری سے گزرا جائے۔ ترتیب میں آگے میں تھا، پھر تینوں خواتین اور آخر میں تینوں لڑکے۔ نیم تاریک راہداری میں خوفناک سی آوازیں تھیں، مختلف کونوں کھدروں سے چڑیلیں حملہ آور ہوتیں تو خواتین کی چیخیں سی نکل جاتیں، مگر جب مَیں واپسی حملہ کا جھکاوا دیتا تو وہ چڑیلیں خوفزدہ ہو کر واپس کونوں میں دبک جاتیں۔ راہداری کے آخر میں کمرہ تھا، جس میں شیشے کے پیچھے پھانسی کا منظر تھا۔ ایک شخص کو پھانسی دی جا رہی تھی اور اُس موقع کے لحاظ سے ویسی ہی خوفناک سی آوازیں تھیں۔ تھوڑا آگے ایک شخص کی گردن ماری جا رہی تھی۔ گردن پر جب خوفناک کٹار گرتی تو گردن علیحدہ ہو جاتی، خون اُچھلتا اور خوفناک آوازیں اور خرخراہٹ سنائی دیتی۔ یہ دونوں ویڈیو مناظر تھے جنہیں شیشے کے پیچھے پیش کیا گیا تھا، مگر ماحول اور لائیٹس اور ساؤنڈ ایفیکٹ ایسے تھا جیسے بالکل اصل ہو رہا ہو۔ تھوڑا آگے جیک دی رپر "Jack the Ripper" سیریل کلر قید تھی۔

تھوڑا آگے نکلے تو وہاں ٹرین کا پلیٹ فارم تھا، جس کی چھوٹی سی ہر بوگی میں آمنے سامنے

دو دو بندوں یعنی چار اشخاص کی گنجائش تھی، ہم اس میں سوار ہو گئے۔ ٹرین آگے بڑھی تو وکٹمز آف فرنچ ریوولوشن (Victioms of French Revolution) یعنی آزادی فرانس کے قیدیوں کی خوفناک سزاؤں کا سلسلہ تھا۔ ایک بہت بڑی گولہ نما چیز پر لوہے کے بڑے بڑے کانٹے ابھرے ہوئے تھے اور قیدی کو اُس پر لٹا کر گھمایا جا رہا تھا۔ کانٹے اُس کے جسم میں پیوست تھے اور اُس کی دہشت ناک چیخیں دل دہلا رہی تھیں۔ ایک قیدی کا سر شکنجے میں کسا جا رہا تھا۔ اِسی طرح کے اور مناظر بھی تھے۔

ٹرین اور آگے بڑھی تو ہم پرانے لندن میں تھے۔ سڑک کے کنارے موچی جوتے مرمت کر رہے ہیں۔ دوکاندار سبزیاں بیچ رہے ہیں۔ کوئی ہار بیچ رہا ہے۔ لوہار اپنا کام کر رہے ہیں۔ مختلف اشیاء کی فروخت کے لیے ہانکیں لگ رہی ہیں۔ کنویں سے پانی نکالا جا رہا ہے۔ ہینڈ پمپ چلایا جا رہا ہے۔ لگتا تھا جیسے ہم ایک قدیم تہذیب میں پہنچ گئے ہوں اور اس کے کردار چل پھر رہے ہوں۔ ٹرین اسی طرح پہاڑی دروں اور بازاروں سے گزرتی ہوئی آخری سٹیشن میں داخل ہوئی تو ہم اتر پڑے۔

اب ہمیں خلا میں سفر کرنا تھا۔ جی ہاں، ہم ایک خلائی جہاز میں سوار ہو گئے۔ جس میں کِسی سنیما ہال کی طرز پر سیٹیں لگیں تھیں اور اُسی طرح کی مدہم روشنیاں تھیں۔ اُس ہال کی چھت اور دیواریں ٹرانسپیرنٹ پلاسٹک کی تھیں جن میں مکڑی کے جالے کی طرح کی لکیریں تھیں۔ ہم سے پہلے بھی کافی مسافر اس خلائی جہاز میں موجود تھے اور کچھ آ رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ بعد تھرتھراہٹ سی ہوئی۔ سامنے کی دیوار پر اور چھت پر بجلیاں سی چمکیں اور محسوس ہوا کہ ہم پرواز کر چکے ہیں۔ پھر کچھ ہی دیر میں ہم خلا میں تھے۔ مختلف ستارے نزدیک آتے جا رہے تھے۔

پھر ہم چاند کی طرف بڑھے۔ اپنے خلائی جہاز میں بیٹھے بیٹھے ہم نے چاند، عطارد، مریخ، زہرہ، مشتری، پتہ نہیں کون کون سے جہانوں کی سیر کی۔ سورج کی طرف بڑھے تو آگ کے

گولے نے چکا چوند پیدا کردی۔ اچانک ہمیں خلاء میں بلیک ہول (Black Hole) نظر آیا جس کی لپلپاتی آگ اور خوفناک گہرائی ستاروں کو اپنی طرف کھینچ کر اُن کو کھاتی جا رہی تھی۔ ہمارا جہاز بے اختیار اُدھر کھینچنے لگا اور ہمارے سانس رُکنے لگے، مگر شکر ہوا کہ بہت نزدیک جا کر جہاں سے بلیک ہول کی خوفنا کی نظر آ رہی تھی، ہمارے جہاز نے اچانک بلیک ہول کی کشش کا دائرہ توڑ دیا اور ایک سائیڈ کو نکل گیا اور ہم سب غرق ہونے سے بچ گئے۔ پھر آہستہ آہستہ بہت سی کہکشاؤں کی سیر کرواتا ہمارا خلائی جہاز واپس اُتر گیا تو سب نے سُکھ کی سانس لی۔ خلا کا یہ خوفناک، پُرخطر، مگر دلکش سفر اختتام کو پہنچا، چھت اور دیواریں روشنی سے محروم ہوئیں اور اندر کی مدہم لائیٹس جل اُٹھیں۔ سب کے ساتھ ہم نے بھی جہاز چھوڑ دیا۔

''توبہ ہے، لگدا اسی سچی مچی خلا وچ غرق ہون لگے آں''

''یعنی لگتا تھا سچ مچ خلا میں غرق ہو جائیگے'' بیگم نے تبصرہ کیا۔

یہ سب سماں ایسا تھا کہ آدمی اسے حقیقت کے سوا سمجھے تو کیا سمجھے۔ مادام تساد کا سارا میوزم ہی ایک حیرت کدہ ہے۔ ایک سیاح کو ارد گرد سے بچت کر کے اِسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ بلاشبہ اس کی ٹکٹ کافی دُکھتی ہے، مگر آخر میں محسوس ہوتا ہے کہ پیسے ضائع نہیں ہوئے۔ وہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ جِسے میں نے اختصار کے باعث بیان نہیں کیا۔ بہر حال جو بھی ہے لاجواب ہے۔

مادام تساد کے مومی عجائب گھر سے نکلے تو سبھی اُس کے تاثر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں اُنہیں لے کر ایک قریبی ریستوران میں چلا گیا۔ جِس دن سے آئے تھے سب کچھ گھر میں پک رہا تھا، مگر میں اُنہیں لندن کی دو مشہور ریڈی میڈ آئٹمز یعنی فش اینڈ چپس اور پیزا سے متعارف کروانا چاہتا تھا۔ میں نے وہاں دو عدد تِھن لیئر (Thin Layer) فل سائز پیزا بمعہ چیز، وجیٹیبل اینڈ چکن اور چکن نوگٹ کا آرڈر کیا۔ ساتھ میں ڈرنکس بھی سپلائی کیے جاتے تھے۔ میری بیگم جو پاکستان میں پیپسی کو ایک سزا سمجھتی تھی یہاں کی پیپسی بڑے شوق سے نوش فرماتی تھی۔ آرڈر سپلائی ہوا تو سب گرم گرم پیزا سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ بعد میں کافی نے اور فریش کر دیا۔ پھر ہم

لندن آئی (London Eye) کے لیے کل ٹھہرتے ہوئے جس کی ٹکٹیں میں مادام تساد کی ٹکٹوں کے ساتھ ہی پیکج کی صورت میں خرید چکا تھا۔

ٹکٹ گو 24 گھنٹے کے لیے تھے اور ہم اُنہیں اگلے دن پہلے ٹائم بھی استعمال کر سکتے تھے، مگر ہمارے پاس کافی ٹائم تھا اور سبھی میڈم تساد میوزم کی سیر سے خوش تھے اور اب کھا پی کر فریش محسوس کر رہے تھے۔ سو ہم نے اُسی دن اُس کے وزٹ کا پروگرام بنایا۔

میری بیگم بند جگہوں پر گھٹن کا شکار ہو جانے کے خوف میں مبتلا تھی۔ اسی لیے کسی عمارت میں لفٹ کے استعمال، جہاز کے سفر، انگلینڈ کے بند مکان، چھوٹے کچن اور باتھ روم، مکان میں صحن کا نہ ہونا، لندن میں انڈر گراونڈ ریلوے وغیرہ، سب سے خوفزدہ تھی، مگر اب وہ یہ تمام مرحلے سر کر چکی تھی اس لیے مجھے آسانی تھی۔

اس سیر کے پہلے روز جب اُس نے بس میں سفر کیا تو بہت خوش ہوئی۔ صاف ستھری چمکتی دمکتی بسیں۔ سٹاپ پر ایسی جگہ رکتی ہیں جہاں بس کے دروازہ کے پائیدان اور بس سٹاپ کی اونچائی برابر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک سیڑھی بھی اوپر نہیں چڑھنا پڑتی۔ سٹاپ سے سیدھے بس کے اندر۔ حتیٰ کہ بچوں والی عورتیں بچوں کی ٹرالی کو آرام سے چلا کر بس میں سوار ہو جاتی ہیں۔ میری بیگم کو پاکستان میں بس کا سفر پسند نہیں ہے، کیونکہ اُس میں پائیدان کے ایک دو سٹیپ (Step) چڑھ کر بس میں سوار ہونا پڑتا ہے جو اُسے اپنے بھاری جُثے کی وجہ سے مشکل محسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے میڈم نے مدتوں سے کار کے بغیر سفر نہیں کیا تھا، مگر یہاں ایسی کوئی مشکل نہ تھی۔

پھر جب میں اِسے پہلے دن انڈر گراونڈ کے سٹیشن پر لے کر گیا تو میں نے بڑے دونوں بچوں کو منع کر دیا کہ انہوں نے ماں کو یہ نہیں بتانا ہے کہ ہم اب زمین کے نیچے سفر کریں گے ورنہ اس نے انکار میں اڑ جانا ہے اور پھر کس کی جرأت ہے کہ اُس سے ہاں کروائے۔ زیادہ زور دیا تو رونے لگ پڑے گی جو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ چھوٹی بیٹی، بیٹا اور سسٹر، کیونکہ اس کے ساتھ ہی وارد ہوئے تھے اس لیے اُن سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ تو خود نئے تھے۔ اس لیے میں نے صرف

بڑے دونوں بیٹوں کو رازداری سے منع کر دیا تھا، کیونکہ وہ تقریباً دو ماہ سے لندن میں تھے اور یہ سب کچھ جانتے تھے۔

جب ہم انڈر گراؤنڈ ٹرین تک پہنچنے کے لیے آگے بڑھے تو ایلی ویٹر(**Elevator**) نیچے جا رہے تھے۔ یہ**Moveable** سیڑھیاں ہوتی ہیں جو مسلسل حرکت میں رہتی ہیں۔ اس پر سوار ہونے کے لیے اور اُترنے کے لیے ذرا سی پھرتی دکھانا ہوتی ہے تا کہ آدمی پاؤں تھڑکنے سے گر نہ جائے۔ میں بیگم کو باتوں میں لگائے وہاں لے آیا، مگر اب اُسے اُس**Elevator** پر سوار بھی تو کرنا تھا۔ ورنہ ساکت سیڑھیاں اُترنا پڑتیں اور ہم سب تھک جاتے۔ خیر میں نے اُسے بتایا کہ ہم نے دوسری عمارت تک جانا ہے اور بمشکل سہارا دے کر اُن سیڑھیوں پر سوار کرایا جو ہمیں نیچے لے گئیں۔ اسی طرح میں نے اُسے نیچے پہنچ کر سہارا دے کر اُتارا۔ وہ بمشکل گرتے گرتے بچی۔ وہ بڑبڑاتی رہی اور میں اُسے مختلف راہداریوں سے گزارتے ہوئے ٹرین تک لے گیا۔ سفر کے بعد ہم اگلے سٹیشن پر واپسی الیکٹرک زینے چڑھ کر اوپر پہنچے تو میری بیٹی اور چھوٹے بیٹے نے جو سب سمجھ چکے تھے یہ بھانڈا پھوڑ دیا اور ماں سے شغل کرنے لگے اور وہ شرمندہ سی ہنسی سے جواب دیتی رہی، مگر اس طرح اُس کا یہ خوف بھی ختم ہو گیا لیکن وہ مجھ سے نالاں ضرور تھی کہ میں نے چکر بازی کر کے اُسے پتہ نہیں چلنے دیا اور بڑے دونوں بیٹوں کو بھی ڈانٹ رہی تھی کہ

"تُسی وی پیو دے نال رل گئے او لندن آ کے"

"یعنی تم بھی لندن آ کر باپ کا ساتھ دینے لگے ہو"

وہ ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے اور ماں کو چھیڑ اور ستا رہے تھے۔ خیر اب ہم لندن آئی کے سامنے بڑے سے گراسی گراؤنڈ(**Grossy Ground**) میں بیٹھے تھے۔ لندن آئی جو کہ **135** میٹر بلند گول پہیہ ہے۔ جسے انگلینڈ کے انجینئر ز نے **7** سال کی محنتِ شاقہ کے بعد تعمیر کیا ہے۔ اسے دنیا کا سب سے بڑا مشاہدے کا پہیہ یعنی **"Largest**

"Observation Wheel" کہا جاتا ہے۔ یہ دریائے ٹیمز کے کنارے بنایا گیا ہے۔ جس سے دور دور تک دریا اور اُس میں بہتی کشتیوں کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ پہیہ (Wheel) بہت سے کمرہ نما High Tech Capsules پر مشتمل ہے۔ ہر کیپسول میں 25 آدمیوں کے سوار ہونے کی گنجائش ہے۔ اُس میں گدیلے بینچ بھی استادہ ہیں اور اسکی دیواریں شفاف پلاسٹک کی بنی ہیں۔ اس کیپسول میں بیٹھ کر جب آپ ٹاپ پر پہنچتے ہیں تو چاروں طرف سے لندن کا 25 میل کا ایریا آپ دیکھ سکتے ہیں۔

ونڈسر کا محل (Windsor Castle) اور ویسٹ منسٹر West Minister کا نظارہ خالی آنکھ سے بھی کیا جاسکتا ہے۔

یہ پہیہ ایک طرف سے آپ کو اُٹھا کر دوسری طرف آدھے گھنٹے میں اُتارتا ہے اور اس کی حرکت اتنی آہستہ ہوتی ہے کہ آپ کو اس کی حرکت محسوس بھی نہیں ہوتی اور آپ بے شمار نظارے دیکھتے ہوئے اور کیمرے میں قید کرتے ہوئے دوسری طرف اُتر جاتے ہیں۔

اِس پر چڑھنے اور اُترنے کی جگہ پر پلیٹ فارم ہیں اور یونہی محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کسی بحری جہاز پر سوار ہو رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق روزانہ 15 ہزار لوگ اس جگہ آتے ہیں۔ اس طرح گوروں نے لندن کی کشش میں ایک اور اضافہ کرلیا ہے۔ وہاں ایک پوری مارکیٹ اور بازار سجا ہے جہاں خرچ کرنے والوں کو بے شمار اشیاء دستیاب ہیں۔ بچے خوش تھے۔ انہوں نے بے شمار فوٹو کھینچے تھے۔ میں مطمئن تھا، مگر میری بیگم نے آئندہ کسی بھی ایسی جگہ کی سیر سے انکار کر دیا جہاں اتنی بڑی بڑی رقم کی ٹکٹیں خریدنا پڑیں۔ دراصل اُس نے میری بیٹی اور بہن سے آج کے خرچے کا پاکستانی کرنسی میں حساب کرالیا تھا جو کہ تقریباً 50000 روپے تھا۔ اسی وجہ سے بہت سی خوبصورت جگہیں اُن کے دیکھنے سے رہ گئیں۔

☞ ☞ ☞

برائٹن بیچ (Brighton Beach)

ممتاز کی بڑی پجیرو ہمارے نیچے تھی جِسے میرا ایک دوست شاہد ڈرائیو کر رہا تھا۔ ڈرائیونگ میرے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں تھی اور اب تو اور آسان ہوگئی تھی۔ ٹم ٹم کو گاڑی میں فٹ کرو اور اپنے مطلوبہ علاقے کا پوسٹل اڈریس ڈالو۔ ٹم ٹم کی مکینکل بی بی آپ کو وہیں سے ہدایات دینا شروع کر دے گی کہ دائیں یا بائیں (جو بھی منزل کی سمت ہو ادھر کا بتائے گی) کو چلو۔ اگلے چوک سے فلاں Exit لو............وغیرہ وغیرہ اور پھر آپ کو منزل پر پہنچا کر دم لے گی، مگر میں ڈرائیو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ان دنوں میری ذہنی حالت غیر مناسب تھی۔ پتہ نہیں ِکس وقت یادوں کے سمندر میں غرق ہو جاؤں اور میرے ساتھ دوسروں کی جانیں بھی خطرے میں پڑ جائیں اور پھر اسی شہر کی ٹریفک ہی نے تو میرے بھائی کی جان لی تھی۔

ممتاز مصروف آدمی تھا، اس لیے میں نے اپنے ایک اور دوست شاہد سے درخواست کی تھی کہ وہ ہمیں ڈرائیو کرے۔ یہ لڑکا مجھ سے کافی کم عمر تھا اور میرے آبائی شہر اوکاڑا سے تعلق رکھتا تھا۔ میرے ساتھ ہمیشہ بہت محبت سے پیش آتا۔ سو اِس وقت وہ ڈرائیو کر رہا تھا اور ہم 620 مربع میل میں پھیلے ہوئے یورپ کے سب سے بڑے شہر لندن میں سے گزر رہے تھے۔ یہ وہی لندن ہے جہاں الفہد فیملی کا Harrods ہے جِس میں دُنیا کی تقریباً ہر آئٹم دستیاب ہے، مگر اتنا مہنگا ہے کہ اُس میں داخل ہونا ہم جیسے اوسط درجے کے لوگوں کے لیے ایک آزمائش ہے، لیکن اسی لندن میں

Green Wich,Camden I Portobello Road اور بہت سے دوسرے علاقوں میں ویک اینڈ مارکیٹس(Weekend Markets) بھی لگتی ہیں جہاں سستی اشیاء مل جاتی ہیں۔ یہ وہی لندن ہے جہاں تقریباً 200 زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ وہی لندن ہے جس کی آج بھی میجر پرابلم(Major Problem) یہاں کی بے تحاشا ٹریفک ہے۔

اُس ٹریفک میں ہم رواں دواں تھے۔ میں بچوں کو ہائیڈ پارک، بکنگھم پلیس، ویسٹ منسٹر ایبے، بگ بین (Big Ban)، گرین پارک، سینٹ پال کیتھڈرل، ٹاور آف لندن (Tower of London) اوراس کے علاوہ اور کئی جگہ گھما چکا تھا۔ آج ہمارا رخ Sussex کاؤنٹی کے قصبے Brighton and Hove کی طرف تھا۔

بچوں کی خواہش تھی کہ اُنہیں لندن کا کوئی ساحلی مقام دکھایا جائے۔ بقول اُن کے

''بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ انگلینڈ چاروں طرف سے سمندر سے گھرا ہے، اس سے باہر نکلنے کا خشکی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور ہم اسکی سیر کے باوجود اسکا کوئی ساحلی مقام وزٹ نہ کر سکیں۔''

اُن کا یہ موقف یقیناً ٹھیک تھا، مگر میں لندن کے ساحلوں کو گھوم چکا تھا اور وہاں ہونے والی خرمستیوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ سو کافی حد تک آزاد خیال ہونے کے باوجود میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ بچوں کے کافی اصرار پر بالآخر مجھے فیصلہ کرنا پڑا۔ اِس کے لیے میں نے Brighton Beach کو چنا، جس کی طرف ہم اب رواں دواں تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ یہ کوئی Liverpool کی طرح کا شریف سا ساحل ہو بلکہ یہاں تو South of the easterly part of Kemptown بھی تھا جہاں Nudist Area موجود ہے، جس میں انڈر ویئر پہن کر گھومنے والے کو لوگ کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہیں، کیونکہ وہ خود سب قدرتی لباس میں ہوتے ہیں۔ اسی قصبے Brighton and Hove میں ہی تو ہر سال اگست میں "Gay

Pride"Carnival ہوتا ہے۔ جس میں انگلینڈ بھر، بلکہ دُنیا بھر کے ہم جنس پرست اکٹھے ہوتے ہیں۔یہی قصبہ تو The Gay Capital of Britain یعنی ہم جنس پرستوں کا دارالخلافہ کہلاتا ہے۔اسی قصبہ میں Winter Pride نامی اجتماع مارچ میں ہوتا ہے جس میں وہ خرمستی ہوتی ہے کہ خداپناہ، لیکن تضاد دیکھیں کہ اسی مادرزادآزاد ترین قصبے میں دو یونیورسٹیاں Universty of Sussex اور Universty of Brighton بھی ہیں جو تقریباً 40 ہزار سٹوڈنٹس کی گنجائش اور تعداد رکھتی ہیں۔اس وقت نہ مارچ تھا نہ اگست، اسی لیے میں نے اِس Beach کا قصد کیا تھا۔یہ بیچ میرا دیکھا بھالا تھا اور اس کا ایک ایریا ایسا بھی تھا جہاں سمندر تو تھا، مگر کناروں پر ریت نہیں تھی۔اسی لیے خیموں، ننگ دھڑنگ جسموں اور دھوپ سینکتے ننگے حُسن کی لشکاریں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ساحل چھوٹی چھوٹی وٹیوں (پتھروں) سے مزین تھا۔لوگ سمندر میں نہاتے ضرور تھے، مگر معقول کپڑوں کے ساتھ اور واپس آ کر اُن وٹیوں پر سستاتے تھے۔اس کے علاوہ گونا گوں دلچسپیوں اور کھیلوں سے مزین ایک عمارت بھی سمندر کے اندر تک گئی ہوئی تھی، جہاں عورتوں اور بچوں کی دلچسپی کے بہت سے سامان تھے۔ہم جیسے لوگوں کے لیے بیئر اور بار کا بھی انتظام تھا۔بہت سی دُکانیں فش اینڈ چپس اور برگر کی بھی تھیں جو وہاں کی مرغوب غذا ہے۔سو یہ ساحل کا شریف حصہ تھا جس کی سیر کا میں نے بیوی ،بچوں کے ساتھ پروگرام بنایا تھا۔

موسم انتہائی چمکدار تھا۔ہم جب بیچ (Beach) ایریا میں داخل ہوئے تو ہم نے سڑکوں کے کنارے پارکنگ کی جگہ پر بے شمار ہیوی موٹر سائیکل پارک دیکھے۔دراصل یہ اتوار کا دن تھا اور موسم کے بہترین ہونے کی رپورٹ کی وجہ سے بے شمار لوگ ساحلِ سمندر کا رخ کر چکے تھے۔مجبوراً ہم نے انتظامیہ کی طرف سے کئی کئی منزلہ تعمیر کی گئی پارکنگ گھومنی شروع کر دیں۔کئی پارکنگ لاٹ کے گیٹ کے اوپر نصب الیکٹرونک بورڈ پر ''پارکنگ فل'' کے الفاظ چمکتے ملے۔یہ

جدید نظام انگلینڈ میں میرے لیے نیا تھا، کیونکہ پہلے تو پوری پارکنگ کی کئی منزلہ عمارت گھوم کر جگہ نہ ملنے کی صورت میں واپس باہر گاڑی نکالنا پڑتی تھی، جبکہ اب گیٹ پر ہی پتہ چل جاتا تھا کہ جگہ ہے یا نہیں۔ کئی چکر کاٹنے کے بعد ہمیں ایک پارکنگ کے گیٹ پر "One place Available" کے الفاظ ملے تو شاہد نے فوراً گاڑی اندر ڈال دی۔ یہ جگہ بیچ سے کوئی آدھے میل کے فاصلے پر تھی۔ پارکنگ کے بعد ہم سب باہر نکلے تو پارکنگ فل کا بورڈ چمک رہا تھا۔

ہم ساحل پر پہنچ کر اُن ''وٹیوں'' پر بیٹھ گئے۔ سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور بہت سے لوگ جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ساحل سے تقریباً 100 گز کے ایریا میں نہا رہے تھے۔ نہا کیا رہے تھے بلکہ اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ کئی ایک ساحل سے 25-20 گز کے علاقے میں اپنے لباس گھٹنوں تک اُٹھائے انجوائے کر رہے تھے۔

مٹھو (اسد) مچل گیا اور کچھا (انڈر وئیر) پہن کر سمندر میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ شاہد اُسے لے کر سمندر میں اُتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد صرف میں اور بیگم رہ گئے باقی سب گھٹنوں تک پانی میں کھڑے تھے اور مٹھو اُن سے آگے کچھ گہرے پانی میں کئی گوریوں میں گھرا ہوا تھا جو اِس گول مٹول بچے کی حرکتوں سے محظوظ ہو رہی تھیں اور وہ انہیں خوش کر رہا تھا۔ بیٹا کِس کا تھا جگر............؟

''توبہ، بے شرمی دی وی کوئی حد ہوندی اے'' یعنی ''توبہ، بے شرمی کی حد ہوتی ہے''
یہ میری بیگم کی آواز تھی جواب پانی میں کھیلتے بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا کیا ہوا تو وہ کچھ نہیں کہہ کر بچوں کو ہی دیکھتی رہی۔ میں نے کچھ ارد گرد کھوج کی تو بات سمجھ میں آ گئی۔ ایک نوجوان جوڑا پانی سے نکل کر پتھروں پر چما چاٹی میں مصروف تھا جسے دیکھ کر بیگم نے درج بالا کمنٹس پاس کیے تھے، حالانکہ یہ ایک عام سا سین تھا، مگر میں کن اکھیوں سے بار بار اُنہیں

دیکھتا رہا جس سے بھنا کر بیگم بچوں کی طرف چلی گئی۔ یہی میں چاہتا تھا۔ میں فوراً جا کر ٹھنڈی بیئر کے نصف درجن کین لے آیا اور جلدی جلدی پینے لگا۔ تین کین (Can) پینے کے بعد میں نے شکر گزارانہ انداز میں اُس جوڑے کی طرف توجہ کی تو وہاں سین ہی اور تھا۔ وہ دونوں اب لیٹے ہوئے کسنگ کر رہے تھے۔ لڑکی کا پہلے ہی گھٹنوں تک والا سکرٹ تھوڑا اور اُٹھ گیا تھا اور اندر والا سب کچھ نظر آ رہا تھا، کیونکہ اُس نے انڈر ویئر وغیرہ کا تکلف نہیں کیا ہوا تھا۔ مَیں نے گھبرا کر اردگرد نظر ڈالی تو بیگم اور بچے گھٹنے گھٹنے پانی میں انجوائے کر رہے تھے اور میرے اردگرد کے لوگ اس جوڑے کے سین کو مکمل انجوائے کر رہے تھے۔ مَیں نے اطمینان کی سانس لی اور بیئر کا چوتھا کین کھول کر اُن کی حرکات سے لطف اندوز ہونے لگا، لیکن جلد ہی وہ جوڑا ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ اور منہ میں منہ ڈالے جانے کدھر کو چلا گیا۔

کچھ دیر بعد مجھے بھی پانی میں گھسیٹ لیا گیا۔ مَیں اُس وقت تک تمام بیئر ختم کر چکا تھا۔ پھر جب گھنٹہ بھر بعد ہم باہر نکلے تو سبھی تھک چکے تھے۔ شاہد، احمد اور مٹھو کے ساتھ جا کر ڈھیر ساری Fish and Chips لے آیا۔ کھانے کے دوران مٹھو نے ساحل کے کنارے ایک دو سیگل (سمندری پرندے) دیکھے تو اپنے چپس لے کر اُنہیں ڈالنے لگا تو وہاں وہ پرندے اکٹھے ہونے لگے۔ بس پھر کیا تھا۔ بیگم صاحبہ، سسٹر، بیٹی اور دوسرے بچے اپنے اپنے لفافے اُٹھا کر ادھر چل دیے، پرندے ناچتے رہے، اُن کے ہاتھوں پر بیٹھ کر چپس کھاتے رہے۔ کندھوں پر بیٹھتے رہے اور تصویریں بنتی رہیں۔ سبھی خوب لطف اندوز ہوئے۔ ہمارے گرد مجمع سا لگ گیا۔ کئی گوریاں بچوں کے ساتھ شامل ہو گئیں اور مَیں جامد سا بیٹھا انہیں دیکھا کیا۔

جب سبھی اس کھیل سے اُکتا گئے تو ہم بلڈنگ کی طرف چل دیے جہاں گونا گوں دلچسپیاں موجود تھیں۔ دھڑا دھڑ تصویریں اُتر رہی تھیں۔ آخر شاہد ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ جہاں چھوٹے بڑے بے شمار بھالو تھے۔ ایک گول لوہے کے بال سے آپ نے سامنے سلوب کے

دھالے پر رکھے بھی بت گرانے ہوتے ہیں۔آپ کو تین دفعہ ٹرائی کی اجازت ہوتی ہے۔اگر تین ٹرائی میں سب بت گر گئے تو بھالو آپ کا۔اس کی فیس ایک پونڈ فی گیم ہے جس میں 3 ٹرائیوں کی اجازت ہے۔شاہد مٹھو کے لیے کچھ بھالو حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر دو تین پونڈ ہار کر جب وہ کچھ حاصل نہ کر سکا تو مَیں نے اُسے کہا کہ پہلی دو ٹرائیاں تم کرو اور آخری ٹرائی کے وقت بال مجھے دے دو۔مَیں ماضی میں ان عام سی کھیلوں میں خود کو بُت شکن ثابت کر چکا تھا اور ایسے بھالو جیت کر اپنی کئی دوستوں کو خوش کر چکا تھا۔یہ تو کوئی بات ہی نہ تھی۔

اگلے آدھے گھنٹے میں ہمارے پاس چھوٹے بڑے بہت سے بھالو تھے اور اُن پانچ چھ دکانداروں نے میرے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا تھا۔مَیں نے تین میں سے پہلی ہی ٹرائی میں سارے بت گرائے تھے (بت شکن جو ہوئے) اور بڑا بھالو جیتنے کے ساتھ ساتھ اپنا پونڈ بھی واپس لے لیا تھا۔بچوں نے بے شمار تصویریں اُتاریں، بہت انجوائے کیا۔واپسی پر بھی بچے اسی ٹور کی باتیں کر رہے تھے۔شاہد بھی اُن کے ساتھ خوش تھا۔ایک مَیں تھا جو اُن سے علیحدہ ماضی میں کہیں گُم تھا۔اس بات کو کچھ دیر بعد ہی سہی، صرف میری بیگم نے محسوس کیا اور سچی بات ہے اُس کے علاوہ اور محسوس کرتا بھی تو کون............؟

☞ ☞ ☞

یہ بھی رخ ہے زندگی کے کھیل کا

میں اس وقت لندن ایسٹ کے علاقہ میں ایک ہیئر کٹنگ سیلون اور بیوٹی شاپ چلا رہا تھا۔ چلا کیا رہا تھا، بس گھسیٹ رہا تھا۔ یہ سیلون میرے رفیقِ کار اشفاق کی ذہنی اُپچ تھی۔ میں نے اس شاپ کی لیز کی شدید مخالفت کی تھی۔ کیونکہ میرے مطابق جو کام آپ خود نہیں سنبھال سکتے۔ اُس میں ہاتھ ڈالنا حماقت ہے۔ ملازم تو کسی وقت بھی کام چھوڑ کر آپ کو ہتھل کر سکتے ہیں سو آپ کو وہ کام خود بھی آنا چاہیے تاکہ نئے ملازم کی تلاش تک آپ کاروبار جاری رکھ سکیں۔ مگر موصوف اُن دنوں ایک بنگلہ دیشی بیوٹیشن کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تھے۔ جس کا قد اور ہاتھ پاؤں ہمارے ہاں کی 10 سالہ بچیوں کے برابر تھے اور شکل ہمارے ہاں کی اکثر بیوٹیشن کی طرح کی تھی۔ جوان اور شادی شدہ بچیوں کی ماں تھی۔ لندن میں وزٹ ویزے پر غیر قانونی طور پر کام کیلیے اُسے سہارے کی ضرورت تھی اور اشفاق نے اُسے عشق کی صورت میں اِس عمر میں بھی سہارا فراہم کر دیا تھا۔ میں نے اُس کا حلیہ وغیرہ تو بعد میں دیکھا، مگر اس داستانِ خواری سے پاکستان میں رہتے ہوئے بھی آگاہ تھا۔ اُن دنوں اشفاق اپنی دوسری بیوی جو کہ ایک مشہور اداکارہ کی ماں تھی کے سرمایہ سے لندن میں ایک سٹور چلا رہا تھا۔ وہیں مذکورہ بیوٹیشن ٹکرائی اور اشفاق نے اُس کے لیے سٹور کے آفس کے دروازے کو باہر گلی کی طرف تڑوا کر ایک بیوٹی سنٹر بنا دیا۔

جب اُس بنگلہ دیشی کا ویزہ ختم ہونے کے قریب آیا تو اشفاق نے میرے کہنے یا

مشورے کے مطابق اُسے واپس بنگلہ دیش بھجوادیا تاکہ وہ دوبارہ ویزہ لے کر آسکے۔ لیکن اس کی وجہ سے اشفاق اور اُس کی دوسری بیوی کے درمیان تنازعہ کی وہ بنیاد پڑ گئی جس سے اشفاق کو وہ سٹور چھوڑنا پڑا اور تعلقات نہ ہونے کے برابر رہ گئے۔ اب اشفاق پر نئے کاروبار کی دُھن سوار تھی اور وہ تھا کسی ہیئر کٹنگ اور بیوٹی سیلون کی لیزنگ۔ میں اپنی بات پر اڑا ہوا تھا، لیکن میری بدقسمتی آڑے آئی اور میرا بھائی انجم رؤف خان ایک ہفتہ کے وزٹ پر لندن پہنچ گیا۔ اشفاق نے اُسے اپنے زورِ بیان سے قائل کر لیا اور مجھے ہاں کرتے ہی بنی۔ مجھے انجم سے ہی پانچ لاکھ روپے ادھار لے کر رقم بھی بھیجنا پڑی۔ انجم واپس آ گیا اور اشفاق اُس دکان کے سودے میں جُت گیا۔ دو ہفتے بعد اچانک اس کا فون آیا۔

''جلدی پہنچو، مجھے تمہاری ضرورت ہے''

اگلے دس دن کے اندر وہ پاکستان میں تھا اور میں لندن میں، اُس نو لیز شدہ بیوٹی شاپ پر۔

اشفاق جاتے ہوئے 800 پونڈ کا موبائل کا بل، 800 پونڈ کا کریڈٹ کارڈ کا بل، 750 پونڈ کی غلط پارکنگ کی ٹکٹیں، 1000 پونڈ ایک ماہ کا کرایہ، کئی سو پونڈ کا کارپینٹر کا بل اور جانے کون کونسے بل چھوڑ کر جا چکا تھا اور میں ان بلوں میں گھن چکر بنا ہوا تھا۔ ملازم انتہائی مہنگے داموں تھے۔ لیڈیز سائیڈ پر ایک تقریباً 40-45 سالہ بقول خود ایک بیوہ تھی۔ اشفاق کے بقول اُسے آسانی سے پٹایا جا سکتا تھا، مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی کہ کسی کو پٹا کر اُس سے فری کام لیا جائے۔ پھول تو صرف سونگھنے یا گلے کی زینت بنانے کے لیے ہوتے ہیں اُن سے کمر کھجاؤ گے تو وہ بکھر جائیں گے اور یہ میڈم تو ویسے بھی گوبھی کا پھول تھی۔ 200 پونڈ تنخواہ لیتی اور 120-130 پونڈ ہفتے کے کما کر دیتی۔ اِسی طرح مردوں کی سائیڈ کا لڑکا 45 پونڈ روزانہ لیتا، روز 5 پونڈ کا کھانا بھی دکان کے ذمہ تھا۔ یوں وہ ہفتے میں 350 پونڈ ویجیز (wages) لے کر 450 سے 550 کے درمیان فی ہفتہ انکم دیتا۔ یوں جو تھوڑے بہت پیسے بچتے وہ دکان کے بلوں میں نکل جاتے اور شاپ کا کرایہ 1000 پونڈ ہر ماہ اِس آس پر پلے سے پڑتا کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔

رہائش کے لیے شاپ کے نیچے موجود تہہ خانے کی صفائی ستھرائی کی گئی تھی۔ اشفاق جاتے جاتے تہہ خانے میں ایگزاسٹ فین لگوا گیا تھا۔ سارا دن تہہ خانہ بند رہتا۔ رات کو اس کا دروازہ کھولتے تو دم گھٹتا، کیونکہ باہر شاپ کے گیٹ ریموٹ سے بند ہوتے تھے اس لیے اندر سے ریموٹ دبا کر بند کر دیئے جاتے اور میں تمام رات کے لیے تہہ خانے میں قید ہو جاتا۔ چند دن بعد ہی مجھے شائد مسلسل کم ہوا میں سانس لینے کی وجہ سے چکر آنے شروع ہو گئے اور بات ہسپتال تک جا پہنچی۔ تہہ خانہ کیا تھا ایک بڑی قبر تھی جس میں مَیں رات بھر قید رہتا۔ میں نے تمام عمر کسی بھی ملک میں نوکری کی، مگر اپنی ضروریات کا خیال ضرور رکھا تھا۔ اگر مجھے اس طرح کے حالات میں نوکری کرنا پڑتی تو میں کب کا جواب دے چکا ہوتا، مگر یہ سب مسائل میں بلا تنخواہ برداشت کر رہا تھا کہ یہ ہمارے یار نے اپنے عشق کے پیچھے مصیبت گلے ڈالی تھی۔ وسائل اور آمدنی بالکل نہیں تھی کہ کوئی مناسب رہائش لی جا سکتی اوپر سے پینڈنگ بلز، کرایہ، کونسل ٹیکس وغیرہ کے علاوہ زندگی میں پہلی بار شدید ترین تنہائی کا بھی شکار تھا۔ کال گرلز وغیرہ نہ میرا ٹیسٹ(Taste) تھا اور نہ ہی میں انہیں افورڈ کرتا تھا۔

ایک رات 11 بجے کے قریب میں نے فریج دیکھی تو دودھ ختم ہو چکا تھا۔ ہمارے نزدیک ہی ایک ٹُرکیوں کا سٹور تھا جو رات بھر کھلا رہتا تھا۔ میں نے ریموٹ کے ذریعے شاپ کا شٹر اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ سامنے دیکھا تو ایک انتہائی چمکتا دمکتا چہرہ نظر آیا۔ وہ سٹریٹ لائٹ کی مدہم روشنی میں بھی چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ میری نظریں اُسی پر گڑسی گئیں۔ اردگرد چہل پہل بالکل مفقود تھی۔ جب میں اس کے نزدیک پہنچا تو وہ مسکرا کر بولی

''ہائے ڈارلنگ! بزنس کرو گے''

"Hy darling! you want business"

میں اُس کی اس پیشکش پر تھوڑا سا حیران ہوا کہ کیا کلاس کی بیوٹی ہے اور سٹریٹ گرل ہے۔ میں نے شرارت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ باندھ دیئے تو حیران رہ گئی اور بولی۔

"What do you mean by this" یعنی'' تمہارا ایسا کرنے سے کیا

مطلب ہے

میں نے کہا ''تمہاری خوبصورتی کے آگے انکار کی جرات نہیں، مگر میرے لیے تمہاری رفاقت کی قیمت ادا کرنا ممکن نہیں، پلیز، ناز وانداز کے مزید تیر چلا کر مجھے رسوامت کرنا''

مجھے ایسے فقرے اور سٹائل انگریزی میں درجنوں آتے تھے اور ہر بار کارگر رہتے تھے۔ اس فقرے سے بھی شاید اُس کی کسی انا کو تسکین ملی۔ ہنستے ہوئی بولی

''اوہ پور گائے'' "Oh poor guy" یعنی اوہ غریب آدمی، ''یہ بزنس کا وقت ہے ورنہ میں تمہارے ساتھ کچھ وقت تفریح کے طور پر ضرور گزارتی۔ تمہارا سٹریٹ فارورڈ (Straight forward) انداز انوکھا ہے۔ اپنی کم مائیگی کا اس خوبصورت پیرائے میں بیان میرے لیے نئی بات ہے''

یہ کہہ کر وہ چل پڑی تو میں نے اِسی پیرائے میں چند فقرے کہتے ہوئے اُس کے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔ ٹُرکیوں کی دکان گزر گئی۔ جب ہم موڑ کے پاس پہنچے تو اُس نے مجھے بائے کہا اور موڑ مڑ گئی۔ میں بھی پلٹ پڑا۔

میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ جوتیوں کی ٹک ٹک کی آواز نکالتی وہ بھاگتی ہوئی واپس آئی اور آتے ہی مجھ سے چمٹ کر میرا بوسا لیا اور آہستہ سے بولی ''موڑ پر پولیس کی گاڑی آ رہی ہے اس لیے میں جو بھی کروں مائنڈ مت کرنا۔ پلیز ہیلپ می''

پھر اُس نے اپنا بازو میرے بازو میں ڈالا، سر میرے کندھے پر رکھا اور بولی

پلیز موو "Please move"

یوں ہم ایک محبت بھرے جوڑے کی طرح آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ ایک منٹ بعد ہی موڑ سے پولیس کی گاڑی نمودار ہوئی جو بالکل آہستہ سپیڈ کے ساتھ چل رہی تھی اور اُس میں بیٹھے پولیس آفیسر اور لیڈی آفیسر کی آنکھیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اُن کی اُچٹتی سی نظر ہم پر بھی آئی اور بس۔ جب گاڑی بہت آگے نکل گئی تو اُس نے میرے کندھے سے سر اُٹھایا اور

میرا دوبارہ بوسہ لیتے ہوئے بولی۔

''شکریہ جناب، دراصل میرے پاس لائسنس نہیں ہے اور پھر اِس طرح سٹریٹ ہنٹنگ(Street Hunting) کی اجازت بھی نہیں ہے۔ گو میں یونیورسٹی کی فیس کا خرچہ پورا کرنے کے لیے پچھلے کئی ہفتوں سے اس بزنس میں ہوں مگر پوری چالاک ہوں، ایک دفعہ بھی پکڑی نہیں گئی''۔

میں نے کہا''میرا دل چاہتا ہے پولیس واپس آ جائے''

وہ جلدی سے بولی''ارے وہ کیوں''

''تا کہ میں کچھ دیر اور جنت میں رہ سکوں''

میں نے کہا تو وہ چپ سی ہوگئی۔ پھر بولی

''اب میں کہوں گی کہ میری روزی کا وقت ہے ایسی باتیں کر کے پلیز مجھے رسوا مت کرو''

میں نے ایک لمبی سانس لی اور مسکرا کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ مجھ سے مصافحہ کر کے خاموشی سے آگے بڑھ گئی اور موڑ مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ میں نے ایک ایسی لڑکی کو دیکھا جو کہ اپنی یونیورسٹی کی فیس کے لیے یہ پیشہ کر رہی تھی۔ میں پہلے بھی کئی لڑکیوں سے متعارف ہو چکا تھا جو ایک سمیسٹر پاس کر کے اگلے سمیسٹر کو مس کر دیتی تھیں اور اُس میں کام کر کے فیس جمع کر کے اُس سے اگلا سمیسٹر پڑھتی تھیں۔ اُن میں سے ایک آدھ کو تو بعد میں مَیں نے بہت اچھی جاب پر بھی دیکھا۔ دراصل انگلینڈ میں سکول لیول تک تعلیم فری ہے۔ اس کے بعد بھاری فیس کے ذریعے ہی تعلیم جاری رکھی جا سکتی ہے۔ گو غیر ملکی سٹوڈنٹس کے مقابلے میں یہ فیس بہت کم ہوتی ہے، مگر پھر بھی خاصی ہوتی ہے۔ جس وقت بچی یا بچہ سکول سے فارغ ہوتے ہیں وہ عموماً 16 سال کراس کر جاتے ہیں اور خودمختار ہوتے ہیں۔ اوسط درجے کے یورپین لوگوں میں اس کے بعد والدین فرائض سے مبرا ہو جاتے ہیں۔ بچے بھی اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے ہیں اور فرائض خود سنبھال لیتے ہیں جو

کہ عموماً اُن کی ذات تک محدود ہوتے ہیں۔ اس میں اُن کا والدین کی خدمت کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اکثر عام یورپین گھرانوں میں شادی بیاہ تک کے مسئلہ میں لڑکا یا لڑکی والدین سے رائے لینا بھی ضروری خیال نہیں کرتے اور بہت سے تو اپنے بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ کے ساتھ شادی کے بغیر رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ والدین سے تعلق صرف مدر ڈے اور فادر ڈے پر کارڈ بھیجنے تک محدود ہو جاتا ہے۔ ہاں کرسمس پر میں نے اکثر لوگوں کو والدین سے ملتے دیکھا ہے۔

ایسا سب میں نہیں ہوتا۔ گو کہ اُن کی تعداد کم ہے مگر پھر بھی کافی تعداد میں انگریز خاندانوں میں ہمارے ایشین لوگوں کی طرح والدین بچوں کا سارا بار اٹھاتے ہیں، مگر یہ عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اپنا جانشین چاہیے ہوتا ہے۔ اپنی دولت و جائیداد اور نام و نمود کے لیے۔ وہاں عام ایشین گھرانوں میں بھی بچے اعلیٰ تعلیم اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ اب یہ اُن کی تربیت، ماحول یا ذہنی اپروچ پر ہے کہ انہیں کیسی محنت کرنا ہے اور کیا بننا ہے، لیکن اکثر لوگ اپنے اس دور میں جو بھی کریں، اچھے مستقبل کو حاصل کر کے میں نے انہیں اپنے اُس سابقہ دور کے متعلق شرمندہ بالکل نہیں پایا۔ چاہے انہوں نے چھوٹی چھوٹی نوکریاں کی ہوں یا پھر جسم فروشی۔

مخصوص کورسز میں بنک بھی سٹوڈنٹس لون مہیا کرتے ہیں جن کی شرائط عام قرضہ سے بہت نرم ہوتی ہے جو کہ سٹوڈنٹ آہستہ آہستہ کر کے اتارتا رہتا ہے۔ یوں اُسے ابتدا سے ہی ایک زنجیر میں باندھ لیا جاتا ہے، کیونکہ عدم ادائیگی کی صورت میں اُس کی کریڈٹ ہسٹری خراب ہو جاتی ہے جو اُس کی آئندہ کی کامیاب زندگی کی دوڑ میں رکاوٹ بنتی ہے اُسے کار چاہیے، مکان چاہیے یا کچھ اور، یہ خراب کریڈٹ ہسٹری اُس کے لیے مصیبت بن جائے گی۔ سو اکثر سٹوڈنٹ جیسے بھی ہو اپنے بل بوتے پر ہی فیس بناتے ہیں جیسا کہ وہ خوبصورت لڑکی کر رہی تھی۔

☞ ☞ ☞

ایک پارٹی

میں پچھلے کئی ہفتوں سے اندرونی و بیرونی طور پر ایک بحرانی سی کیفیت سے دوچار تھا۔ بیوٹی شاپ کا مردانہ پورشن(Portion) بند پڑا تھا۔زنانہ پورشن والی میڈم کو سوائے باتوں کے شاید کچھ نہیں آتا تھا اس لیے وہ بھی کئی مہینے یہاں کام کرنے کے باوجود اپنے مستقل کسٹمرز نہیں بنا سکی تھی۔روڈ پر کالوں اور گوروں کے لیے علیحدہ علیحدہ بھی دوکانیں موجود تھیں۔اس کے علاوہ ایک پرانی ایشین ہیئر کٹنگ شاپ بھی تھی۔ جہاں کے مستقل کسٹمرز کہیں اور نہیں جاتے تھے۔عید آ رہی تھی اور ہمارے مرد ورکر کو کہیں سے بہتر آفر ہوئی تو وہ اگلے دن کام سے غائب تھا۔رابطہ پر پتہ چلا کہ وہ نہیں آ رہا۔اشفاق نے اُسے کام پر رکھتے ہوئے روٹین کے مطابق ایک ہفتہ کی تنخواہ بھی زرِضمانت نہیں رکھی تھی۔ جو کہ مالک عموماً اس لیے رکھتے ہیں کہ ورکر اس طرح اچانک جواب نہ دے سکے اور اُسے کم از کم ایک ہفتے کا نوٹس مالک کو دینا پڑے۔میرا وہ خدشہ درست ثابت ہو رہا تھا کہ اگر آپ کو خود کام نہ آتا ہو تو ایسا بزنس ہم جیسے لوگوں کو نہیں کرنا چاہیے جن کے وسائل اور واقفیت محدود ہوتی ہے۔ پچھلے پندرہ دن میں میں لندن کے تقریباً آدھے ہیئر کٹنگ سیلون کا یا تو ورکر کی تلاش میں وزٹ کر چکا تھا اور یا پھر اُن سے فون پر رابطہ کر چکا تھا،مگر نتیجہ ندارد۔عید کی آمد آمد کی وجہ سے ایسے ورکر بھی جن سے مالک تنگ تھے اور اُن کی چھٹی کروانا چاہتے تھے،اب وہ اُن کو چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔

ہمارا سابقہ ورکر ایک سٹوڈنٹ تھا جو باقاعدہ ہفتے میں دو دن کلاس اٹینڈ کرتا تھا۔اُن دنوں میں آدھے دن کے لیے دوکان بند رکھنا پڑتی تھی۔ بقول اُس کے وہ خاندانی باربر نہیں تھا اور اُس نے ہیئر کٹنگ انگلینڈ آ کر سیکھی تھی۔سٹوڈنٹ ویزے پر تھا اور اپنے اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ فیملی کو بھی سپورٹ کرتا تھا۔ پاکستان سے آئے ہوئے سٹوڈنٹس کی اکثریت کو میں نے اِسی طرح کرتے دیکھا تھا اور بہت سوں کے انٹرویو کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اُن کی فیملیز (Families) دراصل اُن کے اخراجات برداشت کرنے کی حیثیت نہیں رکھتیں تھیں۔ جیسے تیسے جھوٹے سچے کاغذات لگا کر ویزہ صرف اس لیے حاصل کیا جاتا تھا کہ بچہ بس انگلینڈ پہنچ جائے پھر لہریں بہریں ہو جائیں گی۔ یہاں آ کر بچہ بیچارہ مصیبت میں پھنس جاتا تھا،مگر آفرین ہے کہ میں نے بہت ہی کم لوگوں کو اپنی فیملی سے باغی پایا ورنہ اکثریت کو تو ادھار اُٹھا کر اور ڈبل ڈبل شفٹ میں کام کر کے پیسے اکٹھے کر کے پاکستان میں فیملی کی ضروریات پوری کرتے دیکھا۔

انگلینڈ میں غیر ملکی سٹوڈنٹ کو بھاری فیس کے عوض داخلہ ملتا ہے جو کہ مقامی لوگوں کے مقابلہ میں دوگنی کے قریب ہوتی ہے۔قانونی طور پر غیر ملکی سٹوڈنٹس(Students) کو ہفتہ وار زیادہ سے زیادہ تقریباً20 گھنٹے کام کی اجازت ہوتی ہے۔اُن کو باقاعدہ نیشنل انشورنس نمبر جاری کیا جاتا ہے اور اُن کی سیلری(Salary) سے باقاعدہ ٹیکس کی کٹوتی کی جاتی ہے۔چھٹیوں کے دنوں میں البتہ وہ فل ٹائم جاب کر سکتے ہیں۔اِسی طرح اُن کو ڈاکٹر کے پاس رجسٹریشن کی سہولت بھی موجود ہوتی ہے۔ بیماری کی صورت میں وہ وہاں سے فری معائنہ کروا سکتے ہیں۔سٹوڈنٹ کا ویزہ تبدیل ہو سکنے والی قسم(Changeable Catagory) کا ہوتا ہے۔سوکئی ایک سٹوڈنٹ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد وہاں جاب ڈھونڈھ کر ورک پرمٹ ایشو کروا لیتے ہیں۔اِسی طرح بعض سٹوڈنٹ پڑھائی جاری رکھنے کے بجائے وہاں کوئی لڑکی ڈھونڈھ کر اُس سے نکاح کر لیتے ہیں اور Status تبدیل کروا لیتے ہیں۔اِس صورت میں مَیں نے کئی ایک کو بیواؤں،طلاق شدگان

اور بچوں والی عورتوں سے بھی نکاح کرتے دیکھا ہے۔ایک سروے کے مطابق انگلینڈ کے ایجوکیشن ادارے انگلینڈ کی (Economy) میں دوسرے نمبر پر ہیں۔گویا یہ ایک باقاعدہ صنعت ہے۔

میں ورکر کی تلاش میں تھا کہ میرے پاس آزاد کشمیر کا رہائشی لڑکا آیا جو کہ میرج ویزے پر انگلینڈ آیا تھا۔ وہ باربر کا کام جانتا تھا، مگر انگریزی سے نابلد تھا۔ میں نے اُسے ٹرائل پر رکھ لیا۔ اچانک پاکستان میں میرے دوست اور پارٹنر اشفاق صاحب اپنی دوسری بیوی کی وجہ سے قانونی گرفت میں آ گئے۔کیس کا تعلق چونکہ اُس پیسے سے تھا جو اُن کی بیوی نے انہیں پاکستان سے انگلینڈ بھیجا تھا سو یہاں انگلینڈ میں مجھے بہت زیادہ بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔اِس دوران لندن کے انڈر گراؤنڈ ریلوے اور بسوں میں بہت سفر کرنا پڑا۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔

تقریباً پورے لندن شہر کے نیچے انڈر گراؤنڈ ریلوے کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔جس کی سروس انتہائی Organized ہے۔جیسا کہ ہمارے ہاں زمین کے اوپر ریلوے پٹری ہوتی ہے، ویسے ہی وہاں زمین کے نیچے ڈبل ٹریک ریلوے لائن بچھی ہوئی ہے۔ باقاعدہ پلیٹ فارم ہیں۔ نیچے آپ کو جگہ جگہ گائیڈ کرنے کے لیے نشان، نقشے اور ہدایات ملیں گی جن کی وجہ سے ایک انگریزی سے نابلد آدمی بھی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔کئی ریلوے اسٹیشن زمین میں سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں ہیں جہاں نیچے جانے اور اوپر آنے کے لیے پتھریلی سیڑھیوں کے علاوہ "Elevators" بھی لگے ہوئے ہیں۔اُن پر آپ کو صرف کھڑے ہونا ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں، اوپر جانے والے بھی اور نیچے آنے والے بھی۔

ٹرینوں کی آمد ایک آدھ منٹ کے فرق سے تقریباً وقت پر ہوتی ہے اور وقت پر منزل پر پہنچاتی ہے۔اسی لیے کروڑ پتی بزنس مین اور بہت بڑے آفیشل بھی اپنی گاڑی کی بجائے انڈر گراؤنڈ کے سفر کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ زمین کے اوپر تو صبح آفس ٹائم اور پچھلے پہر چھٹی کے وقت پورے لندن میں جگہ جگہ ٹریفک جام کے مناظر ملتے ہیں۔آج بھی لندن شہر کی کونسل کا سب سے بڑا مسئلہ ٹریفک کے اژدہام کو کنٹرول کرنا ہے۔

ٹرین اور بس کے لیے ٹکٹ مختلف سٹورز اور نیوز پیپر ایجنٹس کے پاس دستیاب ہوتے ہیں۔اُن کو محکمے نے سپیشل چھوٹی مشینیں مہیا کر رکھی ہوتی ہیں۔اُن سے آپ اپنی منزل بتا کر متعلقہ قیمت ادا کر کے ٹکٹ لے سکتے ہیں۔ اسٹیشن پر نیچے پہنچتے ہی پلیٹ فارم پر پہنچنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے بیریئر لگا کر راستے بند کیے ہوتے ہیں اور جن چھوٹے ستونوں کے ساتھ بیریئر فٹ ہوتے ہیں اُن میں بنک کی ATM مشین کی طرح آپکا ٹکٹ ڈالنے کے لیے جگہ بنی ہوتی ہے۔ٹکٹ اس میں ڈالتے ہی وہ مشین اسے پڑھ کر دوسری طرف نکال دیتی ہے اور بیریئر کھول دیتی ہے۔آپ اپنا ٹکٹ (جو کہ ایک گتے کا کارڈ ہوتا ہے) پکڑیں اور گزر جائیں۔ بیریئر پھر بند ہو جائیگا۔

آپ اگر روزانہ سفر کرتے ہیں تو آپ ہفتہ بھر کا، دو ہفتے کا یا مہینہ بھر کے لیے بھی ٹکٹ خرید سکتے ہیں۔آپ جتنی زیادہ مدت کے لیے یہ ٹکٹ ایڈوانس خریدیں گے اتنا ہی سستا پڑے گا اور پھر اُس مدت میں آپ جتنا مرضی سفر کریں آپ کو کُھلی چھٹی ہے۔اس ٹکٹ کی چیکنگ کے لیے درج بالا بیریئر کے ستونوں کے ساتھ ایک سکینر (Scaner) کی طرح کا حساس حصہ بنا ہوتا ہے۔ آپ اپنا ٹکٹ اُس کے ساتھ چسپاں کریں تو وہ اُسکا بارکوڈ (Bar Code) اور اُس کے ذریعے اُس کی Validity اور Value پڑھ کر بیریئر کھول دے گا۔ایسا ہی سکینر سسٹم بسوں میں ڈرائیور کے پاس ایڈجسٹ مشین میں بھی ہوتا ہے۔

انڈر گراؤنڈ ریلوے کے ہر پلیٹ فارم پر الیکٹرک بورڈ ہوتے ہیں جو آپ کو لحہ بہ لحہ بتاتے رہتے ہیں کہ کون سے نمبر یا نام کی ٹرین آ رہی ہے، یہ کدھر کو جائے گی اور کس وقت اسٹیشن میں داخل ہوگی، تا کہ مسافر تیار رہیں۔ٹرین کا سٹاپ بمشکل ایک آدھ منٹ کا ہوتا ہے۔ یہ بورڈ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس کے کتنے منٹ بعد کون کونسی ٹرینیں آئیں گی، اس طرح یہ ایک مکمل باضابطہ نظام ہے جو آپ کے وقت اور پیسے کی بچت کرتا ہے۔اس نظام کے تحت روزانہ لاکھوں لوگ انڈر گراؤنڈ میں سفر کرتے ہیں۔

زمین کے اوپر بسوں کا نظام ہے۔ یہ بھی ایک بہت Organized نظام ہے۔ جگہ جگہ سڑکوں پر مناسب فاصلہ دے کر بس سٹاپ بنے ہوتے ہیں۔ بسوں کو ان سٹاپ کے علاوہ راستے میں سے مسافر بٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ بس سٹاپ کی سطح اُس لیول پر بنائی جاتی ہے کہ بس کا پائیدان بالکل اُس کے ساتھ جڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے بوڑھے لوگوں کو بھی بس میں چڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اسکے علاوہ مائیں جنھوں نے بچوں کو بے بی ٹرالی میں لٹا رکھا ہوتا ہے اُن کی ٹرالی بآسانی بس میں داخل ہو جاتی ہے۔ چمکتی دمکتی صاف ستھری بس سڑک پر رواں ہو جاتی ہے۔ بعض بسوں میں باقاعدہ اناؤنسمنٹ کا انتظام ہوتا ہے اور ڈرائیور آنے والے سٹاپ کے متعلق مسافروں کو پہلے آگاہ کر دیتا ہے تاکہ وہ تیار رہیں۔ ایسا عموماً ڈبل ڈیکر (ڈبل سٹوری) بسوں میں ہوتا ہے جن کا لندن کی تنگ سڑکوں پر چلنا ہی اُن کے ڈرائیوروں کی مہارت اور اُن کے ٹریفک نظام کی خوبی ہے۔ بس میں ڈرائیور کے پاس مشین لگی ہوتی ہے جو ایڈوانس خرید کردہ ٹکٹوں کو سکین کر کے چیکنگ کر کے ڈرائیور کے سامنے چھوٹی سکرین پر بتاتی ہے کہ اس ٹکٹ کا Status کیا ہے اور ساتھ میں جن کے پاس ٹکٹ نہیں ہوتے ڈرائیور پیسے لے کر انہیں ٹکٹ بھی اس مشین سے مہیا کرتا ہے۔ ایسا بس میں داخل ہوتے ہی ہوتا ہے، کیونکہ بس میں داخلہ صرف ڈرائیور سائیڈ سے ہوتا ہے اور اترنے والے پچھلے دروازے سے اترتے ہیں۔ اس عمل کے دوران دوسرے مسافر صبر سے بس کے باہر لائن لگا کر انتظار کرتے ہیں۔ ان بسوں میں کنڈکٹر نام کا کوئی کریکٹر نہیں ہوتا۔ بس میں ستونوں کے ساتھ بھی سرخ رنگ کے بٹن لگے ہوتے ہیں جس کے پریس کرنے پر ڈرائیور آگاہ ہو جاتا ہے کہ اگلے سٹاپ پر کوئی مسافر اترے گا۔

بسوں میں بوڑھے اور بزرگ مسافروں کے لیے سیٹیں مخصوص ہوتی ہیں جو دوسرے لوگ بھی استعمال کر لیتے ہیں، لیکن کسی بزرگ کی آمد پر احترام سے سیٹ چھوڑ دیتے ہیں۔ بسوں یا ٹرینوں میں بیٹھنے کے لیے مرد یا عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ آپ کے ساتھ اگر سیٹ خالی ہے

تو کوئی بھی عورت یا حسینہ بڑی بے تکلفی سے آپ کے ساتھ براجمان ہو جائے گی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ آپ کی طرف دیکھے بھی نہیں۔ انڈر گراؤنڈ کی تو خیر بات ہی چھوڑیں، بسوں میں بھی رومانوی جوڑے اپنا چُما چاٹی کا کام کرتے رہتے ہیں۔ زمانہ اُنہیں دیکھتا رہے، مگر وہ خود کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

میں اشفاق کی کاغذوں کے ذریعے امداد کے لیے انہی بسوں اور ٹرینوں میں دھکے کھا کر، مختلف مقامات پر لوگوں سے مل کر، کاغذی ثبوت وغیرہ اکٹھے کر رہا تھا۔ اشفاق کا سگا بھائی ممتاز بھی چونکہ اُس سے ناراض تھا اس لیے وہ زیادہ Activity نہیں دکھا رہا تھا اور اُس سے ملاقات کے لیے بھی مجھے خود ہی جانا پڑتا تھا تا کہ اُس کی مدد حاصل کر سکوں۔ اُس تک پہنچنے کے لیے بھی مجھے مختلف بسیں اور ٹرینیں بدل کر اور کچھ پیدل چل کر پہنچنا پڑتا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگتا۔ بلآخر میں نے کافی کچھ اکٹھا کر کے اشفاق کو بھیج دیا، لیکن اس میں تقریباً مہینہ بھر صرف ہو گیا، کیونکہ جن لوگوں سے کام تھا وہ لوگ اشفاق کی زبان کے خنجروں سے زخمی تھے اور مجھے اپنی زبان سے مرہم کا کام لے کر اُن سے کام نکلوانا تھا۔ ممتاز بھائی سے سخت ناراض تھا، مگر میری دوستی میں اُس نے بھی بادلِ نخواستہ میری بہت مدد کی اور مجھے بھی بار بار سب سے ملاقاتیں کرنا پڑیں۔ اس کہانی کا دلچسپ پہلو وہ تبصرہ ہے جو اشفاق نے عارضی طور پر جان چھوٹ جانے کے بعد لندن آ کر کیا۔ کہنے لگا۔

"کیا کیا ہے تم نے؟ صرف چند لوگوں کی منتیں ہی تو کیں ہیں۔"

خیر، درج بالا جھمیلوں میں عید بھی گزر گئی اور اب کرسمس کے دن چل رہے تھے۔ کرسمس کے دنوں میں ہر چھوٹا بڑا کاروباری اور خصوصاً دوکاندار بہت مصروف ہو جاتے ہیں۔ کرسمس ٹری، کرسمس کارڈ، کرسمس گفٹ وغیرہ بہت بِکتے ہیں، ہر طرح کی اشیاء پر خصوصی Discount شروع ہو جاتی ہے۔ یہ دن اصل میں سال کے آخری دن ہوتے ہیں اس لیے بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی اشیاء کو آدھے داموں تک فروخت کے لیے پیش کر دیتی ہیں تا کہ سٹاک Dispose ہو اور

وہ نئے سال میں نئے ماڈل مہنگے داموں فروخت کے لیے پیش کر سکیں۔اس لیے الیکٹرونکس اشیاء سے ہاؤس ہولڈ اشیاء تک پر لُوٹ سیل لگ جاتی ہے۔یوں بہت سے برطانوی اگر کسی چیز کی تمنّا رکھتے ہیں تو پیسے جمع کرتے رہتے ہیں اور کرسمس کا انتظار کرتے ہیں۔اس طرح کرسمس پر خریداری میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔کرسمس اُن لوگوں کی عید ہوتی ہے اور عید پر واقعتاً غرباء بھی من مرضی کی اشیاء پر اپنی دسترس محسوس کرتے ہیں۔جس سے اُن کی عید کی خوشیاں دوبالا ہو جاتی ہیں۔

کرسمس سے نیوائیر تک لمبی چھٹیاں چلتی ہیں جن میں والدین کو بھولے ہوئے بچے بھی تحائف لے کر والدین سے ملنے آتے ہیں چاہے وہ ملاقات اولڈ پیپلز ہاؤس میں ہی کیوں نہ ہو۔ ایک دوسرے کو کرسمس کارڈ بھیجے جاتے ہیں۔گھروں کی کھڑکیوں میں رنگ برنگے کرسمس ٹری سجائے جاتے ہیں۔بچوں کی بہت سی فرمائشیں پوری کی جاتی ہیں۔گویا خوب ہلا گلا ہوتا ہے۔

کرسمس کے اگلے دن سے سڑکوں پر سناٹا چھا جاتا ہے۔لوگ عزیزوں،رشتہ داروں سے ملنے کے لیے جاتے ہیں۔نوجوان جوڑے انجوائے کرنے کے لیے شہر کو چھوڑ کر مضافاتی علاقوں(Country Side) میں نکل جاتے ہیں جہاں سے اُن کی واپسی پھر نیوائیر سے ایک آدھ دن قبل ہی ہوتی ہے جسے وہ شہر کی رنگینیوں میں انجوائے کرتے ہیں اور بذاتِ خود اس رنگینی میں اضافہ کرتے ہیں۔31دسمبر کو رات 12 بجے وہ ہلا گلّا ہوتا ہے جسے لوگ مدتوں یاد رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں تو فائر ورک(Fire Work) کا وہ شاندار مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ اُن دنوں میں موسم کی شدت کے باوجود فرزانے،دیوانے اور مستانے سب رقص کرتے ہیں۔خوب پیتے ہیں،شور مچاتے ہیں اور یوں کُھلے دل سے نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

ایک دن مجھے سلیم کا فون موصول ہوا۔یہ آدمی میرے آبائی شہر اوکاڑا سے تعلق رکھتا ہے اور لندن میں سرے "Surray" کے علاقہ میں ہلٹن ہوٹل سے بطور شیف وابستہ ہے۔یہ جب ورک پرمٹ پر لندن آنے کی ٹرائی میں تھا تو ویزا پراسس"Visa Process" میں اور

انٹرویو کے وقت جو معلومات مجھ سے ہوسکیں میں نے اسے مہیا کیں۔اس کے علاوہ لندن پہنچ کر بھی اس نے مجھ سے پاکستان میں رابطہ رکھا اور یہاں کی زندگی میں آگے بڑھنے، بینکوں سے ڈیلنگ، ڈرائیونگ لائسنس کے حصول وغیرہ کے متعلق گائیڈ لائن لیتا رہا۔غرضیکہ اُسے جب بھی ضرورت پڑتی مجھ سے رائے ضرور لیتا۔اس کے علاوہ بھی گاہے بگاہے اُس نے رابطہ رکھا اور اب جبکہ میں دوبارہ لندن میں تھا تو وہ آ کر مجھے مل بھی گیا تھا۔اُس سے تقریباً روزانہ فون پر بات بھی ہوتی تھی۔کہنے لگا۔

''بھائی، پارٹی کی تاریخ تو یاد ہے ناں؟''

''یار! یاد تو ہے مگر تمہیں پتا ہے میں بہت بھاگ دوڑ میں رہا ہوں اور طبیعت بھی بَس پٹھان سی ہو رہی ہے''

''لیکن بھائی آپ کو ہر حال میں آنا ہے، کیونکہ میری طرف سے صرف آپ گیسٹ ہیں اور میں نے آپ کی انٹری فیس دے کر کارڈ بھی حاصل کر لیا ہے۔میرے بہت سے دوست اور Mates بھی آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں''۔

مجھے وعدہ کرنا پڑا۔یہ پارٹی ہلٹن ہوٹل کی انتظامیہ ہر سال کرسمس اور نیو ایئر کی خوشی میں اپنے ملازمین کے لیے منعقد کرتی ہے۔جِس میں ملازمین مہمان ہوتے ہیں۔کسیِ اور ہلٹن ہوٹل کی برانچ سے عملہ آتا ہے جو تمام انتظام سنبھال لیتا ہے اور سرو کرتا ہے۔اس پارٹی میں چھوٹے بڑے تمام ملازمین شامل ہوتے ہیں اور انہیں ایک دو مہمانوں کو بھی مدعو کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔جِس کے لیے باقاعدہ اندراج کروا کر معمولی سی فیس ادا کرنا ہوتی ہے۔اس طرح اُن کو مہمانوں کی تعداد کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ اُتنا ہی انتظام کرتے ہیں۔

ہلٹن ہوٹل کی یہ برانچ شاید لندن میں سب سے بڑی برانچ ہے، کیونکہ اس کے ساتھ سینکڑوں ایکٹر میں پھیلے ہوئے گراؤنڈز بھی ہیں۔جہاں ہیلی کاپٹر کے اترنے کا بھی انتظام ہے۔

روایتی قسم کے لارڈز اور امراء کے لیے بھی پورشن مخصوص ہے۔ پتہ چلا کہ اُس میں اُن کی چیس (شطرنج) پارٹی کئی کئی دن چلتی ہے۔ یہ برانچ سرے کے علاقہ میں ہے جو کہ لندن کے دوسرے بڑے ائیر پورٹ Gatwick کے پاس کا علاقہ ہے۔لندن کا Country Side یعنی مضافاتی علاقہ کہلاتا ہے۔ہلکی پھلکی پہاڑیوں سے سجا خوبصورت علاقہ ہے۔

اُس علاقے تک انڈر گراؤنڈ نہیں جاتی تھی۔ مقررہ دن میں نے انڈر گراؤنڈ کے بعد نیشنل ریلوے پکڑی اور مخصوص سٹیشن پر پہنچ کر جب باہر نکلا تو سلیم اپنے دوست اور میٹ رانا کے ساتھ گاڑی لے کر موجود تھا۔ہوٹل پہنچ کر اُس کے دوستوں اور Mates کے ساتھ تعارف ہوا تو پتا چلا کہ وہ تقریباً سب غائبانہ طور پر مجھ سے متعارف تھے۔ بہت اچھے Coments کے ساتھ سلیم نے میرا تعارف کرا رکھا تھا۔

رات کو مخصوص وقت پر پارٹی شروع ہوئی تو رنگینیوں کا ایک سیل رواں تھا۔رنگ برنگی روشنیاں سارے ہال میں چکراتی پھر رہی تھیں۔میزوں پر بئیر اور کولڈ ڈرنکس کی فراوانی تھی اور فری تھی۔ جدید فیشن کے مگر مختصر لباس میں اپسرائیں مست اور خوش تھیں۔آرکسٹرا مختلف گانوں کی دھنیں بجا رہا تھا اور کئی جوڑے اُن تیز دھنوں پر جسموں کو تیزی سے توڑ موڑ کر رقص کر رہے تھے۔ وقفوں وقفوں سے ملازمین کو بہترین کارکردگی پر اُن کے شعبے کے حساب سے انعامات پیش کیے جا رہے تھے۔

پارٹی میں چند خاصے بوڑھے مردوں اور عورتوں کو دیکھ کر مجھے اچنبا ہوا کہ یہ اس عمر میں ہوٹل کے ملازم کیسے ہو سکتے ہیں۔خصوصاً ایک کافی بوڑھی عورت تھی جو کہ رنگین لباس میں ملبوس تھی۔تھوڑی زیادہ عمر کے ملازمین اُسے جا جا کر مل رہے تھے اور وہ اُنہیں چوم کر ہیلو ہائے کر رہی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ یہاں ویٹرس رہی تھی۔کچھ ایسے ملازمین جو اپنی ریٹائرمنٹ تک ہوٹل سے وابستہ رہے اور رابطے میں تھے اُن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔اُن کے لیے

بھی چند انعامات کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایک قابلِ تقلید اور قابلِ تحسین روایت نظر آئی۔

ہم لوگ اندر اور باہر کی گرمی دور کرنے کے لیے مسلسل بیئر سے شغل کر رہے تھے۔ چند ڈبوں کے بعد سلیم ترنگ میں آ گیا اور بولا۔

''جاوید بھائی! مجھے ایک دو حسینوں کو ذرا انجل کرنا ہے، کیونکہ نشے میں سب جائز ہے اور اب سمجھ لیں کہ میں نشے میں ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ ڈبہ ہاتھ سے رکھ کر مٹکتا ہوا ناچتے ہجوم میں شامل ہو گیا اور راستہ بناتے ہوئے ایک حسینہ تک جا پہنچا جو ایک اور جوان کی طرف اور وہ اُس کی طرف منہ کیے ناچ رہے تھے، مگر یہ درمیان میں گھس گیا اور ناچنے لگا۔ حسینہ لمحے بھر کو ٹھٹک کر پھر چالو ہو گئی۔ چند منٹ بعد سلیم نے نشے میں اُسے جھپا ڈالا اور پھر اس کے ہاتھ پکڑ کر اُسے ساتھ لگا کر ناچنے لگا۔ چند منٹ بعد اُس حسینہ نے خود کو چھڑایا اور سٹیج سے اتر کر اپنے کولیگز کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سلیم بھی چند منٹ دوسری لڑکیوں کے ساتھ خرمستی کرنے کے بعد واپس ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اسی طرح اُس نے ایک دوسری تھوڑی بڑی عمر کی عورت کے ساتھ کیا۔ پتہ چلا کہ یہ عام دنوں میں کافی سڑیل ہے اور اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی ہے۔ ہمارا شیر آج نشے کی آڑ میں اُس کے لتے لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی ہنگامہ آرائی کے بعد وہ پھر ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس دوران ہم سب ایک ایک دفعہ ہنگامۂ رخ ورخسار میں اچھل کود آئے تھے۔

ہم سب کے ہاتھوں میں کولڈ ڈرنکس تھیں اور ہم اپنے پھولے ہوئے سانس قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اکاؤنٹ والی لڑکی پاس سے گزری۔ سلیم نے جلدی سے کولڈ ڈرنک میز پر رکھی اور کھڑے ہو کر تھرکنے لگا اور اُس کی طرف ہاتھ پھیلا کر بڑھنے لگا۔

''Hay' مجھے پتا ہے تم نشے میں نہیں ہو'' وہ تیز میوزک کی وجہ سے ذرا زور سے بولی۔

''نہیں نہیں، میں تو مکمل نشے میں ہوں'' کہتے ہوئے سلیم نے اُس سے چمٹنے کی کوشش کی۔

''واہ، کیا نشہ ہے کہ خود کو بھی پتا ہے کہ صاحب نشے میں ہیں'' اُس نے ہلکی سی ہنسی سے کہا اور کنی کاٹ کر نکل گئی۔

سلیم کھچری سی ہنسی کے ساتھ واپس آ بیٹھا۔ سلیم کی ایک کافی موٹی کولیگ آئی اور بولی۔

''یہ تمہارے وہی گیسٹ ہیں ناں جو بزنس کرتے ہیں۔''

سلیم نے ہاں کہا اور مُجھ سے تعارف کرایا۔ وہ مُجھ سے بولی

''یہ تمہارے ہاتھ میں جو اتنا بڑا اسفید ہیرا ہے، کیا یہ اصلی ہے''

''Dont ask, Please decide yourself.''

''پوچھومت، خود فیصلہ کرو''

میں نے ہنستے ہوئے ہاتھ آگے کر دیا۔ دراصل میری انگوٹھی کا یہ نگ رنگ برنگی روشنیوں میں زبردست کرنیں بکھیر رہا تھا۔

کھانا سرو ہوا تو درجنوں قسم کے اعلیٰ معیار کے فائیو سٹار ہوٹلوں والے کھانے تھے۔ سیلف سروس تھی، جو چاہو جتنا چاہو پلیٹ میں ڈالو اور بے شک بار بار ڈالو۔ کھانا کھانے کے بعد انعامات کی فائنل تقریب ہوئی اور پھر وہی ناچ گانے کی ہنگامہ آرائی۔ یہ ہنگامہ ابھی جاری تھا کہ ہم تھک کر اُٹھ گئے۔

رات گئے جب کمرے میں واپس آئے تو سلیم نے مجھے بتایا کہ اُس نے کھانے کے لیے کڑاہی گوشت کا انتظام کر رکھا ہے تا کہ اگر وہاں کا ہوٹلی کھانا مجھے اچھا نہ لگے تو پھر کھایا جا سکے۔ اس کے علاوہ سلیم کا دوست رانا ''جیک ڈینیل'' کی بڑی بوتل کھول کر بیٹھ گیا۔

میں نے منع کیا۔

''بابا میں کوئی ڈرنکر نہیں ہوں''

''مجھے سب پتا ہے۔ تم ویسے ہی ہمیں دوست مان کر نہیں دے رہے''

وہ غصّے میں بولا۔

پتانہیں اُسے کیا پتا تھا۔شاید سلیم نے میری تعریف میں اس موضوع پر بھی کوئی مبالغہ آرائی کی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ رانا صاحب میری ہمہ پہلو تعریفیں سن کر دوسرے رانا صاحب (یعنی مجھ سے) جیلسی محسوس کر رہے تھے اور مجھے Out کر کے بے ظرف ثابت کرنے کے چکر میں تھے، مگر کام الٹا ہو گیا۔گھنٹا بھر بعد وہ اُٹھے اور جا کر راہداری میں ایک کمرہ کھٹکھٹا دیا۔اُس میں بھی ایک ہوٹل ملازم ہی رہائش پذیر تھا، کیونکہ یہ سب ملازموں ہی کے کمرے تھے۔وہ صاحب اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ابھی ابھی ہال سے آئے تھے اور گرل فرنیڈ کے ساتھ مستی کر رہے تھے۔ کپڑوں سے دونوں باہر تھے کہ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

’’کیا بات ہے‘‘ اُس نے اُسی حالت میں دروازہ معمولی سا کھول کر پوچھا۔

’’اوئے ہُن ساڈی ایہہ اوقات اے پئی بوئے اگوای پچھدے او ُکیا بات ہے‘؟‘‘

رانا صاحب نے دھکا دیا اور پورا دروازہ کھل گیا وہ صاحب ننگے کھڑے تھے اور اُن کی گرل فرینڈ بیڈ پر ننگی دُہری تہری ہو کر خود کو رانا صاحب کی آنکھوں سے بچانے کی سعی کر رہی تھی۔

رانا صاحب ’’سوری‘‘ کہہ کر باہر کو لپکے۔رانا صاحب کو چڑھ گئی تھی اور میں اپنے بیڈ پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔

صبح جب مجھے اس کاروائی کا پتا چلا تو وہ کافی شرمندہ ہوا۔بہر حال یہ ایک یادگار پارٹی تھی۔

یار زندہ صُحبت باقی

میں نے پچھلے 25 برسوں میں برطانیہ کا درجنوں بار سفر کیا ہے۔ ان سفروں نے جہاں مجھے بہت سے سبق دیئے ہیں وہاں زندگی کرنا بھی سکھایا ہے۔ جہاں میرے ساتھ انتہائی دلچسپ واقعات پیش آئے، وہاں ساتھ ساتھ بہت سی تلخیوں کا بھی سامنا رہا۔ میں نے آپ کو اس سفرنامہ میں ایک آدھ تلخی میں ہی ساتھ لیا ہے۔ مجھے تو کئی مرتبہ وہاں رہائش اور نوکری کی تلاش کے لئے بھی جاں گُسل مراحل سے واسطہ رہا ہے۔ بہت سے عزیز و اقارب اپنی ستم ظریفیوں کی بدولت خواب و خیال ہو گئے اور بہت سے غیریوں اپنے ہوئے کہ دل میں بَس گئے۔

قلم رواں ہوا تو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کمپوزر سے پوچھا تو ڈھائی سو صفحات ہو چکے تھے لیکن ابھی بہت سے واقعات کی، علاقوں کی اور انگلینڈ کی Hot attractions کی بات باقی تھی۔ ابھی تو سکاٹ لینڈ کے متعلق بات ہی نہیں ہوئی جو انگلینڈ کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔ اس کا دارالحکومت گلاسگو ہے۔ جہاں ہماری کمیونٹی کی ایک معقول تعداد رہتی ہے۔ یہ لندن کے مقابلہ میں ایک ''کھلا ڈلا'' شہر ہے۔ اس میں کوئن پارک (Queen Park) ہے جو دنیا کے چند بڑے پارکوں میں سے ہے اور اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس جگہ سے سارا گلاسگو نظر آتا ہے۔

ڈنڈی نامی مشہور شہر بھی سکاٹ لینڈ میں ہے جس کی ڈنڈی یونیورسٹی دنیا کی معروف یونیورسٹیوں میں سے ہے۔ دریائے ''ڈی'' کے کنارے آباد شہر پرتھ بھی سکاٹ لینڈ کا حصہ ہے۔ انتہائی خوبصورت شہر ہے، اس کی خوبصورتی کا اندازہ اسی بات سے لگالیں کہ یہ شہر 1997ء سے 2002ء تک مسلسل 5 سال تک یورپ کا خوبصورت ترین اور صاف ستھرا شہر ہونے کا اعزاز حاصل کرتا رہا ہے۔ آئرلینڈ کی سرحد کے نزدیک یہ شہر سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے، بلکہ سارا سکاٹ لینڈ ہی سیاحت کیلئے خوبصورت ہے۔ یہ خطہ مجھے پسند ہے۔ اس پر کافی لکھا جا سکتا ہے مگر طوالت آڑے آرہی ہے۔

ابھی تو انگلینڈ کے ایک اور حصے آئرلینڈ کے متعلق بھی لکھنے کو بہت کچھ ہے اور تو اور ابھی تو میں لندن میں موجود Hot attractions کا بھی پوری طرح احاطہ نہیں کر سکا جن کی سیر میں نے اپنے بیوی بچوں کو کروائی تھی۔ مثلاً Tower of London کا تفصیلاً ذکر نہیں ہو سکا جو کہ کبھی صدیوں پہلے ایک قلعہ تھا پھر بادشاہوں کی رہائش گاہ بنا، پھر جیل بنا دیا گیا اور اب ایک سیاحتی مرکز ہے۔ سنا ہے کوہِ نور ہیرا ابھی ملکہ کے دوسرے 23578 جمز (Jems) کے ساتھ یہیں موجود ہے۔ ابھی Oxford Circus اور Piccidly Circus کی دلچسپیوں کا ذکر باقی ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤسز اور وزیراعظم برطانیہ کے دفاتر 10 Downing Street کی بات نہیں ہوئی اور ابھی Big Ben بھی تو رہتا ہے جو صدیوں سے ٹھیک وقت بتا رہا ہے۔ ابھی تو میں آپ کو لندن شہر کی ہسٹری بھی مکمل نہیں بتا سکا۔ ابھی تو دریائے ٹیمز کے گدلے پانی میں بوٹ (Boat) کے ذریعے مشہور مقامات دیکھنا ہیں۔ ایسے ہی ٹور بس میں پورے لندن کو گھومنا باقی ہے۔ وہاں کی سیاسیات، ملکہ کا کردار، معاشیات، ترجیحات اور چرچ کے رول اور مذہبی فرقوں کے متعلق بات ہونا ہے۔ ابھی تو ایک ورطۂ حیرت میں ڈال دینے والی سرنگ Channel Tunel کی بات باقی ہے۔ یہ سرنگ آج کے انسان کا کمال ہے اور سمندر کے اندر قائم کی گئی

ہے۔لندن کے St. Pancras سٹیشن سے بین الاقوامی ٹرین چلتی ہے اور اس سرنگ سے ہوتی ہوئی فرانس اور بلجیم جا نکلتی ہے۔اسی طرح میں نے بحری جہاز کے ذریعے لندن سے ملحقہ بندرگاہ Dover سے فرانس کی بندرگاہ Calis تک ایک دلچسپ سفر کیا ہے،اس کی روداد باقی ہے۔

ابھی انگلینڈ سے متعلق بہت کچھ میرے اس پٹارے میں بند ہے۔ بہت سے واقعات، حادثات، جذباتی مراحل، علاقے اور معلومات ہیں۔انگلینڈ ہر حوالے سے ایک Rich ملک ہے۔ بہرحال یار زندہ صحبت باقی۔

میں نے اس سفرنامے کو آپ بیتی کے انداز میں بیان کیا ہے اور بات بات میں ہی معلومات مہیا کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ معلومات کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنے اور اُن کے معاشرے میں تفاوت،سوچ میں فرق، رویوں میں اور ترجیحات میں فرق واضح ہو سکے۔اس کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے جذبات وخیالات بھی پیش کئے ہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے خطے کے ہر حساس نوجوان کے خیالات وہی ہونا تھے جو میرے رہے۔ یوں میں ایک اکائی نہیں تھا، آپ سب میرا حصہ رہے۔

میں نے دنیا کے درجنوں ملکوں کی سیر کی ہے جس میں بہت سے یورپین ممالک، مڈل ایسٹ کے ممالک، امریکہ اور قدیم تہذیبیں ایران اور مصر کی سیر بھی شامل ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اگلا سفرنامہ امریکہ کے متعلق لکھوں۔ میں اس ملک کی بھی کئی مرتبہ سیاحت کر چکا ہوں اور وہاں کام بھی کر چکا ہوں۔ وہاں بھی میرے ساتھ بہت سے دلچسپ واقعات، اتفاقات اور حادثات پیش آئے۔ بلکہ 9/11 کا تو میں نیویارک میں عینی شاہد ہوں۔

میرے لکھنے کا انداز آپ کو کیسا لگا، براہِ مہربانی آراء سے نوازیئے گا تا کہ ''سفرنامۂ امریکہ'' لکھتے وقت آپ کی آراء کو مدِ نظر رکھ سکوں۔

حدیثِ دل کا بیاں گو ابھی ادھورا تھا